رنگ بھوم

جمیلہ ہاشمی

رائٹرز بک کلب
۲۱۔ ال سیز، سینٹ جونز پارک، لاہور

رنگ بھوم

جمیلہ ہاشمی

رائٹرز بک کلب
۳۱ - ال سیر، سینٹ جونز پارک، لاہور

جُملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : رائٹرز بک کلب لاہور

پہلی بار : ۱۹۸۷ء

تعداد : گیارہ سو

پرنٹرز : نقوش پریس ، لاہور

[redacted] : [redacted]/-

اُن کرداروں کے نام
جنھوں نے ان کہانیوں کو رونق بخشی ہے!

فہرست

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

03142893816

بسنت رُت میرو

"الم برداشت کرنے کے بھی اپنے اپنے انداز ہیں" آچھی بھائی، میں نے بیئر کے جھاگوں بھرے گلاس کو تپائی پر رکھتے ہوئے کہا "شاعر پر غم اثر کرتا ہے اور اس کے اندر اُترتا ہے تو وہ شعر کہتا ہے، مصور کا قلم رواں ہوتا ہے اور رنگوں کو زبان ملتی ہے۔ پر آپ جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی غم پوری قوم کا غم بن جائے اور ہر ایک ماتم کناں نوحہ خوانی کرے یہ نہیں ہو سکتا"

"یہ بربادی اتنی ہمہ گیر تھی، یہ شکست اتنی ذلت آمیز تھی سبھی کو اس سے متاثر ہونا چاہیئے تھا" آچھی بھائی نے اپنے اسی دھیمے لہجے میں بات کی جس سے وہ ڈبیٹ شروع کیا کرتے تھے اور آخر میں مخالف سے اپنا نقطۂ نظر منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

"میں نہایت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ بربادی کی ہمہ گیری اور شکست کی ذلت سے مجھے انکار نہیں مگر میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جتنا جتنا کوئی شخص ایسے سے قریب ہوتا ہے اس پر اتنا اثر ہوتا ہے۔ اندازہ کیجئے، جن لوگوں کے عزیز، باپ، بیٹے، بھائی وہاں پر

ہیں وہ تو سیدھے اس مصیبت کی زد میں ہیں، ایک لمحے کو بھی وہ اسے بھلا نہیں سکتے، مگر ہم اور آپ جو محض گفتگو کی حد تک اس میں شریک ہیں، ہم کیا اتنا ہی دکھ محسوس کرتے ہیں۔

آچھی بھائی سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے شاید اپنے دل کی گہرائیوں میں اترے اس غم کا جائزہ لے رہے ہوں۔

آپ لیلیٰ کو جانتے ہیں؟"

"کون لیلیٰ؟" انہوں نے اپنے گلاس میں سے ایک ذرا سا گھونٹ لیا اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"میرا خیال تھا آپ اسے زہرہ قادر کے ہاں مل چکے ہوں گے" میں نے سنہری سیال والا گلاس اُٹھا کر اسے روشنی کے رخ کیا ذرا ذرا سے بلبلے تہہ میں بیٹھ رہے تھے تیز تیز نیچے کی طرف جاتے ہوئے پتھروں کی طرح۔

"قادر کے ہاں ادھر کئی مہینوں سے میرا جانا نہیں ہو سکا، مجھے لگتا ہے اس واقعے کے بعد سے میرا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہے اور جب آدمی کسی کے ہاں جا کر خوش نہیں ہوتا تو نہ جانا بہتر ہے۔

"اچھا ابھی تک آپ اس واقعے کو بھلا نہیں سکے، حیرت ہے ورنہ عام طور پر تو شراب کے بعد کی ہلڑ بازی کو سب بخش دیا کرتے ہیں" میں نے ٹھنڈی بیئر کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

"یونہی میرا جی اب ڈرنک پارٹیوں میں جانے کو نہیں چاہتا۔ میرا دل کہیں لگتا نہیں ہے کسی موسیقی کی محفل میں دوستوں کے ہنگامے میں سارا وقت ڈوبتا رہتا ہے"۔

"آپ نے بھی ضرورت سے زیادہ اثر لیا ہے اس بات کا ورنہ زندگی تو آچھی بھائی چلتی ہی رہتی ہے، دکھ اور سکھ سب کے باوجود رواں رہتی ہے"۔

"مدیہ میں تو جانتا ہوں اور میں اس میں سوائے اس جذباتی لگاؤ کے جو ایک فرد کو اپنی قوم

کے ساتھ یا ایک باسی کو اپنے وطن سے ہوتا ہے اور کسی طرح INVOLUE نہیں ہوں مگر خود بھی مجھے معلوم نہیں کہ کیوں؟"

"لیلیٰ کی دیوانگی کی تو وجہ سمجھ میں آتی ہے مگر آپ کی قنوطیت بظاہر سمجھ میں آنے والی نہیں ہے،" میں خود بھی حیران تھا کہ اچھی بھائی جیسا کھلنڈرا اور ہنسنے ہنسانے والا آدمی یوں بجھا بجھا سا کیوں رہتا ہے۔

"بھئی لیلیٰ کون ہے کچھ بتاؤ تو سہی پھر ہم بھی سوچیں گے کہ اسے دیوانہ ہونے کا کتنا حق تھا۔" اچھی بھائی قصہ سننے والے کی طرح بیٹھ گئے۔

"زہرہ قادر کے ہاں پارٹیوں کا نقشہ تو آپ جانتے ہیں ہر دفعہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی شاعروں کو جمع کر لیا اور کبھی موسیقاروں کی کھیپ کی کھیپ اپنے سازندوں کے مجمع سمیت براجتی ہے۔ کبھی شہر کے سارے رقاص حضرات پائل جھنکاتے موجود تو کبھی مصوّر حضرات محقق باتیں کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ قادر کو زہرہ کی اس ہنگامہ پسندی ہی سے عشق ہے۔ دونوں مل کر پروگرام بناتے ہیں۔ ذرا ذرا سی تفصیلات پر غور کرتے ہیں۔ کون کہاں بیٹھے گا، کس کا جوڑا کس کے ساتھ ٹھیک رہے گا۔ بیٹھنے، پینے، ہنگامے، ہر ایک کام منصوبے کے تحت میں تو کہوں گا اگر زہرہ قادر نہ ہو تو شہر کی آدھی رونق نہ ہو۔ خیر یہ سب میں آپ کو اکساتے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ یونہی میرے اندر کا قصہ گو بہک گیا ہے۔"

اچھی بھائی نے کہا۔ "قصہ گوئی کی حس کی تسکین پھر کسی اور وقت پر اٹھا رکھو میں لیلیٰ کا پوچھ رہا ہوں۔ زہرہ کے پارٹی میں وہ ایک کونے میں اکیلی بیٹھی تھی اور پی رہی تھی۔"

"کوئی خاص بات ہی ہوگی ورنہ قادر کے ہاں تو یہ تقریباً ناممکن ہے۔" اچھی بھائی نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اسے میں نے زہرہ کے ہاں پہلی بار دیکھا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اکیلی کونے میں کیوں بیٹھی ہے اس لیے جب زہرہ مہانداری کرتی ہوئی میری طرف آئی ہے تو میں نے ہولے سے پوچھا وہ اکیلی کون ہے بھئی نادرہ روزگار"

"اوہ مجھے یاد ہی نہیں رہا حالانکہ میں اور قادر سوچ رہے تھے کہ اسے آپ سے متعارف کروایا جائے" پھر میں بیگم رحیم سے معذرت چاہ کر زہرہ کے ساتھ لیلیٰ کی طرف گیا۔

"جمشید آپ لیلیٰ سے بات کریں یہ میری دوست ہیں جنرل نور کی بیوی۔ نور آپ کو پتا ہے ابھی تک نہیں آئے" اور پھر وہ بات ختم کئے بنا دوسری طرف مڑ گئی۔ زہرہ کی اس عادت کا تو پتا آپ کو بھی ہے نا۔ بات ختم کئے بنا اِدھر اُدھر ہو جانا اس کی ادا ہے گھائل کرنے کا اپنے حالوں ایک کاری حربہ دوسروں کو منتظر رکھنا اسے پسند ہے۔ دوسروں کو بھول جانا اور پھر اوہ کہہ کر بہت کچھ یاد دلانے پر یاد کرنا بھی اس کا ایک ہتھیار رہے۔ وہ اپنے حسن کی سحرکاری سے اس قدر واقف ہے کہ کبھی کبھار جی چاہتا ہے وہ ذراسی سادہ ہوتی تھوڑی سی کم پُرکار ہوتی۔ تھوڑے کم تصنّع سے کام لیتی"

"تم پھر بہکے" آچھی بھائی نے جھنجھلا کر کہا "اپنے اس قصہ گو کو روکو"

"اوہ اوہ" میں نے زہرہ قادر کے انداز میں کہا "معاف کیجئے گا"

"آپ سیاست میں دلچسپی رکھتی ہیں کیا" میں نے لیلیٰ سے پوچھا۔ اصل میں ہم ساری شام پیتے اور سیاست پر بحث کرتے رہے تھے۔ یہ باتیں کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہت بڑھیا عیش میں اپنے آپ کو الجھانا۔ ایسی ناممکن باتوں کا ذکر کرنا جو پہنچ سے باہر ہوں اس تانے بانے کے رنگ اور چمک کو ہاتھ لگا کر چھونے کی کوشش کرنا جو ہمارا قومی مزاج بناتا ہے اور پھر بے بسی کے احساس کو مٹانے کے لیے اپنے آپ سے اپنا آپ چھپانے کے لئے یہ بہترین پناہ گاہ ہے۔ شرابی کیفیت کے باوجود یہ باتیں آدمی کو اندر سے باہر نکال کھڑا کرتی ہے اور ذی ہوش سے زیادہ جوش و خروش سے یہ باتیں ہوتی ہیں تو ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں

اور دل میں وہ بے چارگی اور بے بسی کا احساس بھی ہوتا ہے جو قید و بند میں آدمی محسوس کرتا ہے،،

"آپ کس سیاست کی بات کر رہے ہیں،" اس نے اپنے پلّو کو کندھے پر جمایا پھر جھک کر جام میں جھانکا۔ اور اٹھا کر ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔

چونک کر میں نے کہا، "ملکی حالات عام باتیں، بے اطمینانی، روز کے واقعات یہی سب تو سیاست ہوتے ہیں۔"

"اچھا آپ ان سب باتوں کو سیاست کہتے ہیں، نہیں صاحب میں اس سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتی،" وہ اور جھک کر بیٹھ گئی جیسے اندر کے کسی درد کو دبانے میں لگی ہو۔ میں نے گفتگو کی جس گیند کو لڑھکایا تھا اسے شرمندہ سا ہو کر واپس لپیٹ لیا۔ خاموشی کا ایک تکلیف دہ وقفہ ہم دونوں کے درمیان ملبا ہوتا چلا گیا۔

باوردی بیرے نے سفید دستانے پہنے چاندی کے خوان اٹھائے حریری پردوں سے نکل کر ہماری طرف آیا ادب سے سر جھکا کر اس نے ٹرے لیلیٰ کے سامنے رکھی۔ ارغوانی شراب سے اپنا جام لبالب بھر کر اس نے کہا۔

"جب دوسرے آپ کا نصیب بن جاتے ہیں تو اس کے متعلق کون بات کر سکتا ہے آپ کو معلوم ہو کہ کسی شے پر آپ کا اختیار نہیں، آپ کے اربابِ اختیار کا نہیں تو آپ ان الجھی ہوئی گرہوں کو صرف گفتگو سے کیسے سلجھا سکتے ہیں یہ تو صرف نوحے کہنے اور ماتم کرنے کی باتیں ہیں۔ نوحہ کہ قوم بے حس ہو گئی ہے۔ بچے روتے ہیں، عورتیں بین کرتی ہیں،" اس نے جام کے کنارے کو اپنی انگلی سے محسوس کیا جیسے کوئی سوئے ہوئے محبوب کے ہونٹوں کو ہلکے سے چھوئے۔

بسنت رت کی نشیلی راتوں کا چاند ہوا کے تال پر ناچتے ناچتے تھک کر آرام کرنے والے رقاص کی طرح تاروں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا اور پر سکون تھا۔ پھولوں اور نئی کونپلوں

کی باس بھیگی ہوئی اور بدن سے چھو کر اسے تازگی بخشتی تھی۔ بسنتی چاندنی کا آبشار ہمارے چاروں طرف گر رہا تھا درختوں کے سائے گہرے اور روشنی میں کسی بیراگن کے سیاہ بالوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ پردے کے پیچھے موسیقی کی تانیں سرگوشیوں اور سانسوں کے زیروبم کی طرح سنائی دیتی تھیں اور نہیں بھی۔ فضا دم سادھے جیسے لے پر مست ہوا ان کہے گیتوں اور بولوں سے بھری تھی یہ مکمل رات ابر کی طرح پُراسرار اور کائنات کی عظمت کو منوا رہی تھی، آدمی ناچیز ذرہ اور بے سہارا پتنگے کی طرح لگتا تھا، دوسروں کا سہارا تلاش کرنے پر مجبور۔

لیلیٰ نے اپنی سیاہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان کی گہرائی اور اس کے انداز کی قطعیت آدمی کو گھبرا دیتی تھی مگر میں منتظر تھا کہ وہ کچھ کہے۔

"ہمارا اپنا کیا ہے جس کو آدمی زیرِ بحث لائے، ایک گرفتار پرندے کی سی کیفیت ہر وقت رہتی ہے یہی ایک صورت حال ہے جس سے آپ آشنا ہوتے رہتے ہیں، میں کہتی ہوں یہ شراب تک تو ہماری اپنی نہیں ہماری سیاست تو خیر دور کی بات ہے، دوسروں کے اشارے پر ناچنے والے ہیں ہم، اور مداری کا پتہ نہیں کون ہے؟"

"ٹھیک فرماتی ہیں آپ۔" میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"کیا سعادت مند بچوں کی طرح آپ فرمانا اور ٹھیک کہتے ہیں وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ہنسی کے مارے اس کا بُرا حال تھا اور وہ قہقہہ نہیں ایک چیخ کی طرح ڈرا دینے والا اور لمبے وقفے کے بعد بھی ختم نہ ہونے والا دورہ تھا۔

زہرہ بھاگی ہوئی آئی "جمشید صاحب خدا کے لیے آپ کچھ خیال نہ کیجئے گا اس کو اب یہ دورہ اکثر پڑتا ہے۔ جب سے اس کے میاں گئے ہیں یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ دوسروں سے ذرا زیادہ ہی سوچتی ہے۔"

ہم دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے اندر لائے۔ وہ پلنگ پر لیٹی اپنے سر کو دائیں بائیں

مار رہی تھی اور اس کا سانس یوں رک رک کر آ رہا تھا۔ جیسے ہنسی کے بعد گلے میں پھندا لگ گیا ہو۔

اُسے خواب آور دوا پلا کر زہرہ نے کہا "شادی کے دو ماہ بعد ہی جنرل نور مشرقی محاذ پر چلے گئے یہ ساتھ جا نہیں سکتی تھی ساس کے پاس رک گئی، گھر کے حالات کیسے ہیں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتی مگر اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور بہکی بہکی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے چاری کے ساتھ اچھی نہیں گزر رہی، پھر ہمیں کہیں سے پتہ چلا ہے کہ جنرل نور وہاں ذرا زیادہ زیرِ عتاب ہیں اگر یہ لیلیٰ کو بھی معلوم ہو چکا ہے تو یہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ یہ کہیں باہر آتی جاتی بھی نہیں۔ آج میں نے بھی زبردستی اسے گھر سے نکالا کہ کچھ تو اس کا جی بہلے۔ یہاں اس نے کسی کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا، میں نے بھی زور نہیں دیا۔ اس لیے کہ لوگ باتیں کرتے ہوئے دوسروں کے جذبات کا احترام نہیں کرتے، شراب پی کر تو بالکل ہتھے سے اکھڑ جاتے ہیں، آپ کو میں سب سے زیادہ بے ضرر سمجھتی تھی اور پھر بھی یہ حالت اس کی ہو گئی ہے۔"

"ان میں برداشت ہی نہیں رہی ہے شاید، کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے ذرا ذرا سی باتیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دیئے جانے والے بجلی کے جھٹکوں کی طرح ہوتی ہیں کہ معلوم تو نہیں ہوتا مگر اندر سے آدمی ہل جاتا ہے۔"

میں اور زہرہ لان میں اتر آئے۔

زہرہ نے پھر کہا، "اس کے ابا چاہتے تھے کہ یہ ان کے پاس چلی جائے مگر اس نے کہا میں اس گھر کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں جہاں میں نور کے ساتھ آئی تھی۔ اس گھر میں ان کے سانسوں کی خوشبو رچی ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنے آپ کو ان کے زیادہ قریب محسوس کرتی ہوں۔"

"کمال ہے اس زمانے میں ایسی شوہر پرست عورت"، میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ شوہر پرستی سے زیادہ نازک مزاجی اور خود داغی ہے صاحب"، زہرہ نے ذرا تیزی سے

کہا اور پھر میرا جواب سنے بنا کسی کے اشارے پردہ ادھر پلٹ گئی، موسیقی کی جو سوئی سوئی
تانیں ان ریشمی پردوں کے پیچھے سے سنائی دیتی تھیں سسکیاں لگنے لگیں، چاند درد غم سے
سُتا ہوا چہرہ تھا، چاندنی آنسوؤں کے دھارے کی طرح تھی اور لیلیٰ فراق کا نوحہ تھی۔
لان کے دوسرے کونے میں ستار پر کسی نے راگ چھیڑا، گانے کی آواز ہوا میں خوشبو
کی طرح تھی۔

"انت بھئے لبسنت رُت میرو"

میں زہرہ سے اجازت چاہے بنا چپکے سے چلا آیا۔

آپھی بھائی اور میں تصویروں کی نمائش دیکھنے آئے تھے جو جنگی قیدیوں کے موضوع
پر جانے کس ادارے نے سجائی تھی، مختلف فن کاروں نے اپنا زورِ قلم صرف کیا تھا۔ وطن سے
دور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں کی یادوں کی بے رنگی اور بے کیفی سے ان میں
رنگ بھرے تھے، جیسا کہ عام طور پر نمائشوں میں ہوتا ہے لوگ گروہ در گروہ آتے اور
ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا کر باہر لان میں نکل جاتے۔ برسات کی گھٹن
اور اس میں جی زندگی سے یونہی بیزار تھا ہوا چلتی ہے، درختوں کی شاخوں میں جھولتی اور
پتوں کے ساتھ آنکھ مچولی تو کھیلتی ہے مگر پسینہ خشک نہیں کرتی۔ بادل اُمڈ کر آتے ہیں برستے ہیں
مگر اس کے بعد دھوپ جی جلانے والی اور ظالم ہوتی ہے، دیوانے کی ہنسی کی طرح طنز بھری اور
دکھ دینے والی۔

تصویروں کو دیکھ کر جی اداس ہو گیا مگر باہر خوشبوئیں اڑاتی، مصنوعی بالوں، پلکوں، ناخنوں
سے آراستہ خواتین کا ایک جمِ غفیر تھا اور پھر وہیں زہرہ کی پارٹیوں کا سارا مجمع تھا۔
ہمیں دیکھ کر وہ ادھر آئی "جمشید صاحب اس دن بھاگ کیوں آئے تھے، چپکے سے
یوں چلے آئے اور پھر کبھی ملے بھی نہیں، لیلیٰ کی بیماری کا قصور میں آپ کے سر تو نہیں لگا رہی جو

آپ الوداع کہے بنا غائب ہو گئے۔

"آچھی بھائی آپ ہی بتایئے نا یہ کوئی طریقہ ہے میزبان کو اس قابل بھی نہ سمجھنا۔"

"وہ ہنسی تو اس کے سفید دانتوں کی چمک بڑی دلنواز لگی۔ زہرہ کی ہنسی میں بڑی جان ہے۔" اچھی بھائی نے کہا۔ "لیلیٰ کا اب کیا حال ہے؟"

"حال تو اس نے خود اپنا تباہ کر رکھا ہے۔ بھلا بتایئے یہ سانحہ کسی ایک خاندان کا نہیں ہزاروں لاکھوں لوگ اس المیے میں شریک ہیں، وطن کے تقریباً پچاس فیصد لوگ اس میں کسی نہ کسی رنج سے محصور ہیں آدمی کس کس کے ساتھ ہمدردی کرے۔ زہرہ نے بڑی لاتعلقی سے بات ختم کی۔

"میں نے سوچا تھا آپ یہ نمائش اس ہمدردی کے سلسلے میں دیکھنے آئی ہیں"، آچھی بھائی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"نمائش اس لیے سجائی جاتی ہے کہ انہیں کوئی دیکھے۔ میں بھی چلی آئی۔"

کہیں دور درختوں کے جھنڈ میں کوئل زور زور سے بولنے لگی پھر قریب کے درختوں سے بھی کوہو کوہو سنائی دی جیسے دردِ فراق کے نوحہ میں وہ سب شریک ہوں، ماتم کناں کوہو کوہو بول کر وہ دکھ بانٹ رہی ہوں۔

شاعر اور مصور حضرات سب یہاں جمع ہیں رسلمیٰ بھی ہماری طرف آئی "کیوں صاحب آپ کس طرح وطن سے دور رہنے والوں کو سلام بھجواتے ہیں، اس کا اشارہ "وطن کو سلام" تصویر کی طرف تھا۔ پھر زہرہ سے کہنے لگی منصور شام کی فلائٹ سے آنے والے ہیں۔

"بھئی ذرا چائے تو پیتی جاؤ، آیئے آچھی بھائی جمشید صاحب" زہرہ نے ادھر قدم بڑھائے جدھر کیک اور رنگ برنگ پیسٹریوں سے بھری میزیں اور پھولوں کے گلدستوں سے سجے ہوئے چائے کے خوان تھے۔

"کیا ہر جگہ کھانے پینے کا یہ اہتمام ہوتا ہے؟" آچھی بھائی نے ہولے سے تقریباً

میرے کان میں کہا۔

ایک نوجوان نے زہرہ سے کہا "باجی آداب"

"ارے لیلیٰ کا کیا حال ہے میں تو کئی دنوں سے ادھر جا ہی نہیں سکی"۔ زہرہ نے اپنے کندھے پر سے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ "ادھر آیئے آپ کو لیلیٰ کے دیور سے ملواؤں، یہ عمر ہے۔ اور یہ ہمارے یہاں کے بڑے عظیم شاعر اور عظیم آرٹسٹ ہیں"۔ اس نے مجھے اور اچھی بھائی کو ایک ساتھ اس سے متعارف کروایا۔ عمر نے ہم دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا

"لگتا ہے آپ لوگ لیلیٰ بھابی سے پہلے بھی مل چکے ہیں"۔

"جی ہاں پچھلی بار قادر صاحب کے ہاں ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا جی شاید اچھا نہیں تھا ان دنوں"۔

عمر سر جھکائے سنتا رہا۔

زہرہ نے کہا "عمر لیلیٰ سے میرا اسلام کہنا کسی دن آؤں گی، اچھا بھئی یہ میری دوست ذرا جلدی میں ہیں"۔ اور وہ اپنے گروہ کے ساتھ آگے چلی گئی۔

"اس نمائش میں آپ کی بنائی تصویر کون سی ہے؟" اس نے اچھی بھائی سے پوچھا۔

"میں اس موضوع پر کچھ نہیں بنا سکا۔ بنا نہیں سکوں گا۔ میں اس رخ سے اس سارے المیے کو دیکھ نہیں سکا ابھی تک"۔ اچھی بھائی نے بڑے دکھ سے کہا۔

ہم نے ایک اور چکر نمائش کا لگایا۔ اور پھر پاس کے رستوراں میں چائے پینے کیلئے چلے گئے۔ ڈھلی ہوئی بیلوں تلے مدھم بلب جل رہے تھے اور پھولوں کے گچھے بھونروں کی یلغار میں تھے پتنگے سنگی روشنیوں سے چھو کر گرتے تھے مگر ان کی بھیڑ کم نہیں ہوتی تھی۔

"آپ نے لیلیٰ بھابی کا پوچھا تھا نا۔ وہ مینٹل ہاسپٹل میں ہیں"۔ عمر کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ذرا سا کانپا۔

ہم دونوں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ پہلے سے دیوانی تھی نور بھائی کے جانے کا تو محض بہانہ ہوا ہے"۔ عمر نے بتایا۔

"میں سمجھتا ہوں کئی طبیعتیں اتنی نازک ہوتی ہیں ذرا سا بوجھ بھی ان کے لیے بہت ہوتا ہے"۔ میں اور کیا کہتا۔

"یہ ذرا سا بوجھ نہیں تھا بھابی کے لیے یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا ہے کہ وہ حواس کھو بیٹھی ہیں اور اب شاید بھائی کے آنے کے بعد بھی وہ دوبارہ زندگی کے دل میں رسے بسے نہیں مگر میں کہتا ہوں ہزاروں لوگوں کے لیے اس سے بھی دردناک مسائل پیدا ہوئے ہیں، ساری زندگی متاثر ہوئی ہے پورا معاشرہ ایک لحاظ سے تو اس پریشانی سے دوچار ہوا ہے، ایسی عورتیں بھی تو ہوں گی جو دیوانی بھی نہ ہو سکیں رو بھی نہ سکیں۔ گھٹن کو کہیں نکال نہ سکیں، سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگتا ہے"۔

"آپ کے ہاں اس سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا"۔ میں نے پوچھا

"میں اس بدسلوکی کا ذمہ دار کسی کو نہیں ٹھہراتا۔ اماں اپنے حالوں ٹھیک کہتی تھیں، اسماء میری بہن ذرا تند خو تھی، ہر ماہ جب تنخواہ لینے کا وقت آتا تو وہ جلتے کیوں خفا ہونے لگتی، دو ماہ ہی تو اکٹھا رہے ہیں اچانک بھائی کو جانے کا حکم ملا اور ترقی بھی۔ اماں سمجھتی ہیں بہو ہی ایسی آئی ہے سبز قدم، لیلیٰ کے دل پر کیا بیت رہی ہے اس کا کسی کو کیا غم، میں اپنے طور سے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا رہا حالات اور بھی گڑبڑا گئے"۔

آچھی بھائی نے کہا۔ "مگر کوئی خاص بات تو ہوئی ہوگی جو دیوانگی کی آخری حد تک لے آئی"۔

"وہ پچھلے مہینے میں چیک کے لئے بنک گیا واپس آیا اور میں نے بھابی کو آواز دی تو اسماء نے کہا "چیخ کیوں رہے ہو وہ گھر میں رہیں تو! جب دیکھو باہر جا رہی ہیں، اماں سے نہیں پوچھتیں کسی سے کہتی نہیں ہیں بس گاڑی نکالی اور گھومنے چل دیں"۔

تب پہلی بار مجھ کو پتا چلا کہ بھابی نے کبھی کبھار باہر جانا شروع کر دیا ہے، میں نے کہا "کسی کام

سے ہی تو جاتی ہوں گی،،

"بھئی یوں کیوں نہیں سوچتے کہ ان کے مزے ہیں" اسما نے کہا۔

"تمہیں نور بھائی کے ہوتے تو بھابی سے خاصی محبت لگتی تھی، جب دیکھو ان کے پاس گھسی ہو،،

"جناب کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اب انہیں ہماری محبت کی ضرورت نہیں رہی اور پھر تم جو ان کے طرف دار ہو ان کی محبت کا دم بھرنے والے" اسما لڑنے پر آمادہ تھی۔

میں نے کہا نور بھائی یہاں ہوں تو کیا کہیں تم نے دیکھا نہیں بھابی کا رنگ جو دودھ کا سا سفید تھا اب مٹ میلا ہو گیا ہے،،

"جاؤ یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو ان سے کہو کہ تم جو ان کے حسن کے دیوانے ہو" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

بھابی گھر پر تھیں اپنے کمرے میں۔ رو پڑے لے کر انہوں نے کسی مقدس امانت کی طرح ماتھے سے لگائے اور پھر کہنے لگیں، عمر میرا ایک کام کر دو، اماں سے کہو مجھے ان کی ضرورت نہیں صرف مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں۔ اماں مجھ سے رسمی بات چیت بھی نہیں کرتیں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ عمر مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی، اور پھر سسکیوں کے درمیان کہنے لگیں یہ صورتحال جانے کب تک رہے۔ اگر معلوم ہو کہ یہ . . . .

پھر اماں نے مجھے بلا لیا اور زور زور سے ڈانٹنے لگیں، "تم بھابی کے دُلار میں لگے ہو اور یہ منحوس ہر وقت روتی ہے،،

"اماں خدا کے لیے" میں نے کہا "ہولے بولیں"

"ہولے بولے میری جوتی، یہ بہوؤں کے لچھن ہوتے ہیں۔ نور جانے کب لوٹ کر آئے اور میں اس پتھر کو سینے سے کہاں تک لگا کر رکھوں، گھر میں جوان بیٹی ہے" میں کانوں میں اُنگلیاں دیئے آگیا۔

پورا ہفتہ ہم نے گھر پر ان کا علاج کرنے کی کوشش کی مگر کب تک۔ آخر ہسپتال میں داخل کروانا ہی پڑا۔ دو ماہ ہو گئے ہیں۔"

"کسی نہ کسی کو پہچانتی تو ہو گی۔ اور دو ماہ میں خاصا افاقہ ہو گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں میرے سوا کسی کو نہیں پہچانتی۔ ان کے اماں ابا آئے تھے اور اماں تو ابھی تک یہاں ہیں اپنی کسی عزیز کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اب کرائے کا مکان لے کر اس میں اٹھ گئی ہیں بہت پریشان ہیں۔"

پھر کہنے لگا "میں اس کے پاس جاتا ہوں تسلی دیتا ہوں کاش یہ پتہ چل سکتا کہ نور بھائی کب تک لوٹیں گے۔ مستقبل کتنا غیر یقینی ہے۔ کہیں امید کی کوئی کرن نہیں۔ سارے دیے مدھم مدھم جلتے ہیں۔ سارے رنگ پھیکے اور لو دیتے جسموں کی جلا اب ختم ہو رہی ہے۔" جانے یہ کس کے اشعار تھے جن کے اصل بول نہیں صرف ان کا مطلب میرے دماغ میں چاپ کی طرح ہر گھڑی گونجتا تھا۔ موسم خاصا بدل گیا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور دن بڑے خوشگوار تھے۔ عمر اور میں مینٹل ہسپتال میں لیلےٰ کو دیکھنے گئے۔ وہ ایک کاپی پر کچھ لکھتی، پھر پھاڑتی اور پھر لکھتی۔ اس کے گرد کاغذوں کے ڈھیر لگے تھے۔

"سنو انہیں کھولنا نہیں یہ سارے خط بس ان کے ٹھکانوں پر پہنچا دو۔" اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے بولنے سے منع کیا۔ زرد رو بکھرے بالوں والی لیلیٰ۔ عمر بہت دیر سلاخوں کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

واپس آ کر میں سٹیرنگ پر ہاتھ دھرے اُن پُرزوں کو لیے بیٹھا رہا۔ انہیں کھولنے کی ہمت میں اپنے میں نہیں پاتا تھا۔ جانے ان پر کیا لکھا ہو۔

میں بازو اپنی آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا اور شام کی ہوا دل کو اداس کرنے والی تھی۔ آپھی بھائی اندر آئے۔ "یوں کیوں لیٹے ہو، جی تو اچھا ہے؟" پھر انہوں نے جھک کر ایک پرزہ اٹھایا اسے سیدھا کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ کس نے لکھا ہے بھئی کس نے ڈالا ہے یہاں

ارے کیسی بُری لکھائی ہے پڑھی بھی نہیں جاتی۔ پھر انہوں نے بتی جلائی اور اٹک اٹک کر پڑھا۔

سُونا سُونا دیس پی نہ ملے

باہر رات کی آوازیں اور خوشبوئیں، روشنیاں اور اندھیرے پھیل رہے ہیں۔ سرس کی باس اترتی ہوئی آتی ہے۔ بھونرے پھولوں پر جھوم رہے ہیں اور میں سوچتا ہوں جو رات آ رہی ہے جو رات ہم پر چھا گئی ہے اس کی سحر جانے کب ہوگی۔

اگنی دا

کرنل مرزا کا ہیلی کاپٹر گوپے کے سامنے پیلی اور تپش سے سیاہ پڑتی گھاس پر سے ابھی اُڑا تھا۔ ٹھاکر تیج سنگھ کی تلاش میں صحرا کے اوپر لمبی اور نیچی پرواز کے لیے انہوں نے پروگرام کے مطابق اپنی دُوربینیں اور بھری ہوئی بندوقیں گولیوں کے راؤنڈ بھی ساتھ لیے تھے ہم کئی دنوں سے اس ٹوبے کو اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ ٹوبہ رنہال پوسٹ اور جے پور کی سرحد کے قریب تھا۔ دونوں حکومتوں کو ٹھاکر تیج سنگھ کی ضرورت تھی۔ اس کے سر پر ایک بہت بڑا انعام مقرر تھا جس کا اعلان کئی بار ہو چکا تھا مگر سردار صحرا کے ہونے کے غرور، طبیعت کی بے باکی اور جرأت مندی نے اسے اپنی جان سے بھی بے پروا بنا دیا تھا، وہ کڑوے پہرے اور تنگ گھیرے کے باوجود جو چاہتا کر گزرتا۔

گرم ہواؤں کے اُبلتے ہوئے چکر کھاتے اور آگ اگلتے اس موسم میں جب سورج تمہارے سر پر چمک رہا ہو اور ریت کے لہریوں میں سے آگ کے شعلے لپکتے ہوں، وہ اپنے تیز رفتار اونٹوں کے جھنڈ لے کر جس پوسٹ پر موقع ملتا حملہ کر دیتا۔

ہم تقریباً پچاس آدمی اس جنگ میں لگا چکے تھے اور کرنل مرزا کے لیے یہ اب زندگی اور عزت کا سوال بن گیا تھا، مردہ یا زندہ تیج سنگھ۔

جھکڑوں اور خونی آندھیوں کے گھیرے میں تیز رو لہروں میں ہونکتا ہوا سناٹا ہمارے چاروں طرف ہے، بد طینت دشمن کی سی چالاکی سے وہ آدمی کو گرفتار کرتا اور فنا کرتا ہے۔ صحرا کی بے چین روحیں پل پل لمحہ لمحہ زندگی کی کھوج میں گھومتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کی طرح ٹیلے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوا غصہ و دیوانی اپنا سر جھٹکتی شور مچاتی ہے، ریت کے اُبلتے ہوئے فواروں میں سورج اپنا زور اور توانائی لگاتا ہے مگر شامیں اپنی مہندی لگی پوروں سے رات کی اوڑھنی پر ٹھنڈے ستارے ٹانکتی ہیں، اسے سجاتی ہیں پھر خاموشی کی ڈھولک پر لمبی تانوں والے راگوں کی پھوار ریت کے ذروں کو رجھاتی ہے، کال کڑچھی بولتی ہے۔

سارے ٹوبے سیاہ کیچڑ بن جاتے ہیں جو اندر کی تپش سے پھٹ جاتی ہے اور کالے چڑمڑائے ہوئے پرتوں کی طرح کھڑکھڑاتی ہے تو ریت اس ساز پر اپنے وحشی گیت اور موت کے ترانے گاتی ہے مگر یہ ٹوبہ جس کا پانی پاتال سے ملا ہے کبھی نہیں سوکھتا کیونکہ اس اونچے ٹیلے کی خطرناک ڈھلوان سے نیچے کی طرف جنڈ اور کریں وائی اور پھوگ کے پودے بڑے جھتنار جال کے درخت میں الجھے ہوئے اس پر گرے پڑتے ہیں۔ اور پانی پر سایہ کیے ہوئے ہیں، جیسے پیاس بجھانے کو جھکے ہوں، ٹھنڈا اور میٹھا پانی آسمان کی نگاہوں سے چھپا سخت موسم میں بھی اس میں ہلکورے لیتا ہے، صحرا میں گم ہوئی گائیں، راہ بھولے ہوئے اونٹ، بھٹکے ہوئے ہرن سب اس پانی پر کبھی نہ کبھی جمع ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن اس چشمے پر اکٹھا ہوتے ہیں، خدا کی اس فیاضی پر خوش ہوتے ہیں۔

اور اس اونچے ٹیلے پر بنے گو پے پیچ در پیچ راہوں سے ایک دوسرے سے ملے ہیں

یوں لگتا ہے ایک شہر آباد تھا۔ اناج اور اسلحہ اور کپڑے اور تصویریں بنانے کا سامان، پنسلیں اور برش کاغذ اور کینوس، سنگار کا پٹارہ گھنگرو اور ستار، ڈھولک شہنائی اور انگریزی کتابیں، بے شمار لوٹ کے ڈھیر، نایاب چیزیں پھیلی ہوئی زندگی کا سمٹا سا نقشہ۔

شام قریب تھی۔ دھوپ کے زور میں ذرا کمی تھی۔ جب ہیلی کا پٹر بلند ہوا ہے تو دھلی ہوئی فضا میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا دور تک دکھائی دیتا رہا پھر افق نے اُسے اچک لیا اور نظر کی حد سے پرے اس کی بھر بھر بھی بند ہوگئی۔ میں نے باہر گوپے میں آکر ادھر ادھر دیکھا بندوق کو چٹائی پر رکھ دیا۔ اپنے اکڑے ہوئے اعضاء کو سیدھا کرنے کی خاطر سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کر انگلیوں کو کھینچا۔ دائیں بائیں گھوما ہوا کے آنے والے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دیکھا سپاہی بندوقیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ٹھنڈی ریت پر اوندھے لیٹ کر اپنا جلتا ہوا چہرہ چٹائی پر رگڑا۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور پھر جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔

"جناب! یہ عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے" سپاہی کی آواز توپ کے گولے کی طرح میرے کانوں میں داغی گئی۔ گھبرا کر میں نے بندوق پر ہاتھ مارا۔ اکڑی ہوئی ٹانگوں نے ہلنے سے جواب دے دیا۔ سوئی ہوئی انگلیاں بے جان سی بندوق کے گرد مردہ گھاس کی طرح بکھر گئیں۔

تنگ راہ سے پرے مجھے ایک گھاگرے کی گوٹ دکھائی دی اور گھیر بند اٹکے ہوئے ملگجے کُرتے کے دامن پر لٹکے ہوئے ہاتھ تڑے مڑے کاغذ کی طرح زاویوں اور مثلثوں اور ٹکڑوں اور شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لمبی انگلیاں پتلی تھیں جیسے کسی زمانے میں یہ ہاتھ ساز بجاتے رہے ہوں۔ ان انگلیوں نے برش اور قلم سے تصویریں بنائی ہوں پتھر کو تراش کر اس میں سے مورتیاں نکالی ہوں، یہ ہاتھ

کمزور نہ تھے مگر مضبوط اور جب جوان ہوں گے تو جانے کیا ہوں گے۔ اب بھی ان سے گھبراہٹ نہیں جھلکتی تھی۔ چہرہ مجھے اس وقت تک دکھائی نہیں دے سکتا تھا جب تک میں باہر نہ جاؤں یا آنے والی کو اندر نہ بلاؤں۔ بندوق کو اپنے سامنے تانے جب میں جھک کر باہر آیا تو میرے سامنے دھندلے بھُولے ہوئے خواب کی سی صورت تھی، پرچھائیں، مورتی جو پتھروں تلے دبی دبی ریزہ ریزہ ہو چکی ہو، مگر بکھری نہ ہو، سفید بالوں میں کہیں کہیں سیاہی تھی اور گوند سے جمائے ہوئے چمکیلے بالوں میں مانگ گم ہوئی پگڈنڈی کی طرح تھی سفید بھویں پپوٹوں پر چھائی ہوئی تھیں اور پپوٹے بے پلکوں کی آنکھوں پر گرے تھے۔ نگاہ اوٹ سے جھانکتی کرن تھی اور دھیرے دھیرے دیکھے جانے والی شکل کو اجُالتی تھی۔ گردن سیدھے کندھوں پر ٹکی ہوئی ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی وجود صدیوں پرانے پردوں کو ہٹا کر آج کی دنیا کو دیکھ رہا ہو۔

"میں 'اگنی دا' ہوں تیج سنگھ کی دائی ماں، ٹھاکر تیج سنگھ کی دائی ماں"۔

میں اسے دیکھتا ہی گیا۔

"کیا تم نے اسے کھوج لیا ہے۔ کیا وہ تمہارے پاس ہے؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لفظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"اجے سر سے آئی ہوں۔ کیا تم بیٹھنے کا نہ کہو گے؟"

مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

"تم اپنی بندوق کو پرے کر لو۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کھلونے سے ڈر آتا ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ پھر وہ اپنا بھاری گھاگرا سمیٹ کر اس کے گھیر دں پر بیٹھ گئی۔ جوتیاں اتار کر اپنے سامنے رکھ لیں اور پاؤں کو دبانے لگی۔

"تمہیں اپنے سے کسی بڑے افسر کا انتظار ہو گا کہ تم خود مجھ سے بات کر سکو گے"

مجھے چُپ دیکھ کر اس نے کہا "میرا بچہ سیدھا اور بھولا ہے، ہٹیلا بالک۔ ہوائیں اسے چک پھیریاں دیتی ہیں، اپنے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتی ہیں۔

"ہوائیں بھی کسی کو قید کر سکتی ہیں" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں سچ کہتی ہوں یہ ہوائیں اپنی لہروں اور آوازوں سے ایسا جادو جگاتی ہیں، ایسی ہانک لگاتی ہیں یہ کبھی نہ ختم ہوتے صحرا پر دن رات ناچتی ہیں تم نے کبھی ریت پر ناچ کے چکر نہیں دیکھے نا ورنہ تمہیں پتہ ہوتا کہ ان پر اگر کوئی ایک بار پاؤں دھر دے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا، پھر کسی کی نہیں سنتا۔ اپنی دائی ماں کی بھی نہیں۔"

"عجیب بات ہے"، میں نے جواب دینے کے لیے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے نا دکن سے ہوا گھلے تو بارش ہوتی ہے۔ گھنیرے کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر آتے ہیں، بجلی کے لہریے زمین کو چمکا دیتے ہیں، ایسے ہی چکروں کی بھی کہانی ہے، مگر تم شہروں کے رہنے والے یہ سب کیا جان سکتے ہو۔"

"اچھا!" اب میں دلچسپی اور توجہ سے بات سن رہا تھا۔

"ہوا آدمی کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے اپنی بلاؤں کو اس پر بٹھا دیتی ہے اس کے سر میں گھومنے پھرنے اور آزادی کے خیال بھر دیتی ہے، وہ جوانوں کے دل کو آبادیوں سے پھیر دیتی ہے، وہ دیوانے ہو کر بستیوں سے نکل آتے ہیں" وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھی رہی۔

کرنل خشک لمبی لیٹی ہوئی سوکھتی چرمراتی گھاس پر سے چلتا ہوا روشنی ملی نیلاہٹ کے گلابی پڑتے اجالے سے ہماری طرف آیا۔ گوپے کی طرف چبوترے پر قدم دھر کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"یہ تیج سنگھ آف اچّے سر کی دائی ماں ہے اگنی دا" میں نے فراغت کا سانس لیا اور بندوق کو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلا۔

کرنل نے گہری سوچتی ہوئی نگاہ سے اگنی دا کی طرف دیکھا جو اپنی ادھ مندی آنکھیں کھول کر بے خوفی سے کرنل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کرنل کے ماتھے پر ایک رگ زور سے پھڑک رہی تھی شاید اسے غصہ آ رہا تھا۔
" کیا کہنے کی ضرورت ہے تیج سنگھ کے لیے وہ اگر کسی بڑی ریاست کا راجہ ہو تو بھی سزا سے نہیں بچ سکتا" وہ پورا اپنی ایڑی پر گھوم گیا اور ٹیلے کی بلندی سے اس نے نیچے پاتال سے لوٹے پر نگاہ دوڑائی جہاں جال میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور شام کی ہوا سے پانی گیت کی لے پر مست مانجھی کی طرح تال کے بیچ ٹھہرا ہوا تھا۔
" میرا سوال سن لو جواب دینا نہ دینا تمہارے اختیار میں ہے" اگنی دا کی آواز میٹھی تان کی طرح کرنل کے پیچھے سے اٹھی۔
" مگر یہ سب ناممکن ہے تم یہ چاہو گی کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں" کرنل نے جھنجھلا کر اپنا پاؤں زمین پر مارا۔ میں مہینے سے اس جلانے والی گرمی اور پیڑوں کو کملا دینے والے صحرا میں ڈیرے ڈال کر یونہی نہیں پڑا ہوں"
اگنی دا نے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو سر پر برابر کیا " بھگشا ناتے بات کرنے کا ادھیکار تو دو، تم بہت غصے میں ہو۔ تمہیں ہونا ہی چاہیے۔ تم بہت دنوں سے اس صحرا میں گھوم رہے ہو۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ تم تیج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی کھوج میں ہو۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گئی "میں نے تین نسلوں سے اس کی چاکری کی ہے۔ تین نسلوں کی رگوں میں میرا دودھ ہے۔ کیا مجھے کچھ کہنے نہ دو گے؟"
" مگر تمہاری بات ایسی ہو گی جو میں کبھی نہیں مان سکتا۔ پھر ایسی باتیں سننے سے کیا ملے گا" کرنل نے بہت آہستگی سے کہا جیسے اگنی دا سے زیادہ اپنے آپ سے بحث کر کے اپنے آپ کو منوا رہا ہو۔
" دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی جس سے تمہاری راہ میں مشکلیں پیدا ہوں۔ سوچ کر جواب دو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی

نہیں ہے ، اجے سر میں اب میرا کون بیٹھا ہے "،
"کیوں اجے سر میں تمہارا خاندان ہوگا۔ بہوئیں بیٹیاں ، بیٹے پوتے ، گھر" کرنل نے کہا ،
میرا سب کچھ اس صحرا میں ہے ۔ صرف تیج میرا ہے ۔ میرا ٹھاکر "۔
کرنل نے کہا" گوپے میں چٹائیاں سیدھی کرو دیے جلاؤ ہم اگنی واکی بات سن ہی لیں" اور میری طرف دیکھ کر کہا" ٹوبے کے چاروں طرف پہرہ دوگنا کر دو میں سارے ٹوبوں اور پانی کے ٹھکانوں پر دیکھ آیا ہوں ایک بوند کہیں نہیں ہے سوائے اس ٹوبے کے ، رکن پور کے پانی کے ذخیروں کا بھی یہی حال ہے "،
میں نے سر جھکایا ۔ ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی سیاہ آسمان دوج کے چاند کی روشنی میں خالی خالی سا تھا ڈھلوان پر درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی اور کسم سر سے ابھرتی تو بال بکھرائے کنیچی کی طرح ہمارے چاروں طرف چک پھیریاں لیتی ۔ مدھم زردی میں ستارے ایک دم نہیں جیسے اندھیری راتوں میں ہوتا ہے ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں ہمارے سروں پر جمع ہو رہے تھے ۔
" ناتواں اگنی واکسم سر تک کا لمبا راستہ تم نے کیونکر طے کیا گرمی اتنی بے پناہ تھی اور تم تو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاؤ "!
دیے کی لو سیدھی اس کی زمانوں سے بھی پرانی آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور وہاں ہیرے کی چمک اور پھر الگ الگ ٹکڑے میں الگ جیسے ہیروں کے ریزوں سے بنی ہوتی پھر دلیوں کی لو کانپے اور دکھائی دے ، اگنی وا نے آنکھیں جھپکا کر کہا ۔
" کسم سر میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے ،، پھر سانس لینے کے لیے رک کر اس نے کہا " پہلے یہ سارے ٹوبے آباد تھے جیتے جاگتے لوگ یہاں رہتے تھے ۔ اجے سر سے اکثر کسم سر آیا کرتی تھی ، میرے ٹھاکر کے دادا کے وقتوں میں یہ آبادیاں تھیں

راج محلوں کی سی رونقیں تھیں۔ پھر اور لوگ، خراب موسم، وقت سب نے مل کر اسے سرکو ایک گڑھی بنا دیا۔"

سیٹی کی آواز کرنل کے منہ سے نکل گئی۔

"تمہیں وشواس نہیں ہے نا۔ میں بھگوان کی سوگند اٹھا کر کہتی ہوں۔ یہ سب سچ ہے"

"ان ویرانوں کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

"اس دھرتی پر تماشے ہوتے ہیں اور آکاش یہ تماشے دیکھتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ راجے ڈاکو بن جاتے ہیں۔ عزت دار بڑے لوگ بس مٹی میں مل جاتے ہیں"۔ اگنی دا کی مدھم مگر مضبوط اور صاف باتیں سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ تو ہے، یہ تو ہے" کرنل نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ جب تم یہ سمجھ گئے ہو تو آگے کی بات بھی تمہیں سمجھ آ جائے گی"۔

"اگنی دا میں تمہاری بات سمجھتا ہوں اور پھر بھی مجھے پتہ ہے تیج سنگھ کو دنیا کی کوئی حکومت معاف نہیں کرے گی"۔ کرنل کی آواز الجھی ہوئی، جھگڑالو، تیز اور قطعی تھی۔

"میں نے کہا ہے تم ٹھاکر کو چھوڑ دو؟" اس نے ہم سب کے منہ کی طرف دیکھا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اصل میں سارا قصور میرا ہے۔ اس ساری کہانی کی مصیبت میرے لائے لائی ہوئی ہے۔ بڑے ٹھاکر کو میں نے بچوں کی طرح پالا تھا۔ امر سنگھ کو تیج سنگھ کے باپ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اور اس سینے میں آگ جلتی ہے الاؤ لپکتے ہیں۔ جب میں وہ سب یاد کرتی ہوں جو ہوا"۔ وہ سر جھکا کر چٹائی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"امر سنگھ سیدھا تھا، بھولا اور وشواس کرنے والا اور اس لیے جب اس کے گھر میں وشواس گھات ہوئی تو اسے پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ

جاؤ۔ اجے سر کا ٹھا کر میں ہوں، میں ہوں اور اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور پھر وہ لوٹ گیا تھا۔

اجے سر رام سنگھ کا تھا۔ اجے سر کی راج گدی سوگ کے بعد اسے مل گئی۔ سال بیتنے پر بہو بھی اس کی ہو گئی۔ اپنے بھائی کے خون میں ڈوبا ہنستا اور خوش اجے سر کا ٹھاکر بن گیا۔

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ رام سنگھ کو زہر نہ دیا گیا ہو۔ تمہاری سوچ ہو،" کرنل نے کہا۔

"پہلے پہل میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ میں جلن کے مارے دیوانی ہوں ایسی کوئی بات نہیں مگر وہ رات وہ گھڑی بھلائے نہیں بھول سکتی۔ رام سنگھ کا سہاگ گھر کی سیڑھیوں سے اترنا، مجھ سے ملنا، اس کی خوشی، یہ سب بُرا خواب سمجھنے پر بھی سمجھے نہیں جا سکتے، بھلائے نہیں جا سکتے۔"

"مجھے پینے کو پانی کا ایک گھونٹ دو بھگوان کے لیے۔ میرا گلا سوکھ رہا ہے۔" اگنی را نے ہاتھ پھیلایا۔ میں نے اُٹھ کر صراحی سے مٹی کا خمرا اس میں بھر کر اسے تھما دیا۔

"ہاں یہ کسم سر کا پانی ہے۔ امرت جیسا پاتال کے سارے سوتے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"سارے ٹوبوں میں کڑوا اور بدبو دار پانی ہوتا ہے صرف کسم سر کا پانی پینے کے قابل ہے کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔ کبھی سورج کی گرمی سے سوکھتا نہیں اور کبھی کسی پر بند نہیں کیا گیا، صرف اب ہم اس پانی کو گھاٹ بنا کر تیج سنگھ کے منتظر تھے۔"

"اجے سر کی گڑھی کا مالک تو میرا ٹھاکر ہے۔ میں نے اسے بہو کے سائے سے بھی جدا رکھا اب سوچتی ہوں ہو سکتا ہے اگر یہ ماں کی گود میں رہتا تو حالات دوسرے ہوتے مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ رام سنگھ تو اس کی جان کا لاگو تھا۔ اگر اس کے رونے کی آواز اسے کو ٹھڑیوں اور آنگنوں کے پار سے کبھی سنائی دے جاتی تو بہو پہ بگڑتا۔ اس کی آنکھوں میں

بہو جس کو سہاگ رات سے میں نے اپنے ہاتھوں کا سایہ کیا جس کے قدموں میں آنکھیں بچھائیں جسے اپنی کوکھ سے جنم پانے والی بیٹیوں سے زیادہ پیار کیا۔ وہ مجھے ہار دے گی۔ میرے دل کو اپنے پیروں میں مسل کر آگے نکلے گی وہ اس کی پروا نہیں کرے گی جو اس کا سہاگ تھا پہلے پہل میں نے سوچا ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہوں۔ میرے کان کم اور غلط سنتے ہوں۔ یہ صرف دیور اور بھابی کی چھیڑ چھاڑ ہو۔ ذرا سی دل لگی، تھوڑا سا دلار یونہی مان اور کھیل۔ پتہ نہیں امر سنگھ کو کیوں شبہ نہیں ہوا۔ میں اسے بتا سکتی تھی، ہوشیار کر سکتی تھی مگر اس گھرانے میں خون کی ہولی دیکھنی نہیں چاہی۔ جب سمے بیت جاتا ہے تو بس بیت ہی جاتا ہے اور میرا دل یونہی اندر باہر ہوتا رہتا تھا۔ خوف کے مارے یونہی دھڑکتا تھا۔ جب سب ختم ہوگیا۔ بہو کے سولہ سنگھار اور پور پور سوگندھ اس کے پاؤں کے پائل، اس کے ماتھے کی بندیا، اس کی مانگ کا سیندور، اس کی آنکھوں کا کاجل اس کی ستی ساوتری ہونے کی چالیں اس کی ہستی کی موہنی اس کے ہونٹوں کے میٹھے بول سب مل کر وہ زہر بنے جو ٹھا کر امر سنگھ کی جان لے گئے۔

رام سنگھ اور بہو نے مل کر ایک جال پھیلایا تھا جس میں امر سنگھ پھنسا اور اس سے پہلے کہ وہ پھڑکتا وہ نہ رہا۔ آج اس گھڑی سوچتی ہوں جب اس نے ان دونوں کو اپنے پاس دیکھا ہوگا۔ ان کی ظالم آنکھوں میں اپنے انت کا لکھا پڑھا ہوگا۔ اس ایک لمحے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کا دل تو خود ہی پھٹ گیا ہوگا

سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے میں نے رام سنگھ سے کہا تھا چھوٹے بھیا یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ اپنی فتح کی خوشی میں اپنے مکمل اور طاقت ور ہونے کی اس گھڑی میں اس نے مجھے دھکیل کر پرے کر دیا۔ زور سے ہنسا اور کہا۔

تو تم اگنی جانتی ہو نا کہ سب کیا ہوا ہے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ جو دیکھا ہے بھول

جاؤ۔ اجے سر کا ٹھاکر میں ہوں، میں ہوں اور اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور پھر وہ لوٹ گیا تھا۔

اجے سر رام سنگھ کا تھا۔ اجے سر کی راج گدی سوگ کے بعد اسے مل گئی، سال بیتنے پر بہو بھی اس کی ہو گئی۔ اپنے بھائی کے خون میں ڈوبا ہنستا اور خوش اجے سر کا ٹھاکر بن گیا۔

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ رام سنگھ کو زہر نہ دیا گیا ہو۔ تمہاری سوچ ہو،" کرنل نے کہا۔

" پہلے پہل میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ میں جلن کے مارے دیوانی ہوں ایسی کوئی بات نہیں مگر وہ رات وہ گھڑی بھلائے نہیں بھول سکتی۔ رام سنگھ کا سہاگ گھر کی سیڑھیوں سے اترنا، مجھ سے ملنا، اس کی خوشی، یہ سب بُرا خواب سمجھنے پر بھی سمجھے نہیں جا سکتے، بھلائے نہیں جا سکتے"

" مجھے پینے کو پانی کا ایک گھونٹ دو بھگوان کے لیے۔ میرا گلا سوکھ رہا ہے۔" اگنی را نے ہاتھ پھیلایا۔ میں نے اُٹھ کر صراحی سے مٹی کا خمرا اس میں بھر کر اسے تھما دیا۔

"ہاں یہ کسم سر کا پانی ہے۔ امرت جیسا پاتال کے سارے سوتے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

" سارے ٹوبوں میں کڑوا اور بدبودار پانی ہوتا ہے صرف کسم سر کا پانی پینے کے قابل ہے کبھی سیاہ نہیں پڑتا، کبھی سورج کی گرمی سے سوکھتا نہیں اور کبھی کسی پر بند نہیں کیا گیا، صرف اب ہم اس پانی کو گھات بنا کر تیج سنگھ کے منتظر تھے۔"

" اجے سر کی گڑھی کا مالک تو میرا ٹھاکر ہے۔ میں نے اسے بہو کے سائے سے بھی جدا رکھا اب سوچتی ہوں ہو سکتا ہے اگر یہ ماں کی گود میں رہتا تو حالات دوسرے ہوتے مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ رام سنگھ تو اس کی جان کا لاگو تھا، اگر اس کے رونے کی آواز اسے کو ٹھریوں اور آنگنوں کے پار سے کبھی سنائی دے جاتی تو بہو پر بگڑتا۔ اس کی آنکھوں میں

خون اُتر آتا وہ بھلا اسے کہاں برداشت کر سکتا تھا۔

میں اسے چھپا کر رکھتی، جب یہ کھلکھلا کر ہنستا تو مجھے ڈر لگا رہتا۔ یہ میرے دل کے وہم تھے، میری بھول تھی میں سمجھتی تھی رام سنگھ اب تیج کو بھول گیا ہے۔ مہتاب اور شہتاب پیدا ہوئے تو اس نے مجھے بلایا تھا۔ پالنے پر جھکے ہوئے اور دونوں ایک سی صورتوں کو پیار کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"اگنی دا۔ دیکھو یہ میری وجے ہے"۔

"ٹھاکر بھگوان سدا سکھی رکھیں" میں نے دور کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"قریب آؤ اور دیکھو یہ تیج سے زیادہ خوبصورت نہیں ہیں کیا"؟

دل اچھل کر میرے حلق کے قریب خون خون ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ منہ پر بھینچ لیا اور جھک کر ان دونوں کو دیکھا پھر سیدھے ہو کر کہا "یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں اور میرا ٹھاکر بڑا ہے، بڑا اور بہت سندر"

"اگنی"! رام سنگھ نے مڑ کر کہا "تمہاری یہ جرات۔ تم ہمارے ہی منہ پر ہمارے بچوں کو برا کہہ رہی ہو"!

"چھوٹے بھیا میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں ابھی کیا پتہ چل سکتا ہے"

"ہم چھوٹے بھیا نہیں ٹھاکر رام سنگھ ہیں، اس گڑھی کے مالک اور یہ شیر کے بچے ہیں۔ ان کا پتہ تمہیں پالنے میں بھی چل سکتا ہے" اس نے گرج کر کہا۔

بہو لیٹے سے اٹھ گئی، وہ کانپ رہی تھی، باندیاں منہ ڈھانپ کونوں میں چھپ گئیں صرف میں کھڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

"جب تیج بڑا ہوگا تو وہ ٹھاکر ہوگا۔ چھوٹے بھیا یہ اس کے باپ ٹھاکر امر سنگھ کی گڑھی ہے" میرے سارے شریر میں سے جان نکل گئی تھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ

پسینے سے ٹھنڈے ہو گئے تھے، مگر میں نے بڑے ٹھاکر کو گود دوں کھلایا تھا۔ رام سنگھ اور امر سنگھ دونوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ مجھے اپنے حق اور اپنی شکتی پر بڑا مان تھا۔

"اس تھپڑ کے نشانوں میں آج بھی آگ سلگ اٹھتی ہے۔ جب میں یہ سب یاد کر رہی ہوں۔ چھوٹے بھیا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں جل اٹھتی ہیں"، اگنی دا نے اپنا تڑا مڑا زمانوں پرانے کاغذ کا سا گال سہلایا۔

"اگنی دا، اگنی دا" وہ چیخنے لگا "یہاں سے چلی جاؤ۔ اگنی دا"، مگر میرا سارا جسم یوں ڈھے گیا تھا جیسے بارش میں کچی دیوار بیٹھ جائے۔

اس کے بعد ہر دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا۔ رام سنگھ تیج کو بلاتا دانت پیستا اسے ڈانٹتا پھٹکارتا کبھی حکم دیا جاتا کہ تیج کو گڑھی سے باہر نکلنے نہ دیا جائے۔ اس پر نت نئے عذابوں اور نت نئی پابندیوں کی آزمائش ہوتی۔

ہو سکتا ہے اگر میں اپنی زبان بند رکھتی تو ہم پر یہ عذاب نہ ٹوٹا کرتا۔ ان سارے زمانوں، لمبے سالوں میں یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ اصل دشمن میں تھی جب دوسرے آپ کا حق چھینتے ہیں تو وہ ساری راہیں بند کر دیتے ہیں۔ ان کے اپنے دل تک جانے والے راستوں پر بھی پہرے ہوتے ہیں وہ نرمی محبت، رشتہ حق ہر شے کو بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں جو کسی اور دیس میں کسی اور جنم میں زندہ ہوتی ہیں۔

میں جب تیج کو مہابھارت کی کتھائیں سناتی تو وہ ہنس دیتا "اگنی دا، جو آدمی چھٹپنے میں کچھ نہ کر سکے جوانی میں بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ اگنی دا میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تم ایسے ہی اپنی جان کھپاتی ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی تمہارے سپنوں کا سورما بن کر گڑھی کا مالک بن جائے گا۔ میں کونتی ہوں، پانڈوؤں کی ماں کا بیٹا"

جب میں منہ لپیٹ کر لیٹ جاتی اور اس سے نہ بولتی تو وہ کہتا "اگنی دا اگر تم کہتی

ہو تو میں بہت بڑا اونچا شور بیر بن جاؤں گا۔ میرا سر چھت سے بھی اونچا ہوگا۔ بازو پھیلا کر یہ ساری جگہ گھیر لوں گا۔"

اگر تم کرسکو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔ میں نے اسے چھوٹے سپنوں میں الجھائے رکھا میں چوری چوری اسے گھوڑوں پر سواری کے لیے بھیجتی۔ اسے تیر چلانا اور وہ سارے کرتب جو گڑھی کے ٹھاکر کو آنا چاہئیں سکھاتی رہی۔ میں نے اسے اندر سے نہیں باہر سے ٹھاکر بنا دیا۔ ایک نراشا اور گھٹن اور بنا محبت کے پلا ہوا بچہ، سہما ہوا ڈرا ہوا۔ ڈرایا دھمکایا بچہ وہ آزادی اور دل کہاں سے لاتا جو ٹھاکر بننے کے لیے ضروری ہے۔" وہ چپ ہو گئی جیسے کھو گئی ہو۔" ایک دوپہر جب رام سنگھ کے باز گڑھی کا چکر لگا رہے تھے اُڑ رہے تھے۔ تو تیج نے ان میں سے ایک کو اپنے تیر سے زخمی کر دیا۔ میں نہ نہ کرتی رہی اور اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے تیر کا صحیح نشانہ آزمانے کے لیے اس اُڑتے باز کو نشانہ بنایا۔

دیواریں بھی کانپ رہی تھیں اور خوف سے سہمے ہوئے نوکر ان میں گھسے جاتے تھے۔ جب رام سنگھ نے میرے آنگن کا دروازہ توڑ ڈالا۔ اس نے تیج کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا وہ چیختا رہا اور وہ اسے ٹھوکریں لگاتا رہا۔ ایسی گھڑیوں میں بھگوان سو جاتا ہے کیا؟"

بہت دیر تک انگنی داخاموش رہی۔ تھکی ہوئی چڑیا کی طرح زور زور سے سانس کھینچتی ہوئی یادوں کے دیوں میں خون جلاتی ہوئی۔

جب بھوا سے دیکھنے آئی تو جانے رات کا کون سا پہر ہو گا۔ تیج رہ رہ کر چیختا تھا اور ڈر کر سسکنے لگتا تھا۔ ذرا سا بچہ ستار کے تنے ہوئے تار کی طرح ہوا سے بھی بج اٹھتا ہو کوفت اور شرمندگی اور بے عزتی کے احساس سے روندے جانے ٹھکرائے جانے کی اذیت سے سوجے ہوئے چوٹ کھائے ہوئے جگہ جگہ سے ابھرے ہوئے زخموں کی وجہ سے سو نہ سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ صرف خشک سسکیاں تھیں

جن کو روکے ہوئے بیٹھی میں سنکائی کر رہی تھی ، روشنی کی چبھن سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے دیا بجھا دیا تھا۔ عجیب سنسناتی ہوئی بے تاب رات تھی ، ناگن کی طرح پلٹ پلٹ کر حسن کی تنہائی پلٹ پلٹ کر مجھے ڈستی تھی ، تیج کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا کوئی نہ تھا ، ہم بھگوان کی اتنی بڑی دنیا میں اکیلے تھے۔ اکیلے اور بھلائے ہوئے۔ میں امر سنگھ کو اور بڑے ٹھاکر کو اور سارے گزرے ہوؤں کو یاد کر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کوئی نہیں ہے کچھ نہیں ہے۔ میں اور تیج پاتال میں گھر گئے ہیں بھگوان میں یہاں سے کیسے نکلوں۔ کسے پکاروں کسے آواز دوں۔ بہو نے دیا تپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں کھڑی ہو گئی۔

"اگنی دا ، تیج کا کیا حال ہے"

"اچھا ہے رانی ماں۔ ٹھیک ہے۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"اگنی دا ، میں تمہاری بہو ہوں۔ تیج کی ماں ہوں۔ رانی ماں نہیں ہوں۔" بہو میرے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی۔ "جو آگیا رانی ماں" میں نے اپنے پاؤں گھاگرے کی گوٹ کے اندر کر لیے۔ "تیج کی ذرا دیر ہوئی آنکھ لگی ہے اگر برا نہ مانیں تو آنگن میں چلیں وہ روشنی دیکھ کر جاگ جائے گا۔" ہم دونوں باہر آگئیں۔

"اگنی ، اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ تم نے تیج کو رد کا ہوتا۔ ٹھاکر کے باز پر تیر کیوں چلایا؟"

"دیکھو بہو میں تمہیں دوش نہیں دیتی مگر تم شتاب اور مہتاب کی ماں ہو اس بنا ماتا پتا کے بچہ پر کچھ تو دیا کیا کرو" اسے جینے کا حق تو دو تمہاری کرپا ہوگی۔ اگر تم اپنے پتی سے کہہ کر اسے کسی سکول میں بھجوا دو وہیں جہاں پر امر سنگھ کو بھجوایا گیا تھا۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں چھڑایا۔ ٹپ ٹپ آنسو میری ان انگلیوں کے بیچ سے گرتے رہے۔ دونوں ہاتھوں کو بھگوتے رہے میں بنا ہلے کھڑی رہی۔

ایسی ہی رات تھی کالی اور دکھ بھری گونجوں سے کراہتی ہوئی۔

اگنی دا، تم کچھ بھول نہیں سکتیں مجھے تیج سے ملنے دو، اس کے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ یہ دیکھو میں یہ لائی ہوں۔ اس نے ایک ڈبیہ میرے ہاتھ میں دے دی۔

"جانے اس میں کیا ملا ہو، تمہارے پتی دیو کو پتہ چل گیا تو تیج کو جیتا نہ رہنے دے گا اس لیے تم یہ واپس لے جاؤ اور خود بھی جاؤ"۔ میں نے اسے اپنے آنگن سے تقریباً دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

تیج اچھا ہوا تو مجھے اُسے گڑھی سے باہر بھجوانے کی جلدی لگ گئی۔ میں نے آپ ہی آپ پرانے دنوں کی یادوں کے سمے۔ اس کے کپڑے اور دوسرا سامان ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ سامان جو کبھی میں نے ٹھاکر امر سنگھ کے لیے تیار کیا تھا، ایسا ہی سامان جو میں نے بڑے ٹھاکر کے لیے بنایا تھا، اپنے زمانوں میں میرا دل ہلکا ہوتا مگر اب بھاری اور ڈوبتا ہوا تھا۔

اگلی صبح اسے روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں میں تیج کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی جانے اب کب ملنا ہو اور ہو بھی سکے کہ نہیں۔ جینا اور مرنا تو بھگوان کے بس میں ہے پر میں پل پل مر رہی تھی۔ آج تک مر رہی ہوں۔ تیج کو اپنے سینے سے لگائے میں نے پرارتھنا کی تھی، بھگوان تو اس کی رکشا کرے گا۔ میں اسے تجھے سونپتی ہوں، چاروں دشاؤں میں طوفان اور ہوائیں اور بلوان دشمن ہیں۔ میرا اکیلا بچہ تیرے حوالے ہے۔ بھگوان میرا یہ آنگن سونا نہ ہونے دینا، یہ دیا جلتا رہے امر سنگھ کا یہ نام مٹ نہ جائے۔ بھگوان تو نے موت بنائی ہے اور زندگی بھی۔ تو نے آشائیں دی ہیں اور ان کو پورا کرنے کا بھی زور تیرے پاس ہے"۔ پھر میں نے اور تیج نے مل کر مورتی کو پرنام کیا۔ میں نے آسن سے اٹھا کر سیندور کا ٹیکا اسے لگایا جیسا گڑھی کے ٹھاکر اپنی پیچدار پگڑی پہنتے سمے لگاتے ہیں۔ امر سنگھ کی پگڑی اس کے سر پر رکھی

تو اس نے کہا۔

"اگنی دا میں کسی شے پر وشواس نہیں رکھتا۔ نہ بدلہ لینے میں نہ گڑھی کا سردار بننے میں، اتنی لمبی چوڑی دنیا ہے اس میں مجھے بھیج رہی ہو تو وعدوں میں قید نہ کرو۔ اب ہم یہاں سے باہر کہیں ملیں گے تمہیں پتہ ہے میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں کس لیے واپس آؤں۔ اگنی دا، دیکھو رو کر نہیں اب ہنس کر مجھے وداع کرو۔ اچے سر کی گڑھی ہی تو ساری دنیا نہیں ہے؟ جانے کیا کیا تمہاری اور میری آنکھوں نے نہیں دیکھا جو ہے"،

میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ یہ ذرا سا بچہ جو میرے سینے کے ساتھ لگ کر سوتا تھا اور جب بھوک لگتی تھی تو منہ بسور کر کھانا مانگتا تھا۔ یہ ایک دم اتنا بڑا اتنا سمجھ دار کیسے ہو گیا۔ یہ بڑی بڑی باتیں جو مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئیں اس نے کب کہاں سے سیکھی ہیں؟ میں نے تو اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

تمہیں پتہ ہے اگنی دا جب میں گھوڑوں کو بھگانے کے لیے باہر جاتا ہوں تو میں ہوا کے چکر میں اپنا پاؤں ضرور دھرتا ہوں، مہاراج کہتا ہے کہ اس چکر میں پاؤں دھرنے والا ہوا کے جادو کے زور سے باقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ خوب گھومتا ہے مسافر بنا رہتا ہے۔"

"بھگوان"، میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔" تو یہ مہاراج تھا جس نے میرے تیج کو ہوا کے چکر میں پاؤں دھرنے کا بتایا تھا"

"یہ چکر کیا ہوتا ہے" کرنل نے پوچھا۔

"صحرا میں رہنے والوں کے اپنے وہم ہیں" میں نے اگنی دا کی جگہ جواب دیا" ہر جگہ کے چھوٹے چھوٹے وہم ہوتے ہیں۔ شگون اور اشارے"۔

تیج سکول سے کبھی واپس نہیں آیا، چھٹیاں ہوتیں تو وہ اپنے کسی استاد کے ساتھ پہاڑ پہ بھجوا دیا جاتا سردیاں ہوتیں تو وہیں پڑھائی کی کمی پوری کرنے کے خیال سے سکول کے

بورڈنگ۔ دس میں لکار رہتا۔ میں بولائی ہوئی دیوانوں کی طرح اپنے آنگن کے اندر دالانوں میں اور دالانوں سے باہر چھت پر نیچے پھرتی رہتی۔ آس لگائے لگائے راہ دیکھتے دیکھتے سولی پر لٹکے لٹکے مجھے نیند بھی نہ آتی۔ لمبی دوپہروں کو جب سوچیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں ہے بھگوان اب کیا ہوگا؟ کبھی تو، کبھی تو سکھ اور تیج مجھے آن ملیں گے۔

جب لمبے سرکی گڑھی کے باہر ایک سنسان رات میں تیج مجھے ملا ہے تو اسے دیکھتی رہ گئی "تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ گھر چلو میرے سونے آنگن میں بہار آئے۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی ہوں۔"

"اگنی دا"۔۔۔ اس نے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا" اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور تمہارے آنگن میں سما نہیں سکتا۔ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ تم سور بیر ہو۔ اب تم مجھے کس آنگن میں لیے جاتی ہو؟"

وہ اتنا بڑا، ایک دم عقل مند ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی، کھڑی رہی، اس کے پسینے کی سوگندھ، اس کا بھرا ہوا جسم یہ سب میرے تھے۔ ہاں میں اب اس پر مان کر سکتی تھی۔ شتاب اور مہتاب کی ماں نہیں، بہو نہیں۔ میں تیج کی ماں تھی۔ وہ مجھے کمزور بچہ سمجھ کر میرے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا میرے ماتھے اور گالوں کو چوم رہا تھا مجھے گھڑی گھڑی اپنے سے لگا رہا تھا۔ تیج میرا بچہ تھا۔ میرا اپنا تھا۔

"تیج! میرے بچے آخر تم کہاں جا رہے ہو"، جب اس نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں نے پوچھا۔

"یہ گھمبیر، بڑی اور گہری رات ہے اس میں کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس میں کیا ہے۔ نہیں معلوم نہیں بس یہی کھوجنے نکلتا ہوں۔ دا، انجانے کا جادو، ہوا کا جادو، زور سے ٹکر لینے کا جادو مجھ کو گھیرے ہوئے ہے۔" اس نے مجھے پھر اپنے۔۔۔ اتھر

لگا لیا۔

"مجھے بہلاؤ نہیں تیج۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ راتوں کو کہاں گھومتے ہو۔ کچھ مجھے جاننے کا ادھیکار ہے، ہے کہ نہیں،" میں نے پوچھا تھا۔

اس نے ہنس کر کہا تھا "سارے ادھیکار تمہارے ہیں مگر ان سوالوں کے جواب کسی اور وقت دوں گا۔ جب کبھی پھر ملیں گے۔ صرف یہ کہتا ہوں کہ جب میرے زخموں کے نشان ابھرتے اور دکھتے ہیں جب ان میں پھر سے ٹیسیں اٹھتی ہیں تو میں ان لوگوں کے لیے دوا کھوجتا ہوں جو دکھی ہیں اور جن کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ میرے لیے کسی گرڑھی کی ضرورت نہیں، کسی نیلے ہیرے کی ضرورت نہیں۔"

"بے کار کی باتیں" کرنل نے چٹائی پر اپنا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تیج نے یہی کہا تھا۔ تب سے اب تک۔ اس گھڑی تک جانے کتنا سمے بیت گیا ہے۔ میری اور اس کی بھینٹ کہیں نہیں ہوئی۔"

"میں تمہارے تیج کو ڈھونڈتا تو پھر رہا ہوں"۔ کرنل نے بات ختم کی ہی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی ہم نے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بندوقیں اٹھائیں اور باہر کی طرف بھاگے۔ ستاروں کا غبار روشن اور زیادہ چمکنے والے تاروں کے درمیان آبشار کی طرح ہمارے سروں پر گر رہا تھا۔ جال میں سوئی ہوئی چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں۔ بے چین ہو کر جاگ اٹھی تھیں، کہیں جنڈ اور کریں کی خشک ٹہنیوں پر پانی کے کھارے ٹڈوں نے اپنی چرچر پھر شروع کر دی تھی۔

بھاگتے قدموں، اونٹوں کے بلبلانے اور گولیوں کی ہر طرف سے آوازیں گھوم پھر کر سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔ ہوا جس رخ چلتی آواز ادھر ہی پلٹتی تھی۔

ہمارے پیچھے سے اگنی دا کی آواز گونجی "تیج ٹھاکر میں یہاں ہوں، تمہاری اگنی دا۔" ہمارے ہاتھ بندوقوں پر جم گئے۔ سانس رک گئی۔ جس طرف سے آواز ابھرے

گی ہم ادھر ہی نشانہ باندھیں گے۔

اور ہم ٹھیک ہی منتظر تھے۔ ٹوبے کے کنارے سے کسی نے زور سے کہا۔
"اگنی دا۔ سورگ میں"۔ اس سے پہلے کہ ہم شست باندھتے بات ختم ہو گئی۔
رنہال پوسٹ پر جس اگنی دا کو ہم نے دشمن کے سپاہیوں کے حوالے کیا اس کا وزن چڑیا سے بھی ہلکا تھا۔ بند آنکھوں کے گرد عجیب مسکان تھی۔ بے دانتوں کا چہرہ بھرا بھرا تھا اور گلابی جیسے بھور کا مکھ ہو۔ انجانے کے اور ہوا کے چکروں میں جانے کون قید تھا اور کون آزاد تھا۔ سورگ کہیں ہے بھی کہ نہیں۔

چندن کی چتا

یہ پچھلی راتوں کا چاند بادلوں کے جھروکوں سے جھانکتا ہوا بھاگتا جاتا ہے اور ہوا میں پانی کی بوندوں کی جھنکار سی ہے۔ درختوں پر نکلی نئی کونپلوں کی باس پھولوں کی سوگندھ کے ساتھ ملی میرے آس پاس ڈول رہی ہے۔ دور باغ کے کسی کونے میں کوئل رہ رہ کر یوں بولتی ہے جیسے میرے من میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھتی ہیں۔ نیچی دیوار سے پرلی طرف میرے بھیا کے پوتوں میں سے کوئی جاگ اٹھا ہے اور بنا رُکے چلائے جاتا ہے۔ میں چونک کر اٹھتی ہوں یہ کہیں میری پدمنی تو نہیں مگر پدمنی کہاں جب بھی گھر میں کوئی بچہ روتا ہے رات کو ڈر کر چیختا ہے ماں کو پکارتا ہے۔ مجھے پدمنی یاد آتی ہے۔ پدمنی تو اب یوں لگتا ہے، پچھلے جنم کی میری بیٹی تھی۔ اس جنم میں آنکھ کھول کر مجھے وہی یاد آتی ہے اور اس کے ساتھ سارے پرانے دکھ جاگ اٹھتے ہیں جیسے برسات کے جھرنوں سے سوکھی کھیتیاں ہری ہو جاتی ہیں۔ میں کانوں میں انگلیاں دیتی ہوں کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند کو دیکھتی ہوں۔ اندھیرے میں بھگوان کا دھیان کرتی ہوں، مگر من بڑا ہٹیلا ہے، بالک کی طرح اسے جیسے جیسے روکو ویسے

ویسے مچلتا ہے ۔ بھلا اس سے کون پوچھے پرانے دنوں میں کیا رکھا ہے ۔

میرے پاس سوئی مالتی نے بھی کروٹ بدلی ہے ابھی وہ کہے گی "ماں جی پوجا کا سمے تو ہو گیا ہے ۔ پھر میں یادوں کے بوجھ تلے دبی بھاری قدموں سے اٹھوں گی اور اشنان کروں گی باس سے تھکے پھولوں کو تھال میں سجاؤں گی اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں کو چوموں گی جبکہ میرا من اس ساری پوجا میں نہیں ہوگا ۔ میرے بھیگے بالوں سے گرتے قطرے میرے پیچھے دیئے کی روشنی میں ستاروں کی جوت کی طرح لگیں گے اور میں اوم کے اس مندر میں یوں گر جاؤں گی جیسے کوئی مہاتما سمادھی لگائے زمانوں سے بیٹھا ہو ۔ مالتی ست رام جپتی ہر ایک کو بتاتی ہے کہ میں پوجا میں رات دن کیسے مگن رہتی ہوں دل کی باتیں دوسروں کو کہاں معلوم ہو پاتی ہیں ۔

میں اوم کے اس مندر میں پھولوں کی سوگندھ سے گھری بھجن گاتی ہر سمے ان پرانے دنوں میں جا بستی ہوں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جب بیتا سمے کبھی لوٹ کر نہیں آ سکتا تو بھلا من میں ایسی بیکار کی آشاؤں میں کیوں الجھا رہتا ہے ؟ بھگوان جو شکتی دیتا ہے دکھوں کو سہنے کی طاقت دیتا ہے شانتی کیوں نہیں دے سکتا ۔ کبھی کوئی مہاتما ادھر آ نکلتے ہیں تو پجاری جی ان سے میرا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ مجھے اشیرواد دیتے آئے ہوئے سادھو مہاتماؤں سے میں آج تک یہ نہیں پوچھ پائی کہ تم لوگ جو مکتی کا پرچار کرتے ہو ، یہ بیکار کی باتیں رہنے کیوں نہیں دیتے ۔ مجھے مکتی کی آس نہیں ۔ گیلی لکڑی کی طرح میں سدا سلگتی رہی ہوں اور انت تک میں یونہی سلگتی رہوں گی ۔ میرا من پاتال کی طرح گہرا ہے اس کی اتھاہ نہ مجھے ملی ہے اور نہ تمہیں ملے گی ۔ یہ بھلا مکتی سے بھر سکے گا ۔ میں ناستک نہیں ہوں پر تمہارے بول مجھے تسلی نہیں دے سکتے ۔ لوگ کہتے ہیں وقت بڑے بڑے زخموں کو بھر دیتا ہے ، پر میرے ننگے زخموں پر تو کوئی شے بھی مرہم نہ بن سکی ۔

مالتی جانتی ہے میرے بنا کہے جانتی ہے کہ مجھے مکتی کی آشا نہیں پر زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا ۔ کبھی کبھی جب راتوں کو اندھیکار گہرا ہو

جاتا ہے اور اسے بھی نیند نہیں آتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور آپ ہی آپ کہنے لگتی ہے کیوں ماں جی پوجا سے بھگوان نہ ملے پرشانتی تو ملتی ہے ؟، اور میں یہ بات سنکر چپ رہتی ہوں۔ میں اسے کیا کہوں کہ کچھ بھی نہیں مل پاتا۔ کبھی بھی نہیں مل سکتا۔ آدمی کے حصّے میں صرف سلگنا آیا ہے

دھرتی کی طرح میں نے پدمنی کو جنم دیا تھا اور بھگوان نے جب مجھ سے اسے بھی لے لیا۔ اسے زندگی ہی میں مجھ سے الگ کر دیا تو میں اور کس شے کی آشا کروں۔ پجاری جی کی باتیں سن کر ادم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

ندی کا دھارا اسی طرح رواں ہے وہ پتھر بھی اسی طرح ہے صرف میں بدل گئی ہوں۔ چیزوں کے مقابلے مین آدمی کی زندگی کتنی کم ہوتی ہے۔ پیپل کا درخت ویسے ہی ندی پر جھکا ہوا ہے جیسے ان گنت صدیوں پہلے جھکا ہوا تھا۔ بیتا وقت مجھے تو اتنا ہی لمبا لگتا ہے جیسے اس کے اور میرے درمیان صدیاں ہوں زمانے ہوں اور کتنے ہی جنم ہوں۔ یہ جنموں پہلے کی بات لگتی ہے جب شام کے سائے ندی کی لہروں میں رنگ بن کر بہہ رہے تھے میں کھیتوں سے آتے ہوئے راہ میں تھک کر پتھر پر ٹک کر بیٹھ گئی تھی اور تھکن کو دھونے کے لیے پاؤں پانی میں ڈال لیے تھے۔ ساتھ کی سکھیاں آگے نکل گئیں اور مجھے آوازیں دیتے دیتے سرکنڈوں کے بنے ہوئے راہ سے دوسری طرف چھپ گئیں مجھے ان کی باتوں اور قہقہوں کی گونج دور تک سنائی دیتی رہی پھر بسنتی نے زور سے کہا "ہم جا رہی ہیں تو اکیلی کہیں گم نہ ہو جائیو"

بسنتی کو کیا معلوم تھا گم ہونے کے لئے اکیلے ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

پھر پل کے پار سے شام کے دھندلکے میں ایک سوار آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کیا "شام نگر کو راستہ یہیں سے مڑتا ہے ؟ وہ پیپل کے پتوں کے بھیگے ہوئے گہرے سائے

اور ندّی کے رنگین پانی کے مقابلے میں مجھ سے بہت اونچا اور دور ایک دیو سا لگ رہا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اس کی پلکوں پر دھول کی سفیدی بڑی بھلی لگتی تھی وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا اور اس کی کیسری پگڑی سے اس کے کان ڈھنپے ہوئے تھے اس کے کانوں میں لٹکے بالے بات کرتے میں ہل رہے تھے۔

میں نے کہا تھا پل کے پار والے شام نگر میں جاؤ گے یا ادھر والے شام نگر میں اور ہاتھ اٹھا کر دور اٹھتے نیلے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا تھا میرے بھیگے ہاتھ سے بوندیں میری بانہہ پر پھیلتی جا رہی تھیں ایک اور عجیب بیچینی میری جان کیساتھ لپٹتی جا رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر پہلے پل کے اس پار والے شام نگر کو دیکھا تھا پھر میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں دوسرے شام نگر کی طرف اس راہ پر جہاں سکھیاں ہنستی گاتی چلی گئی تھیں اور جہاں سے اٹھتے نیلے دھوئیں کی دھاریاں ہولے ہولے آکاش سے اترتے اندھیرے کی نیلاہٹ میں گم ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا اور پھر بنا کچھ کہے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا تھا جو میرے گاؤں کو جاتی تھی۔

لوگ چارے کے گٹھے اٹھائے اپنے جانوروں کے ساتھ آ رہے تھے اور شام کے سناٹے میں جو درختوں کھیتوں اور دھرتی کے سینے سے اٹھتا ہے، گھنٹیوں کی ٹنٹن ہنٹیں بہت بھلی لگتی تھیں، پچھم کی طرف سورج بادلوں کے پیچھے ہاتھ سے پھسلے گولے کی طرح نیچے ہی ڈھلکتا جاتا تھا اور دوسرے گاؤں کی طرف جاتی عورتیں تیز تیز قدم اٹھائے اپنے بوجھ سنبھالے بھاگتی جان پڑتی تھیں۔ ان کے پیچھے کھیتوں کی منڈیروں پر گرتے پڑتے بچے روتے جاتے تھے اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ایک گھڑی ان سب سے الگ ہوں، مجھے کہیں نہیں جانا اور جب شام رات کے گلے ملے گی

تو میں بھی اس کی سرخی کے ساتھ اوپر اٹھ کر گم ہو جاؤں گی۔ پرندوں کی پروں کی تیزی میں سما جاؤں گی۔ میرا خون رگوں میں گرم جلتا ہوا مجھے کسی اور کا بوجھ معلوم پڑتا تھا۔ سکھیاں اور اُن کے پیارے گیت مجھے بہت پرانی کہانی کی طرح لگے جس کا بس ایک آدھ بول ہی بھُولا بسرا سا میرے ذہن میں باقی رہا ہو۔ جانے پہچانے راہوں کی دھول مجھے قدموں کے نیچے آج بڑی بیگانی لگ رہی تھی۔ مندر میں شام کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور گاؤں کے دوسرے کنارے میرا گھر مجھے میلوں دور دکھائی دیتا تھا۔ گائیوں بھینسوں بار کو ہانکتے ہوئے لڑکے گاتے آتے تھے مجھے وہ آوازیں بھی عجیب لگیں جیسے جاگ کر پہلی انہیں سنا ہو۔ میرے سارے جسم میں ایک کپکپی تھی شاید دیر تک پاؤں ندی میں لٹکائے رہنے کی وجہ سے سردی کی لہریں میری رگوں میں چلنے لگی تھیں، شاید میرا من تب پہلی بار جاگا تھا۔ ایسا ہی ہوگا ورنہ جس گاؤں کی دھرتی نے مجھے جنم دیا جو مجھ میں رچی ہوئی تھی وہ بھلا بیگانی کیوں لگتی۔

ماں نے دیکھا تو پھٹکارنے کے لیے کہنے لگی "کیا ابھی تیرے کھیلنے کے دن باقی ہیں جو تو کھیت سے گھر تک آتے آتے جنم لگا دیتی ہے اور گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے ایسی آوازیں جو مجھے کسی اور کی لگی تھی کہا تھا "کیوں ماں آنند پور سے کوئی آیا ہے؟"

ماں نے کہا تھا "یہ سب باتیں پوچھ لینا کام تو پہلے نمٹا لے"، پھر میرا چھوٹا بھائی رونے لگا اور ماں نے بہت غصّے سے میری طرف دیکھ کر کہا "اب کھڑی کھڑی کیا سپنے دیکھ رہی ہے کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھیّا کو بہلا لے اتنے میں روٹی ڈال لوں۔

بھیّا کو اٹھا کر میں باہر جانے کے لیے مڑی ہوں تو ماں نے پھر کہا "اری چمپا کیا تیری مت ماری گئی ہے۔ ایسے سمے بھلا کوئی جوان لڑکی باہر نکلتی ہے جا کوٹھڑی میں جا

مر، گھر کا کام میں خود دیکھ لوں گی۔

آج جانے کیا بات تھی میں بدل گئی تھی کہ ماں کو غصّہ زیادہ تھا۔ بھیا کو لے کر آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں نے اپنی رگوں میں آگ سی بہتی پائی جیسے میں راون کا بت ہوں جسے میلے کے دن جلایا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی چنگاری نہ تھی۔ آگ کیسی تھی؟

پچھم کی طرف بادلوں میں لگی آگ ہوتے ہوتے ہوا میں گھل گئی اندھیرا آکاش سے نیچے اتر آیا ہے اور کھیلنے والوں لڑکوں کی طرح ایک ایک کر کے تارے اپنے گھروں سے نکل کر مانو میدان میں اکٹھے ہونے لگے۔ میرے کندھے سے لگا لگا بھیا جانے کب کا سو چکا تھا۔

ماں کے پکارنے پر جب میں نے اوپر دیکھا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے نیند میں کسی کو دیکھ رہی ہوں۔ بھیّا کو لٹا کر میں چور سی بیچ آنگن کے کھڑی ہو گئی۔ آج میرے ہاتھ پاؤں میرے بس میں نہ تھے خیالوں کا دھارا جانے مجھے کہاں بہائے لئے جاتا تھا جیسے میں بھی ایک تنکا ہوں جو ندی کی لہروں میں آگے ہی آگے پانی کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پھر پیپل کی چھاؤں اور ندی کے رنگین دھارے کے بیچ کھڑا وہ سوار جانے کیوں گھڑی گھڑی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا آخر وہ میرا کون تھا؟

پھر شام اور گہری ہو گئی بھیا سو گیا بابا مہمان کے لئے کھانا حویلی ہی میں لے گیا میں اور ماں گلی کی عورتوں کے ساتھ گاؤں کے باہر چلے۔ میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں آج چمپا کے ہاں کون آیا ہے کہ اس کی ماں نے حلوہ پکایا ہے اور دال میں گھی بھی چھوڑا ہے۔

میں نے کہا آنند پور سے کوئی آیا ہو گا۔ ماں سدا اپنے پیاروں اور مائکے والوں کے لیے ہی اچھی اچھی چیزیں پکایا کرتی ہے۔ سب میرے سر ہو گئیں "واہ واہ ہمیں جیسے آنند پور

سے آنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اری ہوش سے بول کیا آنند پور والے حویلی میں بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ تیرا آج کیا حال ہے کہ ایک پاؤں یہاں پڑتا ہے اور دوسرا وہاں کیا تونے نشہ پی رکھا ہے تجھے معلوم نہیں آج تیرے گھر کیا پکا تھا. تیری ماں نے نیا بچھونا نکال کر دیا ہے۔ اب بتا بھلا وہ کون ہو سکتا ہے پھر وہ سب ناچتی ہوئی میرے گرد گھومتی رہیں اور مجھے مانو پاگل بنا دیا۔

گاؤں میں اور لڑکیوں کی طرح مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ نئے گہنے ملیں گے آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں گی اور میرے لہنگے کی گوٹ بھی ریشم کی ہوگی۔ میرے سپنے اس سے آگے کبھی نہ گئے۔ نیم تلے جب عورتیں مل کر سوت کاتتیں اور لڑکیاں مل کر گیت گاتیں تو میرا انگ انگ ایک عجیب خوشی سے جھوم اٹھتا۔ ان دنوں میری سہیلیاں کہتیں۔

"اری چمپا تجھے کیا ہو گیا ہے تیری آنکھوں میں جوت سی کیا جلنے لگی ہے جیسے ان میں تارے بھرے ہوں اور یہ اتنی پھیل کیوں گئی ہیں۔ جیسے سارے چہرے کو ڈھانپ لیں گی" ماں بھی مجھ سے بہت پیار سے بولتی کبھی غصہ نہ ہوتی بڑی بوڑھیاں مل کر بیٹھتیں تو کہتیں چڑیوں کی طرح بیٹیوں کے دن بھی بابل کے آنگن میں کم ہوتے ہیں اور بیت جاتے ہیں اور پھر اپنے بیاہ کے اور مائکے کے قصے لے بیٹھتیں سالوں پیچھے پرانے دنوں میں پلٹ جاتیں اور یوں روتے ہنستے میرے وداع کے دن آ گئے۔

۲

برات آئی تو دھوم مچ گئی اونٹوں کی قطاریں نہر کے پل سے لے کر ہماری حویلی تک تھیں باجوں کے شور اور آدمیوں کی بھیڑ میں لگتا تھا یہ گاؤں اوپر اٹھتا جاتا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں ہمارے آنگن میں جمع تھیں اور ڈھولک کی دھپ دھپ راگوں کی ندی بہہ رہی تھی۔ گھنگرو باندھے ناچنے والیوں کے پاؤں میں بجلیاں تھیں سنگار کرواتے ہوئے

نائن مجھ سے کہتی جاتی تھی " بیٹیا تیرے دھن بھاگ ہیں جو تو ایسے بڑے گھر جا رہی ہے ایسا گھر جہاں دودھ دہی کی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں لونڈیاں باندیاں بھی ریشم پہنتی ہیں، ارے تیرے جیسے بھاگ تو گاؤں میں کسی کے بھی نہیں ہیں تو ایسی بھگ وتی ہے وہاں جاکر ہمیں بھول نہ جانا۔ اور جانے کیا کچھ کہتی نائن میرے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشم کے ڈھیروں میں میں دب کر کھو جاؤں گی میرا سانس گھٹ جائے گا دودھ دہی کی نہروں میں یوں بہہ جاؤں گی کہ مجھے کنارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ اور پھر ساری رونق اور شور کے اوپر مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جنہوں نے مجھے دیکھا تھا کہ میرا دل ڈول گیا تھا اور میرے گیلے ہاتھ سے جو شام نگر کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اٹھا تھا پانی کی بوندیں میری بانہہ پر ایسے بہہ رہی تھیں کہ میری جان کو ایک عجیب بے چینی سی لپیٹے جا رہی تھی، نائن کا کرایا ہوا سنگار چُبھن بن رہا تھا اور کاجل میری آنکھوں میں ریت کے ذروں کی طرح لگتا تھا۔ میرا من جانے کیوں اس ساری خوشی میں الگ اکیلا تھا اور بہت اداس تھا۔ میں بے حد گم سم بیٹھی تھی اور میری سکھیاں مجھے چھیڑ رہی تھیں۔ جانے کیوں ایسے ہی بیکار کی ایک آشا کی طرح میرا جی چاہ رہا تھا کوئی مجھ سے اس سجیلے کا ذکر کرے اور کہے کہ تیرا دولہا ایسا ہے۔

ماں کو میں نے دو ایک بار اپنے پاس سے گزر کر اندر کوٹھڑی میں جاتے دیکھا تھا میلے کپڑوں میں بھی اس کا چہرہ جگ جگ کر رہا تھا اور جب کسی سے بات کرتی تو لگتا تھا کہ ابھی اس کے گلے لگ کر مارے خوشی کے ناچنے لگے گی۔ اندر باہر عورتیں اور آنند پور سے آئی ہوئی برادری کی لڑکیاں پاؤں میں جھانجھریں جھنکاتی یوں ہی بھاگ دوڑ رہی تھیں جیسے سب سے زیادہ کام تو بس انہی کے ذمے ہو۔ بھیگی ہوئی سہانی رُت تھی اور سردی میرے جسم پر یوں لگتی تھی جیسے کوئی انجانا ہاتھ مجھے تسلی دے رہا ہو ہوا جب کھلے دروازے سے آتی تو جان پڑتی جیسے گھبراہٹ میں مجھے تسلی دے رہی ہو۔

میں آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور عجیب سپنا میرے سامنے تصویروں کی طرح گھوم رہا تھا۔ جس میں میری سہیلیوں کی جھانجھنوں کی جھنکار بھی تھی۔ ڈھولک کے ساتھ گائے ہوئے گیت بھی تھے۔ برات کے ساتھ آئے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بھی تھی۔ جیسے راس لیلا رچانے والوں کی ٹولی میں گوپیاں کنھیا ہوں اور میں رادھا تھی اور یہ سارے شور کا دھارا میرے سامنے بہہ رہا تھا اور میں اس سے الگ تھی۔ ہم دونوں تھے میں بھی اور کوئی دوسرا تھا مجھ سے اونچا میری پہنچ سے دور مگر میرے بالکل قریب جیسے میری جان کا ایک حصہ ہو۔ جیسے میرے انگوں کی ساری دکھن نکل کر اس کے قدموں میں لوٹ رہی ہو میری جان اس کے پاؤں میں ہو۔ میں ایک ریشم کا کیڑا ہوں جس پر اگر وہ چاہے تو اپنا پاؤں دھر دے۔ میں ایک کنول کا سفید پھول ہوں اگر چاہے تو اپنے سانس سے اس میں خوشبو بھر دے۔ میرے قریب کھڑے ہوئے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا ہے تو سن سن کر میری جان یوں نکل گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں نہ رادھا ہوں اور نہ کوئی اور دھرتی کا ایک ذرہ ہوں جو اگر اس کے پاؤں تلے آ جائے تو اس کی مان اور شان بڑھ جائے آنگن میں جانے کیسا شور ہونے لگا تھا یا میرا سپنا ہی ایسا تھا کہ مجھے لگا کسی نے میرے پاس کھڑے ہوئے جوان کے سر پر زور سے کوئی شے ماری ہے۔ چمک سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں چیخ مار کر گر پڑی۔

میری سہیلیاں میرے گرد اکٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں "چمپا اری چمپا ہوش میں آ پھیرے ہونے والے ہیں۔ اور تو یوں چیخ رہی ہے یہ کیا بدشگونی ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے تو دو گھڑی کمر سیدھی کر لے۔

میری آنکھوں سے آنسو ساون کی جل دھارا کی طرح بہہ رہے تھے اور میرے پرانوں میں جان نہ تھی۔ سارا کیا ہوا سنگار خراب ہو گیا۔ اور نائن ہاتھ ملتی ہوئی پھر سے پٹاری کھول کر بیٹھی۔ مگر میرا اپنا آپ میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ سنبھل

کر بیٹھوں پر سنبھل نہ پاتی تھی، پھر آنکھوں میں آنسو بھرے ماں آئی اور کہنے لگی "چمپا تجھے کیا ہے بیٹی کیا تجھے بیاہ کی خوشی نہیں ہے میں تو بہت خوش ہوں کہ تیرے بھاگ پرماتما نے اچھے بنائے ہیں اور تو ہے کہ روئے جاتی ہے، لڑکیاں تو اس دن کے انتظار میں رہتی ہیں اور اب جب کہ میرے دوار پر یہ دن کھڑا ہے تو گھبرا رہی ہے۔ اری پگلی تو سدا کے لئے تھوڑا جا رہی ہے بس دو چار دن میں لوٹ آئے گی اور پھر تیرے جیسا دولہا تو بھگوان ہر کسی کو دے، نراش کیوں ہوتی ہے دیکھ تو سہی سارے گاؤں سے اچھا تو تیرا گھر ہو گا۔

باہر سے کسی نے پکارا ہے تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنے میں شور ہوا کہ سسرال والے آ گئے ہیں، لڑکی باہر آئے تو پھیرے ہوں، میرے ننھیال کی عورتیں اور برادری کی لڑکیاں مجھے پکڑ کر باہر لائیں، میں کانپ رہی تھی۔ جیسے سردی بہت زیادہ ہو۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ مندر میں سویرے کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور رات کی جاگی ہوئی عورتیں ڈھولک بہت تیزی سے بجا رہی تھیں۔

سرکنڈوں سے بنے چھپّر میں رنگین تاگوں سے بنے لٹو چاروں طرف سے میرے سر پہ سایہ کئے تھے۔ اور گھی کے دیوں کی روشنی میں ہون کنڈ کی آگ بڑی پوتر لگ رہی تھی، لپکتی ہوئی جیسے باقی ہر شے کو اپنے میں کھینچ لے گی، پھولوں کے سہروں میں سے جھانک کر میں نے دیکھا تھا ماں کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ آنسو روکے جانے کیسے بیٹھی تھی بھیا اس کی گود میں لدا ہوا تھا اور لوگوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میلے میں آئے ہوؤں کو دیکھ رہا ہو، اس کی رو رو کر تھکی ہوئی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں پر وہ انہیں کھولے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دور پرے میرے آنند پور والے ماما اور دلّی دیس سے آئے ہوئے چاچا سر جھکائے بیٹھے تھے، پھر پھولوں کی لڑیاں کسی عورت

نے برابر کر دیں تو سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

پھیرے کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا جانے یہ کون ہے جو مجھے کسی دوسرے گاؤں سے وداع کرانے آیا ہے میرے دل میں کھلبلی سی مچی تھی اور میں چاہتی تھی، کم از کم گھونگھٹ اور پھولوں کا یہ بوجھ ہٹا کر ایک بار اس چہرے کو تو دیکھ لوں۔ اور آج مجھے معلوم ہوا ہے چہروں میں کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کتنے بھولے دکھائی دیتے ہیں!

پنڈت جی اشلوک پڑھ کر آگ پر جانے کیا کچھ ڈال رہے تھے کہ باس سے میں بے سُدھ ہوئی جاتی تھی، آج کتنے زمانوں کے بعد میں وہ باس مجھے انوکھی اور الگ سی میرے ذہن کے ایک کونے سے جہاں بھولی بسری یادوں کے ساتھ پڑی ہے آیا کرتی ہے۔ سامگری کی سوگندھ چلتے میں میرے لہنگے کی گوٹ میرے آگے آگے بجلی کی طرح کوندرہی تھی اور پیچھے سے کھلی چولی میں اتنے کپڑوں میں لپٹی ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا میں ننگی ہو جاؤنگی۔ بیٹھی ہوں تو یوں تھکی ہوئی تھی جیسے جنموں کا سفر کر کے آئی ہوں اور لگتا تھا گر جاؤنگی۔ یہ سارے لوگ جو میرے آس پاس بیٹھے تھے جانے کون تھے اور وہ جو میرے قریب بیٹھا تھا وہ جانے کون تھا۔ میرے ساتھ کیا بیتنے والا تھا۔ پھر ہون کنڈ کو ہٹا کر مجھے اور اسے جواب میرا بھگوان تھا آمنے سامنے بٹھا دیا گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے میرا ہاتھ کبھی اٹھایا جاتا تھا اور کبھی رکھ دیا جاتا تھا۔ میری آنکھیں مارے تھکن کے بند ہوئی جاتی تھیں جب نائن نے کہا تھا کہ بی بی آنکھیں کھول کر اپنے دولہا کو تو دیکھ۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کو دیکھنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں کھل نہ سکیں، یہ ساری رسمیں ہو چکی تھیں۔ سورج نکلنے والا تھا۔ جب سرکنڈوں کی اس کوٹھڑی میں سے سب کو نکال کر میری سکھیوں نے مجھے اس کے ساتھ قید کر دیا تھا جو میرا پتی تھا۔

گھی کے دیئے کی لُو مجھے بجھتی ہوئی لگی اور پھولوں کی باس تھکن سے بے ہوش ہوتی جان پڑی، جب کسی نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا ہے۔ بھگوان جانتا تھا میں کچھ

دیکھنا نہ چاہتی تھی مجھے صرف سننے کا انتظار تھا۔ بیگانے ہاتھوں کا جو میری طرف بڑھیں گے اور لاج کے مارے میں دوہری ہو جاؤں گی۔ اور اس انتظار میں جیسے زمانے بیت گئے۔ دیئے کی لو بھڑکی اور بجھ گئی اور اندھیرے میں پلنگ کی دوسری طرف بیٹھنے کی آواز آئی۔ رہوتے ہوتے میرے انگ ڈھیلے پڑ گئے، شاید میں انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔

آج تک یہی انتظار ہے جو میرے گرد باقی ہے اور جو کچھ باقی دنوں میری زندگی میں ہوا ہے اس نے بھی انتظار کرنے کے جادو کو نہیں توڑا۔ میں نے دوار دوار بھیک مانگی ہے، پر بھکشا کے ناطے بھی کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا، جانے کتنی آنکھوں میں میں نے جھانکا ہے۔ جانے کتنے ہاتھوں کو میں نے چھوا ہے۔ پر میرے شریر میں وہ اینٹھن ویسی ہی ہے۔ وہ اتنا تناؤ جو اس صبح کو دیئے کے بجھنے کے بعد سے اب تک میری رگوں میں خون کے ساتھ موجود ہے بھگوان کیا یہی بیاہ تھا۔

ڈولی اٹھی ہے تو میں ڈھنگ سے بیٹھ نہ سکتی تھی۔ نہر کے پل سے لے کر دریا کے گھاٹ تک اونٹوں کی قطاریں تھیں جن کی گھنٹیوں سے لگتا تھا سارا جہان مجھے وداع کرانے آیا ہے۔ ماں کے رونے کی آواز سب سے الگ اونچی تھی، نائن میرے کپڑوں کو ٹھیک کرتی ڈولی میں بیٹھی ہچکولے کھاتی میرے ساتھ آن لگی تھی، بابا اور بھیا اور وہ سارے جن کے درمیان میں نے آج تک کا وقت گزارا تھا کہاں تھے وہ بیگانہ آدمی جو آج صبح میرے رنگین پلنگ کی پائنتی بیٹھا رہا تھا کیسا ہوگا، دریا کے گھاٹ تک گاؤں کی عورتیں جو گیت گاتی آئی تھیں وہ میری سمجھ میں نہیں آپاتے تھے جیسے کسی اور ہی بول میں ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری ارتھی اٹھ رہی ہے، میں نے بڑے خیالوں کو سر جھٹک کر دور کرنا چاہا۔ اور نائن سے کہا کہ میرا دم گھٹتا ہے ذرا سا پردہ تو سرکا دے۔

دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا، کشتی کو رنگین تاگوں اور ریشمی پھندنوں سے سجایا گیا

تھا۔ جب چپو چلتے تو گھنگرؤں کی جھنکار بڑی مدھر لگتی۔ پھر مجھے لگا میں رادھا ہوں جو پیارے دیس اپنے کرشن کو ڈھونڈنے جارہی ہوں پر یہ جو میرے پاس بیٹھا تھا کون تھا۔ گم سم اور خاموش جیسے اس پر کوئی جادو کر دیا گیا ہو۔ دریا پر کی ٹھنڈی ہوا آ آ کر میرے چہرے پر لٹکے سہرے کو ہلاتی تھی اور میٹھی پھوار کی طرح میرے جسم پر پھیلتی تھی پر میری رگیں جیسے سخت پڑ گئی ہوں پتھر کی طرح اس ٹھنڈ کو قبول کرنے سے انکار کر رہی تھیں، جیسے میں مورتی بن گئی ہوں۔ جس پر پانی کی پھوار صرف اوپر کی سطح کو ہی بھگو سکتی ہے۔ آج تک کسی ٹھنڈ نے میرے انتر کو ٹھنڈا نہیں کیا میں تو اپنا نرک اپنے ساتھ لئے پھرتی ہوں میرا نرک جس میں ہر کام کا آخر تھکن اور اینٹھن ہوتی ہے۔ مجھے آج تک کسی نے سکون کی اس میٹھی نیند نہیں سلایا جو اس سرکنڈوں کی کوٹھڑی میں رنگین پایوں والے پلنگ پر سونے سے پہلے میری تھی۔

پھر میرا گاؤں پیچھے چھٹ گیا اور ناؤ آگے بڑھ آئی۔ دریا کا دھارا وقت کی طرح جہاں جی چاہے بہا کرلے جاتا ہے ملاح زور لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں پانی تھا اور دل چاہتا تھا یہ لہریں مجھے اپنے میں چھپا لیں دوسرے کنارے پہ آموں کے بور کی خوشبو نے میرا سواگت کیا اور سایوں والے ٹھنڈے راہ پر میں اس گاؤں کی طرف چلی جو اب میرا دیس بننے والا تھا۔ جس کی مٹی میں میرے جسم کو ملنا تھا جو پرماتما نے میرے لئے بنائی تھی۔

ڈولی کے آگے آگے چلنے والا سوار بانکا چھبیلا تھا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر بیٹھا ہوا۔ لوگوں سے ہنس ہنس کر بولتا جاتا تھا۔ نائن نے پردہ سرکا کر کہا بی بی باہر تو جھانک دیکھ تو سہی کتنا سندر نگر ہے۔ درختوں کی اوٹ سے پرے کھیتوں پر سے ہوا اناج کی خوشبو لا رہی ہے۔ پرنتھ بار بار میرے ہونٹوں پر آ کر لگتی تھی اور سانس لینے میں ناک دکھ رہی تھی اس لیے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ میں تو آپ

مہکار بنی ہوئی تھی۔

۳

میں نے جب آئینے میں جھانکا ہے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تو یہ میں تھی میں جو چمپا تھی اور جو پرسوں تک کھیتوں میں گھومتی ندی میں تیرتی اور آنگن میں اتنے اونچے پینگ چڑھاتی تھی کہ میری سکھیاں بس بس کہنے لگتیں۔ یہ میں تھی چمپا جس کو ماں نے کبھی اچھا کپڑا پہننے کو نہیں دیا، تہوار کو بھی جسے کبھی ریشم دیکھنے کو نہیں ملا تھا، شام نگر کی وہ لڑکی اب گزوں ریشم میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور بالوں میں پروئے موتی چہرے کے مقابلے میں ماند تھے آنکھوں میں آکاش کے سارے ستاروں کی جوت تھی اور کاجل کی لکیریں دھڑکتی ہوئی رگوں کی طرح آنکھوں میں پکڑ دھکڑ کر رہی تھیں، پاؤں ہلاتی تو بچھوے بج اٹھتے اور ہاتھ ہلتے تو گھنگروؤں والے کنگن ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ ماتھے پر لٹکے ٹیکے میں جڑے ہیروں سے روشنی نکلتی تھی اور جو عورت گھونگھٹ الٹ کر دیکھتی حیران ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔ ہولے ہولے دن کھسکتا رہا اور شام کی طرف جاتا رہا اور پھر نرم سی ہوا چلنے لگی۔

اس رات جانے کتنے پرانے اور پہلے خواب میرے من کی دیوار سے آکر ٹکرائے ہیں اور میں نے کیا کیا سوچا، پھر تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا، چاند نکلا، رنگین پائیوں والے پلنگ کے چاروں طرف پھولوں کی چادروں کی مہکار تھی اور گھی کے دیئے جل رہے تھے باریک بادلے کے دوپٹے میں سے میرا سنگار جانے کیسا لگ رہا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی تھی، اپنے پاؤں کو دیکھتی تھی کیا یہ میں ہی تھی کہ گھاٹ سے یہاں تک آنے میں کتنے ہی جنم پار کر گئی تھی۔ جادو کا کیسا دیس تھا۔ اپنے جسم کی پاگل کرنے والی باس سے میں آپ ہی بیہوش ہو جاتی تھی بھگوان۔

پھر اس آنگن کی طرف آنے والے راہ پر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی
دی اور میری رگیں اُسی طرح پتھر ہو گئیں۔

۴

میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ جس کو مجھے بھگوان بنا کر پوجنا تھا اس
نے مجھے دیوی سمجھ کر پوجا۔ میں چاہتی تھی بچپن سے سوچتی آئی تھی جانے کون
میرا دولہا ہوگا۔ میں کیسے کیسے اس کی سیوا کروں گی۔ پر میرے من کی پوجا
میرے من میں رہی۔ میرے دل کے بند کبھی کھل نہ سکے۔ میں اس پدوی سے
نیچے اتر نہ سکی جس پر میرے اپنے بھگوان نے مجھے بٹھا دیا تھا۔ اُس رات بھی میرا
گھونگھٹ الٹا ہے تو میں منتظر رہی ہوں مگر اس نے کہا" چمپا تم تو دیوی ہو دیویوں
سے بھی زیادہ سندر اور سندرتا میں نہیں سکتی ہے پھر اس نے جھک کر میرے پاؤں چھو
لئے اور انہیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کی اس بھول نے میری ساری
زندگی کو برباد کر دیا ہے بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے میں نے اس آسن سے اترنے
کے لیے جو جتن کئے ہیں سب بیکار گئے ہیں صرف اس ایک لمحے کی غلطی نے میرے
سر کو گناہوں سے جھکا دیا ہے پر پھر بھی مجھے جو چاہیئے تھا وہ میں نہ پا سکی۔ تم مندر
میں جاؤ اور تم دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکو اور تم یہ دیکھو کہ تم آپ مورتی ہو اور آپ
ہی دیوتا تو تمہارا من کیا کہے گا۔ میں نے اپنا کیسا کیسا سر مارا ہے کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم
مالتی کو ہی سمجھا سکوں کہ قصور میرا نہیں ہے پر مالتی مانے تو!

میں نے کتنی بار کہا ہے مالتی میں تو پجارن تھی۔

اور مالتی کہتی ہے ماں جی تم سے بڑھ کر بھاگوان کون ہوگا جسے ایسا پتی ملا ہے
جو پوجتا ہو جو دیوی سمجھتا ہو۔ ارے ماں جی ہر کسی کے ایسے بھاگ کہاں!

میں مالتی کو کیسے بتاؤں کہ میں نے کیا چاہا تھا اور مجھے کیا ملا۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی غصہ ور ہو کہ میں اس کے خوف سے کانپتی پھروں۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی مجھے عورت سمجھے اور عورت کی کمزوریاں تو بہت ہوتی ہیں، جنہیں پجاری معاف نہیں کرتا پر پتی بھول سکتا ہے۔ ہمارا گھر سورگ نہ بن سکا۔ وہ مندر کا بڑا پجاری تھا اور اس نے آپ دیوی بنا کر میری پوجا شروع کر دی۔ اس کی عاجزی دیکھ کر میرا جی چاہتا اس کے سر پر زور سے ٹھوکر ماروں۔ جب وہ میرے پاؤں اپنی آنکھوں پر ملتا تو میں یوں پتھر کی طرح پڑی رہتی جیسے سچ مچ میں دیوی ہوں۔ ادہ بھگوان کیسی کیسی یادیں آج پرے باندھے چلی آتی ہیں۔

جب میں اس کے لئے آپ کھانا بناتی تو وہ کہتا۔ چمپا نہیں یہ تمہارا کام نہیں ہے تم میری دیوی ہو کر یہ سب کچھ کر کے مجھے اپرادھی بنا رہی ہو۔ تم تو صرف اس لئے بنائی گئی ہو کہ تمہاری پوجا کی جائے۔ میرے چاروں طرف ریشم کے ڈھیر ہوتے۔ سونے اور موتیوں کے گہنوں سے میرے صندوق بھرے تھے باندیوں کی کمی نہ تھی، پر ہر رات سپنے میں میں اپنے مائکے گھر جاتی جہاں کی راہوں کی دھول بھی اب مجھ تک نہ پہنچ سکتی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح ندی کنارے پیپل کے سائے میں دھڑکتے دل کے ساتھ میں اس سوار کا انتظار کرتی۔ کیا وہ کھوجتا کھوجتا مجھ تک آ نکلے گا۔

میری آنکھوں میں جلی جوت ماند پڑ گئی، اور روکھے پھیکے دن ایک کے بعد ایک یوں گزرنے لگے جیسے گھسٹ رہے ہوں، میرے گالوں کی لالی اور میرے ہاتھوں کا لوچ جیسے گزرے دنوں کی بات ہو۔ میں سنگھار کرتی تو بھی نہ کروں تو بھی اس نے مجھے جس آسن پر بٹھایا تھا اس سے اتارنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میری رگیں جسم میں یوں جمنے لگیں جیسے میں برف کے پہاڑوں میں دب گئی ہوں، جب پدمنی پیدا ہوئی ہے تو چند دنوں میرا دل اس سے بہل گیا ہے پر پھر وہی سستی اور وہی بیزاری میرے

گر دا گئی اور پدمنی بھی اس ٹھنڈ کو جو میری رگوں میں تھی گرم نہ کر سکی۔

جب پدمنی نے پاؤں چلنا شروع کیا ہے اور توتلی باتیں بھی کرنے لگی ہے تو ایک نئی سوچ نے میرے من کو گھیرا۔ کہیں اسے بھی ایسا دیوتا نہ مل جائے جو اس کی پوجا کرے۔ اس کا باپ اسے پدماوتی کہتا تھا اور جب جھک کر اسے پیار کرتا تو اس کی آنکھیں غرور سے جھک جاتیں۔ پدمنی آنگن میں ایک رنگین چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی اور اس کے پیچھے باندیوں کی قطار ہوتی۔ میں بڑے پلنگ پر جو دالان میں پڑا رہتا لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر دیکھتی مگر میرا دل بجھا سا رہتا۔ گرمیوں کی دوپہروں کو جب پدمنی اپنے بابا کے ساتھ سوئی ہوتی اور رنگین پنکھے ریشمی ڈوریوں کے ساتھ بندھے بے آواز ہمارے سروں پر ہلائے جاتے تو میں دالان سے باہر درختوں کو دیکھتی جن پر نئے پتے چمکتے ہوتے اور نئی کونپلیں پھوٹی پڑتیں۔ ہر شے پر بہار آتی ہے مجھ پر جانے کب بہار آئے گی پر مجھے خود معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ میں کس شے کے انتظار میں ہوں کون آس ہر آہٹ پر مجھے چونکا دیتی ہے۔ اس بیکاری سے اکتا کر میں نے زور شور سے گھر کو سنوارنا اور ہر کام میں حصّہ لینا شروع کیا۔ رسوئی سے لے کر باہر تک سب لوگ چونک اُٹھے۔ پدما کے بابا نے مجھے کہا بھی "بھلا تمہیں یہ سب کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کام تو ہوتے رہتے ہیں تم اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہی ہو۔

انہی دنوں دریا کے پاس گھاٹ سے ذرا ہٹ کر ایک جوگی نے اپنا ڈیرہ لگایا اور لوگ مندر کو چھوڑ کر اس کے درشنوں کے لئے الٹے پڑتے تھے۔ ایک میلہ سا رات دن گھاٹ پر لگا رہتا۔ روز باندیاں آتیں اور کہتیں "ماں جی سادھو مہاتما تو جس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے ہیں اسی کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مہاتما نے آج یوں کر دیا آج ایسا کر دیا۔ نت نئے قصے سنتے سنتے میرے جی میں بھی ترنگ اٹھی اور میں نے اپنی نند کو جو ابھی کنواری تھی اور مجھ سے بہت چھوٹی تھی ساتھ لے کر مہاتما کے درشنوں کو جانے

کا ارادہ کیا۔ جاتے جاتے چوکھٹ کے اندر ایک دم رک کر میں نے سوچا بھگوان نے مجھے سب کچھ دیا ہے دولت ہے چاہنے والا پتی ہے رونق کے لیے بچے ہیں خدمت کے لئے باندیاں ہیں۔ میری تو کوئی ایسی آس نہیں جو مجھے پریشان کرے گی۔ بھلا میں کیا لینے مہاتما کے پاس جا رہی ہوں۔ پر پیچھے سے آتی ہوئی وسنتی نے کہا "بھابی جلد چلو دیر ہو گئی ہے لوٹ کر بھی تو آنا ہے۔ بھیا کو پتہ چل گیا تو ناراض ہوں گے" اور میں بنا یہ سوچے کہ مجھے کسی شے کی آشا نہیں کوئی شے لینی نہیں چل پڑی۔

لوگ گھاٹ پر کشتیوں کے پاس اور گھاس والی زمین پر بیٹھے تھے جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور میلے کا سا سماں تھا۔ عورتیں اور بچے جوان اور بوڑھے سبھی تھے دل میں آشائیں لئے پرارتھنا کرتے آنکھیں بند کئے پربھو سے لو لگائے بھکشا مانگنے والے مجھے ان سب کو دیکھ کر ہنسی بھی آئی کیا مہاتما ان سب کے دلوں کا حال جانتے ہیں؟ کیا ان سب کو وہ دے سکیں گے جو انہیں چاہیئے ہوگا۔ بھگوان تو ہر کسی کو وہ دے نہیں پاتا جو انہیں چاہیئے۔ یہ مہاتما اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی آس پہنچائیں گے"، مجھے یونہی ہنسی آئی۔ جوگی مہاراج کے آسن کے آس پاس لوگ رام نام مالا جپ رہے تھے اور ہولے ہولے بولتے تھے۔ آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے ایک دنیا تھی، بھیڑ ہی تھی جیسے لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

عورتوں اور باندیوں کے ایک جمگھٹے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہوں نے آدمیوں کو پرے ہٹایا۔ ہم نے چادریں اپنے ماتھے تک نیچی کر رکھی تھیں اور باندیوں نے بھی منہ چھپائے ہوئے تھے۔

مہاتما نے میری طرف دیکھا تو کہا دیوی تم میرے اور پاس آجاؤ تو میں تم سے بات کروں۔ میرا دل یونہی دھک دھک کر رہا تھا اور مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی تھی۔ جب گھونگھٹ ہٹا کر نیچی نظریں کئے میں مہاتما کے سامنے بیٹھی

ہوں تو انہوں نے کہا "آنکھیں اوپر اٹھاؤ"،

میری نگاہیں جانے کیوں جھکی جاتی تھیں اور آنکھیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ لگتا تھا صدیاں بیت گئی ہیں اور ان نظروں کے سامنے میں بھسم ہو جاؤں گی پھر آپ ہی آپ میرا ڈر دور ہو گیا اور میں نے اوپر دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے انتریں ٹٹول رہے ہوں۔

پھر بہت آہستہ کہنے لگے تمہاری آنکھوں میں اتنی تنہائی ہے اور زمانوں کا دکھ ہے پر تم دکھی نہیں ہو دیوی تم صرف زندگی سے نراش ہو۔ تم نے دریا دیکھا ہے پر تباہ کرنے والے دیوتا کا چہرہ نہیں دیکھا۔ تم نے بہت آرام کر لیا ہے، تمہارے من میں جوت جلے گی۔ اور ضرور جلے گی۔ پر یہ تمہیں اور تمہارے پتی کو تمہاری بیٹی کو تم سے جدا کر دے گی۔ یہ روشنی تم سے بہت کچھ چھڑا دے گی۔ تم نے آرام کے بہت دن گزار لئے ہیں، اب تمہارے لیے جلنے کے دن آئے ہیں۔ میں بھگوان پر ارتھنا کرتا ہوں کہ آنے والی گھڑی ٹل جائے مگر ہونے والی باتیں ہو کر رہتی ہیں۔ جو نصیب میں بدا ہو وہ ضرور ہوتا ہے ڈرنا بیکار ہے۔ تم نے اب تک سکھ بھوگ لئے ہیں اب تم کشٹ اٹھاؤ گی۔ ہر آدمی جو پیدا ہوتا ہے اس کے ماتھے کا لکھا اس دنیا میں پورا ہوتا ہے جاؤ میں تمہیں اشیرواد دیتا ہوں کہ طوفان تمہارے سر پر سے جلد گزر جائے"۔ پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

دسنتی کو دیکھا تو کہنے لگے "تم کنیا ہو میں تمہیں کیا کہوں اگر سال سے پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہو گئے تو تم سکھ شانتی سے رہو گی نہیں تو ایک روگ اپنی جان کے ساتھ لے جاؤ گی۔ تم جو چاہو گی تمہیں وہ کبھی نہ مل سکے گا۔ آدمی ایسی دھرتی سے بنا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں پر جو اسے مل جاتی ہیں کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کرتا وہ کئی بیگانی چیزوں سے ٹکرا جاتا ہے جب تک ٹھوکر نہ کھائے

وہ سنبھل نہیں سکتا۔" اس نے سر جھکایا تو انہوں نے اسے اشیرواد دی اور دیر تک اس کے سر پہ ہاتھ رکھے آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھے رہے۔

راہ میں وسنتی گھڑی گھڑی میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھی "بھابی ہم بیکار میں آئے اب یہ وہم میرے جی میں جڑ پکڑ لیں گے۔ نصیب کی باتیں پوچھنا بیکار ہوتا ہے۔ بھگوان نہ کرے مجھے کوئی روگ لگے۔" وہ چپ ہو گئی تو باندیاں کہنے لگیں "دیکھو تو سہی اوپر سے مہاتما بنتا ہے اور دل میں کتنا کرودھ بھرا ہے۔ اچھا ہوا ہم نے کچھ نہ پوچھا ورنہ جانے کیا کیا بتاتا۔"

میں نے کہا "وسنتی مہاتما نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی۔ جس کا برا مانا جائے۔ یہ اُن کا کہا تو نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو انہیں کیسے پتہ چلتا کہ تم کنواری ہو۔ اور پھر ہم تو اندھیرے میں تھے۔"

پھر ہم سرکنڈوں کی راہ سے جو گاؤں کے باہر سے ہمارے گھر تک جاتا تھا تیز چلنے لگے سرکنڈوں کے ریشمی پور ہمارے سروں پہ لگتے تھے اور سرسرکرتی ہوا اکیلی اکیلی بین کرتی ہوئی بھاگی جاتی تھی۔ گاؤں کے باہر جھونپڑیوں میں دیے ٹمٹما رہے تھے اور جب ہم شمشان کے پاس سے گزر رہے ہیں تو بڑے بڑے پر پھیلا کر چمگادڑیں تیز تیز ہمارے آگے پیچھے اُڑنے لگیں اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے ہنس رہا ہے اور کٹورہ بجا کر گھنگرو پہنے ناچ رہا ہو۔ میں خاموش تھی اور سب سے آگے تھی پر وسنتی سہم سہم کر میرے کندھے سے لگتی تھی اور کہتی تھی "بھابی ہم اس راہ سے کیوں آئیں، بھلا شام کے وقت بھی کوئی اس طرف سے نکلتا ہے۔" بوڑھی باندی جو سب سے پیچھے آتی ہوئی ہانپ رہی تھی اس کی بات سن کر کہنے لگی "بی بی جو نصیب میں بدا ہے ہوتا وہی ہے۔ وہم کرنا اور ڈرنا بالکل بیکار ہے۔"

پھاگن ختم ہو رہا تھا جب ہمارے گاؤں میں اشنان کا میلہ لگا ہے۔ دھرتی جیسے

نیا رُوپ دھار کر روشنی سے نہا کر نکلی تھی۔ نرم ہوا چلتی اور نیلے آسمان پر آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ میں بہت بھلا لگتا پرندوں کے پروں میں نیا رنگ تھا اور ان کی آوازیں یوں تازہ تھیں جیسے پہلی بار انہوں نے بولنا سیکھا ہو۔ کھیت دُور دُور تک ہریالی سے لہلہاتے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیں دوہری ہو جاتیں۔ میں جب کھڑکی کھول کر باغ سے پرے دیکھتی تو مجھے لگتا اس زمین کو اور ان درختوں کو جنموں سے دیکھتی آئی ہوں اور پھر بھی پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ آموں پر بور تھا جس کی باس سے نیند سی آنے لگتی اور بڑے سہانے سپنے دکھائی دیتے۔ میں کھڑی کھڑی جانے کیا سوچا کرتی تھی۔ سفید لگلوں کی قطاریں میرے سر پر سے اُڑتی جاتیں اور آکاش کا نیلا رنگ سورج کی روشنی میں بڑا گہرا ہو جاتا۔ جیسے کسی سہاگن کا دوپٹہ ہو۔ میرا دل ہلکا تھا اور بہت سالوں سے جو خوشی میں نے نہیں دیکھی تھی وہ جانے میرے گرد تھی میری رگوں کی اینٹھن کم تھی اور مجھے مہاتما کے لفظ رہ رہ کر یاد آتے تھے۔

آئینہ سامنے رکھے میں پہروں سنگھار کرتی اور اپنی آنکھوں میں دیکھتی کہ تنہائی کہاں ہے۔ میری سکھیاں تو کہا کرتی تھیں کہ ان آنکھوں میں مانو ستارے کوٹ کر بھرے ہیں۔ ارے یہ سوئی ہوئی دھرتی کی طرح ہیں۔ مجھے کون جگائے گا؟

پوجا میں میرا من آج کی طرح کبھی بھی نہیں لگا۔ شانتی کی آشا میں نے آج کی طرح کبھی نہیں کی۔ اور میرے نصیب میں نہ شانتی ہے اور نہ مکتی۔ پر اس بھاگن میں میں مندر جاتی سیڑھیوں کو دھوتی اور دیوتا پہ پھول چڑھا کر پرارتھنا کرنا چاہتی مجھے کیا چاہیئے تھا۔ بھگوان تُو تو من کی ڈھکی چھپی آشاؤں کو جانتا ہے انتریامی مجھے کس شے کی چنتا تھی اور من ہی من میں ہنستی کہ میں بھلا کیا مانگنے آئی ہوں۔ اس آسن پر کیوں جھکی ہوں۔ ان قدموں کی دھول کیوں ماتھے پر چڑھاؤں گی مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیئے تھا اشنان میلے میں جا کر پانی میں جھلکتے اپنے بدن کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ جیسے بلّور میں

ترشا ہوا ہو۔ بھلا مٹی کا یہ رنگ کیسے اچھا لگتا تھا اور پھر بھی اس رنگ کے لیے میرے پتی دیو میری پوجا کرتے تھے۔

عورتیں مجھے ملتیں تو کہتیں بھگوان تمہاری طرح سب کا نصیب کرے۔ تم بھاگونتی ہو ہماری لڑکیوں کے سر پہ ہاتھ پھیرو۔ اور میں یہ نہ کہہ پاتی کہ میں تو مورتی ہوں میری رگوں میں گرمی نہیں میرے دل میں کسی شے کو پانے کی آشا نہیں جنتا نہیں۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں کیا ہوں پھر تم لوگ کیوں مجھ سے اشیرواد مانگو؟ گیتوں کے بول میرے دل میں گونجتے رہتے، میرا کے بھجن پڑھتے ہوئے میں سوچتی میں کیوں رادھا نہ ہوئی، آج سے زمانوں پہلے بھگوان نے مجھے کیوں نہ پیدا کیا۔ اور پھر برہا کے گیت سنتے میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آجاتے مجھے کس کا دکھ تھا میں کیوں برہن تھی؟ پدمنی کو سینے سے لگا کر یوں بھینچتی کہ وہ چیخ اٹھتی اور وسنتی کام کرتے کرتے سر اٹھا کر کہتی "بھابی آج کل تم اتنی سندر کیوں لگتی ہو مانو چمپا کی نئی کھلی کلی ہو۔ میں گھبرا کر پدمنی کو چھوڑ دیتی۔ وسنتی کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھتیں اور میں شرما کر اپنے دالان میں چھپ جاتی۔

پر وسنتی وہاں پر بھی میرا پیچھا کرتی اور کہتی "اچھا بھیا کو تو آلینے دو دیکھو تو سہی کیسا کیسا تمہیں پریشان کرتی ہوں۔ اس کے بھیا کے نام پہ یوں لگتا جیسے کسی نے زور سے میرے سر پہ کوئی چیز ماری ہو۔ میری رگوں میں خون ٹھنڈا پانی بن جاتا اور میں کہتی "وسنتی کبھی کوئی کام کی بات کیا کر بھلا تجھے کیا ملے گا مجھے پریشان کرکے اور پھر نراش سی ہو کر کھڑکی میں جب کھڑی ہوتی اور باغ میں اترتی چڑیوں کو ڈال ڈال پر پھدکتی ہوئی دیکھا کرتی اور سوچتی آدمی ایسا کیوں ہے کہ کسی شے سے بھی خوش نہیں ہو پاتا؟

وسنتی کی بُوا بھی اشنان میلے کے لئے اپنے گاؤں سے آئیں ان کے ساتھ ان کی بہوئیں تھیں اور بیٹے پوتے تھے، دو چار سال بیماری کی وجہ سے ان میں سے کوئی آ

نہ سکا تھا اور اب کے جب بُوا چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو سبھی کو لے کر مندر پر تھادا چڑھانے آئیں گھر میں عجیب گہما گہمی اور رونق ہو گئی۔ میرے بیاہ پر آئیں تو بہو کے گھر بچہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد لوٹ گئی تھیں۔ ان سب سالوں ان کے بیٹے آتے تو باہر ہی سے پلٹ جاتے رہے۔ میری ساس ہوتی تو خیر اور بات تھی۔ میری ماں بھی بھیا کو لے کر آئی تھی اور میری موسی کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ گھر میں اتنا منگل تھا اور دن رات ایسی بھیڑ رہتی کہ میرا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وسنتی کی بُوا اور میری ماں مندر سے لوٹ کر آئیں تو پہروں بیٹھی جانے کہاں کہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ میرے پتی ان دنوں گھر میں بہت ہی کم کم آپاتے۔ اتنے اپنوں کی وجہ سے انہیں میری اداسی کی کوئی ایسی چنتا نہ تھی۔ بھیا ان پانچ چھ سالوں میں بڑا ہو گیا تھا اور جب جیجا کہتا تو لگتا کسی اور کو پکار رہا ہو۔ پدمنی اس کے کندھے سے نہ اترتی۔ میری موسی کا بیٹا کہیں پڑھتا تھا اور ماں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ آگیا تھا۔ وہ بنارس سے چھٹیوں میں آیا تھا اور بہت بانکا تھا مجھے کہتا دیدی تُو تو بڑے گھر کی رانی بن گئی ہے کبھی ہم سے کاہے بولے گی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی، باقی لوگ بہت کم اندر آتے۔ باہر میلہ تھا اور اتنی رونق تھی کہ اندر آنے کی فرصت کسے تھی۔

ایک دن بُوا کے سب سے چھوٹے پوتے کی طبیعت بگڑ گئی تو بہو اداس ہو گئی اور بچہ پکار پکار کر بابا بابا کہتا رہا تو بُوا نے کہا جیجا اگر تجھے برا نہ لگے تو منے کے بابا کو گھر میں بلا لوں بچہ کب سے پکار رہا ہے اور نہیں بہلتا،،

میں نے کہا بھلا اس میں کوئی پوچھنے کی بات ہے بُوا ہم دوسرے دالان میں ہو جائیں گے ہمارے لیے کوئی بیگانہ تو نہیں بس اتنے دنوں نہ ملنے کی وجہ سے ذرا جھجک سی ہے۔ پھر وسنتی اور میں دوسرے دالان میں چلے گئے اور یوں میں نے بانکے بہاری کو دیکھا۔

اس کے کانوں میں بالے ہلکورے لے رہے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے تیز تیز قدموں سے آنگن کو پار کر رہا تھا، پھر مجھے لگا یہ سب لوگ یہ سارا زمانہ یہ ہر شے جھوٹ اور بیکار ہے، میں ندی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں وہ دیکھ رہا ہے پھر اس نے آہستہ سے سر پھیر کر ایک لمحہ کو میری آنکھوں میں جھانکا ہے اور جب میرا سپنا لوٹتا ہے تو وہ بچے پر جھکا پوچھ رہا تھا "کیوں ارجن منے مجھے کیوں پکارتے ہو باہر میلے میں چلوگے مٹھائی کھاؤ گے، بچہ اس کے گلے کے ساتھ لگ کر زور سے رونے لگا اور میں نے وسنتی کے کندھے کو اس زور سے دبایا ہے کہ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "بھابی تمہیں کیا ہوگیا ہے تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑا جاتا ہے، تم اچھی طرح سے تو ہو؟"

میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے جیسے زمانوں سے پیاسی ہوں اور زبان منہ میں سوکھ کر لکڑی ہوگئی تھی میں نے سر ہلا کر کہا میرا جی اچھا نہیں وسنتی مجھے پانی لادو، اور میری صورت کو تکتی وسنتی بھاگی ہوئی گئی اور پانی لے آئی، جنم جنم کے پیاسے کبھی پیاس بجھا سکے ہیں۔

بانکے بہاری بچے کو گلے سے لگائے باہر چلا گیا، شام کا نیلا دھندلکا چاروں طرف تھا، ہوا آواز سے چل رہی تھی اور سرد تھی، میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچا رات کتنی سہانی اور سندر ہوگی تاروں بھری اور سورگ کی اپسراؤں کی طرح نازک کامنی سی، پردوں میں اپنا چہرہ چھپائے اپنے پائل جھنکاتی جانے کتنے من لبھائے گی، جانے کتنے لوگ اپنی پیاس بجھائیں گے کتنے لوگ اس کی اوٹ میں اپنے ہردے کی پیڑا اور من کی دکھن ایک دوسرے سے کہیں گے؟ اور وہ ساری رات ایک نیلی دھند لیٹی میں بے سدھ سی پڑی رہی میرا جاگا ہوا من نئے پیدا ہوئے بچے کی طرح اپنی حالت پہ آپ ہی حیران تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی اور سوچ نہ سکتی تھی۔ ساری آوازیں مجھے اپنے سے دور باہر کہیں اور

گھومتی لگتی تھیں۔ دو ایک بار وسنتی نے مجھے کھانے کے لیے کہا تو میں نے اسے کہہ دیا میرا جی اچھا نہیں ہے اس نے کہا کیا بھیّا کو بلاؤں تو مجھے یوں لگا جیسے بھیّا جانے کون ہو بھلا اسے مجھ تک بلانے سے میرا جی کیسے اچھا ہو سکتا ہے۔ ارجن کی حالت بگڑ گئی۔ اس شام سردی میں باہر رہے جاتے ہوئے بانکے بہاری نے خیال نہیں کیا تھا اور اسے بخار آیا ہے تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے سے باغ میں اتر جاتی اور سیڑھیوں پر بیٹھی تالاب کے کنارے پہروں پانی میں جھانکتی رہتی۔ بے ہوش سی شہد کی مکھی کی طرح جو زیادہ خوشبو میں بس درخت کے گرد چکر لگاتی رہے اور اسے بھول جائے کہ وہ شہد لینے کے لیے آئی ہے بھونرے کی طرح جو پھول تک پہنچ کر بس کھو جائے اور اپنا منہ پیلا کئے تکتا چلا جائے۔ اور یہ میرا جسم ایک نئے سانس سے بسا ہوا اتنا بیگانہ لگتا تھا کہ گھبرا کر میں اپنے ہاتھوں کو تکتی تھی۔ ایک نام پپیہے کے بول کی طرح میرے دل میں چکر لگاتا تھا بانکے بہاری چڑیاں ڈال ڈال پھدک پھدک کر یہی نام لیتی تھیں۔ پتے ہوا سے ہلتے تھے تو یہی نام کہتے تھے ہوا جب درختوں میں سے گزرتی تو یہی آواز آتی تھی اور پھر چمپا چمپا جانے کون پکارتا تھا۔

میلہ ختم ہو گیا تھا پر ارجن بھی بہت کمزور تھا لوا کچھ دنوں اور رک کر اپنے باقی بچوں سمیت چلی گئیں صرف بانکے بہاری اور اس کی بیوی رُکے رہے۔ وسنتی کا بھیّا میری طرف دیکھ کر سوچنے لگتا تھا اسے کیا ہو گیا ہے وہ میرے پاس بیٹھا رہتا اور میں اس سے بات نہ کرتی۔ جب وہ کچھ کہتا تو یوں چونک کر اس کی طرف دیکھتی جیسے جانے وہ کون ہو اور مجھ سے اسے کیا کہنا ہو میرے پاس کیوں بیٹھا ہو۔ پھر اس نے سوچا میں بس یونہی اداس ہوں اور ماں کے جانے کے بعد گھبرا گئی ہوں۔ تب پہلی بار اپنے رسم و رواج بھول کر اس نے کہا۔

"چمپا اگر تم جانا چاہو تو تھوڑے دنوں کے لئے مائکے ہو آؤ۔ تمہارا رنگ یوں پیلا

پڑتا جارہا ہے جیسے کوئی بڑا دکھ اندر ہی اندر تمہیں کھائے جا رہا ہو۔ مجھے کیوں نہیں بتاتی ہو۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہارا دکھ دُور کرنے کی کوشش کروں گا،، اور پہلی بار میں نے جانا کہ یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے اگر وہ اپنی اچھی صورت کے ساتھ دیوتا بنتا تو۔ پر لکھے کو کون مٹا سکتا ہے ؟ مجھے اس پر بڑا ترس آیا وہ میرے لیے آپ اتنا دکھی ہو رہا ہے۔ وہ میرے لیے ایسی ساری باتیں کرنا چاہتا تھا جو ان کے خاندان میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اُن دنوں میں پدمنی کو بھی بھول گئی وسنتی کو بھی بھول گئی۔

جب بانکے بہاری نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے وہ شام بادلوں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی اور بارش سے بھیگی ہوئی تھی میں پشمینے میں لپٹی تکیے سے ٹیک لگائے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اور باقی سب لوگ ارجن کے پاس تھے۔ وسنتی بھی اپنے کمرے میں باندیوں کے ساتھ کہانی کہہ رہی تھی۔ بجلی جب چمکتی ہو گی تو بچہ ڈرتا ہو گا۔ ارجن کے رونے کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میرے پتی ابھی مندر سے لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا جیسے پوجا ابھی ختم نہیں ہوئی ہو گی۔ میں آگ کے شعلوں کو دیکھ رہی تھی جو لوہے کو بھی سرخ کئے دیتے تھے اور لوہا مانو پگھل رہا تھا۔ ان کے ساتھ بہنے والا تھا۔ دیے کی لَو بڑی مدھم تھی اور آگ کا عکس میرے چہرے پر پڑ رہا تھا مجھے اپنی آنکھیں جلتی ہوئی لگتی تھیں۔

کسی نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا بھابی کیا گھر میں امرت دھارا ہو گا۔ ارجن روئے جاتا ہے۔ جب میں نے منہ پھیر کر دیکھا ہے تو بانکے بہاری تھا۔

باہر ہوا ایک بین کرنے والی آواز سے چل رہی تھی اور کھڑکی میں سے جو بادل مجھے دکھائی دے رہے تھے وہ آگ کے رنگ کے تھے آکاش پگھل کر ان میں ملتا ہوا لگتا تھا۔ سورج اب ڈوب رہا تھا۔ یہ پہلی گھڑی تھی کہ ہم دونوں اکیلے ملے تھے۔ میں اٹھنا چاہتی تھی اور اٹھ نہ سکتی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی۔ اس نے گھبرا

کر پھر کہا "بھابی مُنا رو رہا ہے اگر امرت دھارا ہو تو دے دو۔"

دوسروں کے سامنے ہم نے آج تک کوئی بات نہ کی تھی میرا کیسا کیسا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولے کچھ تو کہے اور آج جب ہم آمنے سامنے تھے تو سُوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا بات کر سکتی ہوں۔ جانے اس نے ندی کنارے بیٹھی اس رنگین شام والی لڑکی کو پہچانا بھی تھا کہ نہیں؟

اتنے میں ارجن بہت زور سے چیخا اور بانکے بہاری بھاگ کر میرے جواب کا انتظار کئے بنا کمرے سے باہر نکل گیا مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج جنموں کے بعد ہم اکیلے ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے اور آج اُسی گھڑی وہ میری پرواہ کئے بنا جب کہ میں اپنا دل اس کے قدموں میں ڈالنے والی تھی بھاگ کر چلا گیا تھا جیسے اور دُنیا وہ بچہ وہ بیوی اس کے لئے سب کچھ ہوں اور میں جس نے زمانوں اس کا انتظار کیا تھا اس کی کچھ نہ تھی۔ من جب انوکھی باتوں سے دکھی ہونے لگتا ہے تو اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ مورکھ من! میری آنکھیں دُکھ کے آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں روتے روتے تکیے کے سہارے گر گئی۔ میرے لئے کوئی امید نہ تھی۔ بانکے بہاری کو میرے دل کی ذرّہ برابر بھی خبر نہ تھی۔ میرا پتی اندر آیا ہے تو میں بے سُدھ پڑی تھی۔ اس نے مجھے پکارا مجھے ہلایا اور جب وہ گھبرا گیا تو اسنے وسنتی کو آوازیں دیں۔

میں ایک روگی کی طرح بستر سے لگ گئی اور دیے کی بتی کی طرح گھٹنے لگی بہوا اور بانکے بہاری دونوں میرے پاس آکر بیٹھے رہتے۔ تارا بڑے پیار سے میرے ہاتھوں کو دباتی اور مجھے کہتی بھابی تمہیں کیا ہے تم روز بروز گھلتی کیوں جا رہی ہو۔ بانکے بہاری کہتا۔ "جب ہم آئے تھے بھابی تو آپ اچھی بھلی تھیں اب اتنے تھوڑے دنوں میں آپ کی صورت بدل گئی ہے۔"

تارا اتنی سندر تھی جیسے چاند ہو۔ بالکل دیوی کی سی موہنی اس کے چہرے پر تھی

جب ہنستی تو میرا دل چاہتا اسے اپنے دل کے ساتھ لگا لوں۔ بانکے بہاری اس کی صورت کو دیکھ کر جیتا تھا۔ باہر سے آتا تو تارا تارا پکارتا ہوا۔ یوں ایسا اچھا بھی نہ تھا، مگر تارا ہیں اس کی خوشی تھی۔ جیسے چاند اور چکور ہو۔ میں لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتی اور میری آس ٹوٹ جاتی۔ کیا ہی اچھا ہو یہ دونوں چلے جائیں تو!

پھر میری بیماری لمبی ہوتی گئی اور وہ دونوں چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تارا مجھ سے مل کر جا چکی تھی اور اب کمرے میں سے سامان باہر بھجوا رہی تھی۔ بانکے بہاری جب مجھ سے وداع ہونے آیا ہے تو میں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں سوج گئی تھیں، ہچکیوں سے میرا جسم ہل رہا تھا۔ جب اس کے بلانے پر بھی میں نہ بولی تو اس نے مجھے ہلا کر کہا۔

”بھابی، بھابی۔ آخر آپ کو کیا ہے۔ کیا آپ کا جی بہت ماندہ ہے۔ میرا جسم اس کے ہاتھ کے نیچے پگھل کر پانی بن گیا۔ جیسے وہ سورج تھا اور میں ایک قطرہ۔ جیسے وہ آگ ہو اور میں چنگاری۔

دُکھ میں آنند ملا تھا میں نے دیوار کی طرف منہ کئے کئے اپنے کندھے پر پڑے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو کانپ رہا تھا اور رگوں کی ساری آگ زندگی کی ساری تمنا میری انگلیوں میں سما گئی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے جلتے ہوئے ہاتھ کے نیچے ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا اور یوں زمانے بیت گئے۔

بیساکھ آ گیا تھا جب میں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئی تھی۔ فصلیں کٹ گئی تھیں اور دور دور تک سنہرے ڈھیر کھیتوں میں تھے۔ ہوائیں دیوانوں کی طرح درختوں میں ناچتی ہوئی چلتیں اور مندر میں چڑھاوے چڑھانے والوں کی بھیڑ رہتی۔ ڈھول بجتے رہتے اور لوگ مست ہو کر دیوی ماں کی استتی گاتے۔ میں ان ساری آوازوں کو سنتی جو اپنی گہری گونج کے باوجود صرف میرے کانوں سے ٹکرا سکیتں تھیں۔ اندر میرا من

یوں تھا جیسا جاگ کر پورے ہوش میں نہ آیا ہو۔ وسنتی کہتی "بھابی یہ تمہاری صورت ایسے کیوں ہے جیسے آدمی سپنا دیکھ رہا ہو۔ تم کون سپنے دیکھتی ہو جبکہ میرا بھیا بھی تمہارے پاس ہے، مجھے یوں لگتا ہے مانو تم ایک پری ہو جو ہمارے گھر جانے کیسے آگئی ہو اور جب تمہیں وقت ملا تم پنکھ پھیلا کر اڑ جاؤ گی" پھر ہم دونوں مل کر ہنسنے لگتے اور پدمنی بھی کھیلتی ہوئی کہیں سے آکر ہمارے ساتھ مل کر یونہی ہنستی۔ خوشی روشنی ہے جو ایک سے دوسرے چہرے پر پھیلتی ہے جیسے دیئے روشن ہو جائیں۔

وقت ایک ایسے جنگل کی طرح میرے سامنے پھیلا تھا جس میں سے نکلنے کا راستہ میری آنکھیں ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں اور پا نہ سکی ہوں۔ بانکے بہاری میرے دل کا حال جانتا تھا پر اس سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے میری کوئی پرواہ نہ ہو میں صرف اس کی بھابی ہوں اس کے بھائی "چندر شیکھر" کی بیوی۔

دن لمبے ہوتے جاتے تھے اور ہوا کے ساتھ سفید روئی کے گالوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کے قافلے میرے سر کے اوپر سے گزرتے رہتے۔ ایسی دوپہریں جب نیند آنے لگتی ہے، رہٹ کی آواز میں ساری دنیا کے ساز تھے اور میرا دل چاہتا پر لگا کر اڑ جاؤں۔

مہاتما نے کہا تھا تمہارے من میں جوت جلے گی، مگر یہ جوت کیسی تھی کہ اس کی روشنی نہ اندر تھی نہ باہر جو کسی تک بھی پہنچ نہ پاتی تھی۔ آموں کے بور کی خوشبو مدھم پڑتی جاتی تھی اور باغ میں کوئلیں شور مچاتی رہتیں۔ سویرے میرے سپنے انہی کے بولنے سے ٹوٹتے۔ میں اپنے سینے کو پکڑ کر بیٹھ جاتی دل باہر نکلنے لگتا۔ کوئل جانے اتنے دکھ سے کیوں روتی ہے؟

"چندر شیکھر" اگر کبھی بانکے بہاری کا نام لیتا تو میرا دل یونہی دھڑکنے لگتا۔ سارا جہاں بس اسی دھڑکن کی تال پر مجھے ناچتا اور کانپتا لگتا تھا اور پھر سب سے زیادہ

ڈر مجھے اس بات کا تھا اگر "چندر،، کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا اس کی دیوانی چاہت کا کیا بنے گا، وہ کیا کہے گا۔ شاستری نے مجھے اس کی پتنی بنایا تھا اور میں ایک پتی ورتا عورت نہ تھی، میں شروع سے ایسی نہ تھی۔ پھر ایسے ہی ان گنت دکھ میری جان کو روگ بن کر آن لگتے۔ دریا کے گھاٹ پر مندر کی سیڑھیوں پر بولتے اور چلتے لوگوں سے ملتے برادری کی عورتوں میں مل کر بیٹھتے اشنان اور پوجا کے سمے میں ایک ایسے چور کی طرح تھی جس کو کسی گھڑی بھی اپنے راز کے کھل جانے کی فکر ہو۔ دیوی کے سامنے میں جانے سے ڈرتی دیوی ماں تو دلوں کا حال جانتی ہے اور دیوی ماں یہ بھی جانتی ہے کہ میں نے بانکے بہاری کے لیے اپنا آپ تج دیا ہے۔ میں پھر بانکے بہاری کو کب دیکھوں گی؟

وسنتی باتیں کرتے ہوئے کہتی تارا بھابی کتنی سندر ہے مانو چاندنی ہو۔ جب ایسے چہروں کو دیکھو تو دنیا بڑی پیاری لگنے لگتی ہے جی چاہتا ہے بس جئے چلے جائیں اور پھر بھیّا بہاری ہے کتنا اونچا اور سندر ہے دیوتا لگتا ہے۔ میرے بھیا سے بھی نکلتا قد ہے۔ بوا کے سارے بیٹوں میں سے وہی سب سے بانکا ہے۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی اور ماں زندہ تھی تو ہمارے بابا کے پاس رہا کرتا تھا۔ پھر ماں اور بابا دونوں چلے گئے اور بوا اب بوڑھی ہو گئی ہیں کم کم ہی آتی ہیں، اُن دنوں ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اب تو مجھے بہاری بھیا کے سامنے آتے لاج آتی ہے ان دنوں وہ مجھے اٹھا کر گھوما کرتے تھے اور میں ان کو کتنا تنگ کرتی تھی بھابی تب یہ مندر اور گھاٹ اور یہ گاؤں بہت آباد تھا۔

مجھے ہراُس شے سے جو بانکے بہاری چھو چکا تھا لگاؤ تھا پھر وسنتی سے کیوں نہ ہوتا۔ وسنتی یونہی بڑی پیاری لڑکی تھی پھر اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں ہی تو تھے۔

پوربی ہوا چلتی تو میری کھڑکی کے کھُلے پٹ یوں بجتے جیسے دو بچھڑی روحیں آپس

میں گلے مل رہی ہوں ۔ میں بازو کھول دیتی اور میرا جی چاہتا ہوا کہ یہ ساری شوخی اور تیزی اپنے میں بھر لوں ۔ اور ان ساری خواہشوں اور خیالوں کے اوپر میرے کان ان قدموں کی چاپ سننے کے لیے بے قرار رہتے جن میں میرا دل تھا ۔ ساری دنیا وہی تھی کہ ایک دل کے بدلنے سے سب کچھ اور ہو گیا تھا ۔ پھر گرمیاں آئیں اور سنسناتی ہوئی دوپہروں کے ساتھ گزر گئیں ۔ برساتیں ہوئیں اور برہا کی ماری کا دل ٹوٹ ٹوٹ گیا ۔ برکھا اور بادلوں کے گھنیرے میں رنگوں اور درختوں کی ہریالی میں میں نرک کی اس آگ میں جلتی رہی جس سے مجھے کبھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا ۔

جب وسنتی کی منگنی ہوئی ہے تو اور لوگوں کے ساتھ بانکے بہاری بھی آیا ۔

گھر عورتوں سے بھرا تھا اور بہت بھیڑ تھی ۔ گاتی ہوئی عورتیں شنگار خوشبوئیں اور پھر سکڑی سمٹی دالان کے ایک کونے میں گاؤں کی لڑکیوں اور برادری کی ماسیوں اور چاچیوں سے گھری وسنتی بیٹھی تھی ۔ "چندر شیکھر" نے اس سے پہلے اس بات کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جب کیا ہے تو مجھے ہوش کہاں ہوگا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ وسنتی سے پوچھ لیا جائے بھلا کسی نے کبھی لڑکیوں سے بھی پوچھا ہے کہ تمہاری مرضی کیا ہوتی ہے ۔

رسم ختم ہوئی ہے تو بھیڑ ہوتے ہوتے چھٹ گئی ۔ میری حالت یہ تھی کہ منزل سامنے تھی اور میں وہاں تک پہنچ نہ سکتی تھی اور میں بہت اداس تھی ۔ پرانی بیماری پھر سے مجھے آتی جان پڑی ۔ میں سارا سارا دن دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور اس ہاتھ کی منتظر رہتی جو میرے کندھے پر پڑے گا اور میرے ہاتھ کی گرمی کے نیچے ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ میری رگوں کی وہ اینٹھن پانی بن کر بہے گی اور میرا سارا وجود اس کے قدموں میں ہوگا جسے شاید ان سب کی ضرورت بھی نہ تھی ۔

بہاری اور میری دوسری ملاقات بالکل اچانک ہوئی ۔ وسنتی پوجا کے لئے مندر گئی ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے میں رنگوں کی پٹاری میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی شاید وسنتی

تے کچھ کہا ہو گا کہ وہ باہر کھنکارا اور پھر دالان کو پار کر کے دروازے کے بیچ میں کھڑا تھا، میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں کے وہیں رک گئے اور ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئے۔

اس نے دوبارہ کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور کہنے لگا "بھابی میں وداع لینے آیا ہوں۔ آج اپنے گاؤں جاؤں گا تارا کو کیا کہوں وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

میرے کانوں میں اس کی آواز میٹھے مدھر راگ کی طرح پڑ رہی تھی جو مجھے سلا ہی تو دے گا۔ اس نے پھر کہا میں نے سوچا بھیّا سے وداع لینے سے پہلے تم سے وداع ہو لوں تم بیمار تھیں جب ماں گئی ہیں تمہارا ابھی بہت پوچھ رہی تھیں جس دن سے میں آیا ہوں اس بھیڑ بھڑکے میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس سے کہتی بیٹھ تو جاؤ۔ وہ وہیں دہلیز پر کھڑا تھا اور باقی ساری دنیا کے اور میرے درمیان تھا۔ اور پھر بھی مجھ سے بہت دُور تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ صرف ایک اندھا بے نام زور تھا جو یہ کہہ رہا تھا اگر اب کے بھی بہاری سے کچھ کہہ نہ سکیں وہ کچھ سُن نہ سکا تو ساری عمر روتی رہو گی ہر روز وسنتی کی منگنی تو نہیں ہو گی۔ روز تو پھول نہیں کھلیں گے۔ یہ رُت سدا تو نہیں رہے گی۔

ہولے ہولے میں نے اپنی پوری طاقتیں لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں، اس کی طرف دیکھا وہ ایک جادو کئے ہوئے انسان کی طرح وہیں دہلیز میں کھڑا تھا اور میری طرف دیکھتا جاتا تھا۔ میری ان نگاہوں نے مجھے کتنا ننگا کر دیا تھا اور پھر ان آنکھوں کی حیرت وہ بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں جیسے تصویر میں بھگوان کرشن کی ہوتی ہیں۔

پھر وہ مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کہہ سکتی لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر کے باہر چلا گیا۔

میں نے منہ کو ہاتھوں میں چھپالیا اور رنگوں کی پٹاری پر گر کر زور زور سے سسکنے لگی، بھگوان یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ کیا چاہت کا یہی مطلب ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے قدموں میں گرا دے عورت کی شان اس کا مان پوتر تا۔ ہائے مجھے لاج نہ آئی جانے بہاری کیا کہتا ہوگا۔ اب تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ ورنہ وہ یوں بھاگ کیوں جاتا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت تھی، بھگوان اب میں کیا کر سکتی ہوں، میں یوں تڑپ رہی تھی جیسے مجھے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

بھاگتی ہوئی وسنتی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اس کے پیچھے باندیوں کی قطار تھی۔ سارے پریشان چہروں کے درمیان میرا من میرے ہاتھ سے چھوٹتا جاتا تھا۔ شرم اور بے عزتی کے خیال سے میرا جسم پانی ہوا جاتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا میں پیدا ہی نہ ہوتی بھگوان یہ کیسی جوت تھی جو میرے من کو کبھی روشن نہ کر سکے گی۔ بھگوان کیا تو دیا نہیں کر سکتا۔

پدمنی رو رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اپنے ایسے جنم میں تھوک دوں اس گھڑی پر ہزار پھٹکار جب میں پیدا ہوئی ہوں خاندان کا نام لاج اور شرم۔ ادھر میں کیا سے کیا ہو گئی تھی، ایسی عورت کے لیے تو موت سے زیادہ کوئی بہتر شے نہیں۔

سارا دن گزر گیا شام آگئی "شیکھر" میرا دل بہلاتا رہا وید جی نے طاقت کی کئی دوائیں دیں۔

۵

رات قریب آئی تو مجھ میں نئی طاقت آگئی۔ پدمنی کہانی سن کر سو گئی، میں نے "شیکھر" سے کہا میرا جی چاہتا ہے مندر جاؤں۔ وہ حیران ہو کر بولا "ویسے تمہارا جب جی چاہے تم ضرور جاؤ۔ مگر رات اندھیری ہے تمہیں ڈر نہیں لگے گا کہو تو میں ساتھ چلوں"

اور میں نے بڑے رسان سے اس سے کہا "تم بھی بس ایسے ہی ہو مندر کون سا ایسی دُوری پر ہے اور پھر جہاں دیوی ماں ہو وہاں ڈرنے کی کیا بات ہوگی تم سارا دن کے تھکے ہوئے آرام سے سو جاؤ۔ میں کسی کو بھی نہیں لے جانا چاہتی میں آج تن اور من لگا کر پرارتھنا کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ جو روز روز مجھے بیماریاں آگھیرتی ہیں ان سے چھٹکارا ملے۔ تم پریشان ہوتے ہو تو میں اور بھی پریشان ہوتی ہوں" اور پھر میں نے جھک کر اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

بہت دنوں کے بعد میں نے اتنا دل لگا کر اور پیار سے اس سے بات کی تھی اس لیے وہ بہت خوش تھا پھر میں نے پدمنی کو پیار کیا اور جاتے ہوئے "شیکھر" کے پاؤں اپنی آنکھوں سے لگائے وہ اُٹھ بیٹھا اور بولا چمپا آج تمہیں کیا ہو گیا ہے لگتا ہے تم بہت نراش ہو مجھے تو بتاؤ کیا بات ہے، تم یوں کیوں کر رہی ہو جانو آخری بار ہو۔ نصیب میں جو بدا ہے وہی ہوگا۔ پر جب تک میں زندہ ہوں تم مر نہیں سکتیں تمہیں کیا ہے۔ ضرور جاؤ اور دیوی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر جی بھر کر پرارتھنا کرو، بھگوان جانتا ہے میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، میری زندگی کی سب سے بڑی آس یہی ہے، تم تو میرے ہردے کی روشنی ہو، تم میری پدمنی کی ماں ہو تم میری ساری دنیا ہو"

اس رات میں نے پور پور سنگھار کیا تھا، اپنا سب سے بڑھیا جوڑا نکال کر پہنا تھا زیوروں سے لدی آخری بار جب دیئے کی لو میں میں نے آئینہ دیکھا ہے تو میں خود حیران تھی۔ میں تو مرنے جا رہی تھی۔ شرم کے بوجھ تلے دبی میں تو آخری گھڑی دیوی کے قدموں میں جان دینا چاہتی تھی، اور یہ سنگار کیسا تھا جیسے میں بہاری کو ملنے جا رہی ہوں، بہاری کا نام سویرے کے بعد اب میرے من میں آیا تھا جیسے کوئی رات کا مسافر سب سے آخر میں آئے اور دوار کھٹکھٹا کر تھکا ہارا اندر آتے ہی سو جائے، پھر اس نام کے تال اور سُر پہ جیسے میرے قدم ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھال میں دیئے جلائے

اور پھول رکھے میں اکیلی مندر کی طرف چلی، پلو میں بندھی زہر کی پڑیا کو رہ رہ کر میں ٹٹول رہی تھی۔

میرا دل کہتا تھا تم ایسی دلہن بنی ہو جو پہلی بار اپنے پریتم سے ملنے جا رہی ہو۔ تم رادھا ہو جو اندھیرے میں اپنے کرشن سے ملو گی، تم رکمنی ہو جیسے چرلنے وہ آپ آئے گا اور مرنے والے کی طرح نہیں زندگی میں پہلی بار داخل ہونے والوں کی طرح میرے قدم ہلکے اٹھ رہے تھے۔ ساری دنیا مجھے اپنے گرد ناچتی لگتی تھی۔ ہوا میں ایسی سنسناہٹ تھی جو خوشی کا گیت سا ہو ہے بھگوان کیا بہاری چلا گیا تھا۔ بہاری۔ بہاری۔ بے وقت کوئل جانے کیوں بول رہی تھی!

مندر میں دیا مُند مُند جل رہا تھا۔ میں نے تھال رکھ دیا اور پھول دیوی کے چرنوں پر چڑھا دیئے۔ اتنے دیئے جلنے سے روشنی زیادہ ہو گئی تھی، دیوی ماں مجھ سے اونچی تھی اور اندھیرے سے ملی روشنی میں مجھے اس سے ڈر بھی لگتا تھا پر ڈر کس بات کا تھا۔ یہ میری زندگی کی آخری رات تھی۔ میں ان چرنوں میں جھکی دیوی ماں سے زندگی کی نہیں موت کی بھکشا مانگ رہی تھی۔ دیوی اگر پریم کرنا اگر کسی کی آشا کرنا اتنا ہی بُرا ہے تو میں جینا نہیں چاہتی ہر دن میرے لئے مصیبت تھا اور ہر گھڑی میرے لیے عذاب۔ ایسے انسان کی طرح جس کی جان بس ہونٹوں پر اٹکی ہو۔ دیوی ماں لوگ تجھ سے جینے کی بھکشا مانگتے ہیں میں تجھ سے موت کی دکشا لینے آئی ہوں۔

دیوی ماں مجھے طاقت دے۔ دیوی ماں مجھے شکتی دے، شکتی دے۔

اس گھڑی مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ مجھے کندھے پر اٹھانے والے بابا یاد نہ آئے۔ پلو پکڑ کر پیچھے بھاگنے اور چھپا کہنے والا بھیا یاد نہ آیا۔ سکھیاں اور سہیلیاں نہیں، پدمنی اور "شیکھر"، کوئی بھی تو میرے ذہن میں نہ تھا۔ بس ایک خیال تھا کہ آج میری آنکھوں میں میرے تن کی بھوک کو بہاری نے جان کر بھی مجھے دھتکار دیا ہے اور سوائے مرنے کے

میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ موت میرے سارے دکھوں کا انت تھی، میرے سارے کشٹ دُور ہو رہے تھے۔ تو بھا تما نے یہی کہا تھا کہ میرا پتی اور میری پدمنی مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ پتہ نہیں اب میں کہاں اور کس صورت میں جنم لوں۔ مجھے مکتی کبھی نہیں ملے گی —— دیوی ماں مجھے شکتی دے، میں جینا نہیں چاہتی مجھے موت دے۔

پھر میں نے اٹھ کر دیئے بجھا دیئے، باہر چاند کی روشنی تھی جو بڑے دروازے کی دہلیز پار کر کے اندر آنا چاہتی تھی، پر ایسی رات جب موت اندر ہو اور یم کے دُوت دوار میں کھڑے ہوں۔ چاندنی بھی اچھوت کی طرح باہر بھٹکتی رہی۔

دیوی ماں کے چرن چھو کر میں نے پلو کے اس کونے کو ہاتھ میں پکڑا جس میں زہر تھا، پھر میں نے ایسی آواز میں جو مندر میں گونج گئی۔ کہا" دیوی ماں تو گواہ ہے میں لاج شرم اور پوترتا کے لئے مر رہی ہوں، تا کہ میرے من کو ایسی بیماریاں نہ لگیں جو پتی ورتا استری کی سہار سے باہر ہوں۔ بھگوان تو میرے اس بلیدان کو سویکار کرے۔ میری انگلیاں ہولے ہولے گرہیں کھول رہی تھیں اور میں دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی تھی، دیوی کے قدموں کے پاس صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ پڑیا کو کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ گئے۔ میں نے سوچا باہر کتنی نرم چاندنی ہے اور ہوا ہے اور ساری دنیا جو مجھے پیاری تھی وہ نظارے جو مجھے سہانے لگتے تھے وہ سب اس ایک پڑیا کے بدلے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ پھر بُوا کو پتہ چلے گا اور پھر بہاری اور تارا آئیں گے اور کہیں گے چھپا بھابی نہیں رہی اور شاید بہاری کو دکھ ہو۔ شاید بہاری میرے لئے ایک آدھ آنسو بہائے۔ زندگی بڑی پیاری چیز ہے۔ میری انگلیاں پڑیا پر بہت بے جان سی تھیں اور کاغذ کھولے نہیں کھل رہا تھا، جب میں نے پڑیا کھول لی ہے اور منہ اونچا کر کے اُسے اپنے حلق میں گرانے لگی ہوں تو کسی نے ہاتھ مار کر زہر گرا دیا اور پھر دیا بھی بجھ گیا۔

میں سسک رہی تھی اور میرے من میں دیوالی ہو رہی تھی۔ اس چوڑے سینے میں سمانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے ہونٹ میری باہیں اور یہاں تک کہ میرا دل بھی پگھل کر اس گرم دھارے میں مل گیا جو زندگی تھا۔ دیوی ماں نے مجھے دکشنایوں دی تھی کہ مجھے میرا اپنا آپ بھی لوٹا دیا اور وہ بھی جس کی مجھے آشا تھی شرم لاج اور گھونگھٹ جانے کہاں تھے۔

ایک مدھر سپنے میں دیکھی صورت کی طرح کوئی کہہ رہا تھا۔ سولہ شنگار کئے تم موت سے ملنے کہاں جا سکتی تھی۔ موت میں کب اتنا بل ہے کہ سندرتا کو جیت سکے۔ یہ سپنوں کی سی رات ہے اس رات میں بھگوان ملتا ہے۔ بھگوان جو آپ پریم ہے جو آپ سندرتا ہے۔

میں کب تک تمہارا انتظار کرتا۔ چمپا میں کب تک تمہاری راہ دیکھتا۔

جب میں گھر لوٹی ہوں تو آکاش پر اندھیرا اجالے میں ملنا چاہتا تھا۔ سوئے ہوئے کھیت شانتی ہی شانتی صبح کا تارا شانتی تھا۔ اور میرا مسلا ہوا شنگار میری مسکی ہوئی چولی میرے گھنیرے اور کھلے بال میری چوری کی نشانی تھے۔ ہر طرف شانتی تھی تو دھنیہ ہے دیوی ماں۔ تیرا سندر پریم کا مندر ہے۔

ارے اب الٹا بوڑھی رگوں میں کیا رہا ہے۔ اب دیوی سے کچھ بھی مانگوں تو کبھی نہیں ملے گا میں نے تو سب کچھ مانگ لیا تھا اس ایک رات میں اس نے مجھ پر ہر شے کی بارش کر دی تھی اس برکھا میں نہا کر میرے بدن سے سارا میل میرے من سے ساری دکھن اور میرے انگوں کی ساری پیڑا دھل گئی تھی۔ میں پریم رنگ میں رنگی ہوئی اتنی پوتر تھی جیسے ابھی پیدا ہوئی ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂

۶

وہ جیون جو اس رات کے بعد سے مجھے ملا ہے اس پر سوائے بہاری کے کسی کا ادھیکار نہ تھا وہ جیون اس نے بچایا تھا۔ دیوی ماں کے سامنے موت کے ہاتھوں سے یہ جیون اس نے چھینا تھا۔ یہ اس کی شکتی تھی جس سے یم کے دوت بھی شکست کھا کر لوٹ گئے تھے اور بھگوان جانتا ہے اس رات کے بعد سے میں نے سوائے بہاری کے کسی کو اپنا نہیں سمجھا اگر دیوی چاہتی تو مجھے تنسیکھر کو لوٹا سکتی تھی۔ اگر دیوی کی آشا ہوتی تو پر جو اندھیرے میں ہے اُسے سوائے بھگوان کے کون جانتا ہے۔ میں اور تم اور مہاتما سب اندھیرے میں ہیں زندگی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرے کا سفر ہے۔

جب میں نے آئینہ دیکھا ہے تو دیکھتی رہ گئی، اور پھر میں نے گھبرا کر آئینہ پرے پھینک دیا، کپڑے بدل کر پدمنی کے پاس آئی ہوں تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے اپنی باہیں اوپر اٹھا دیں اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "تنسیکھر" سویرے کی پوجا کے لیے مندر جا چکا تھا، میری آنکھوں میں سپنوں اور پریم کے رنگ ملے تھے۔ وسنتی نے دیکھا تو کہنے لگی "بھابی تم تو رات ہی رات میں بدل گئی ہو مانو تمہیں نیا جیون مل گیا ہو۔ کل تک تم اتنی پیلی تھیں کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا اور آج تو تم نئے کھلے پھول کی طرح ہو۔ پھر اس نے جھک کر میرے کندھے سے اپنی ناک لگا دی اور کہنے لگی "ارے یہ نئی باس تم میں کہاں سے آئی ہے تم تو مہک رہی ہو۔" میں نے اسے کہا "ہٹ تجھے تو ہر گھڑی مذاق سوجھتا ہے بھلا نئی مہک مجھ میں کہاں سے آئی۔ نہا کر آئی ہوں اس لئے۔

وسنتی نے سر ہلا کر کہا نہیں بھگوان کی سوگند اٹھوا لو۔ تم تو یوں نکھری ہو مانو ساگر

میں سے نہاکر نکلتی اندر کے دربار کی اپسرا ہو۔ ارے بھابی تمہاری آنکھوں میں یہ گلابی ڈورے کیسے ہیں۔ پھر وہ خوشی سے تالیاں بجا کر میرے گرد ناچتی رہی اور میں شرم سے لال ہو گئی۔

دوپہر کو شیکھر آیا تو کہنے لگا۔ چمپا تم تو اتنی سندر جان پڑتی ہو مانو دیوی ہو یہ ایک رات میں تم کتنا بدل گئی ہو۔ تمہاری ساری بیماری کیسے دور ہو گئی ہے؟ میں کہتا ہوں تم روز رات مندر میں پوجا کرنے جایا کرو تو دیوی ماں تم پر بہت ہی کرپا کریں۔ میں کتنا خوش ہوں کتنا خوش" اور اس نے چاہا کہ میرا ہاتھ پکڑ لے مگر میں پہلو بچا کر ایک طرف ہو گئی اور پدمنی کو بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگی۔

پدمنی بھی میری اس اچانک تبدیلی سے بہت حیران ہو گئی۔ ایک وہ دن تھے کہ میں پہروں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور کسی سے بولتی نہ تھی اب میرا دل ایک دم دنیا کے اتنے پیار سے بھر گیا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے پریم دل کو بھی خیالوں کو بھی گہرائی دیتا ہے۔ میں آج تک کے اپنے اتھلے پن سے شرمندہ ہو رہی تھی مجھے شیکھر کے پریم اور اس پیڑا کا جو اس کے پردے میں ہوتی ہو گی پہلی بار احساس ہوا بھوکے پیٹ آدمی کو صرف روٹی کے سپنے آتے ہیں اور جب پریم انتر میں روشنی کر دیتا ہے تو باہر بھی ہر شے رنگ اور نور میں ڈوب جاتی ہے۔

میں گھر میں ایک تتلی کی طرح گھومتی پھرتی اپنے نئے پن میں آپ ہی مگن و سنتی کے گلے لگتی پدمنی کو چومتی "شیکھر" کو میں اتنے احسان کی نگاہوں سے دیکھتی اور باندیوں سے پہلے سے زیادہ رسان سے ملتی۔

ہر رات میرے لیے دیوالی کی رات ہوتی تھی ہر رات مندر میں میرے لیے دن ہوتا تھا۔ اجالے میں میں دیکھتی کہ بانکے بہاری مندر کے ساتھ والے ایک کمرے میں بیٹھا پوجا پاٹ کرتا، شاستروں کو پڑھتا "شیکھر" گھر آتا تو کہتا "چمپا بہاری کیلئے

کھانا اچھی طرح سمجھا کر وہ بیچارا دن رات اتنی محنت کرتا ہے کہتا ہے کہ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

وسنتی کہتی۔ بہاری بھیا کبھی گھر میں کیوں نہیں آتے جاتے کیوں اتنے بیگانے ہو گئے ہیں باہر پڑے رہتے ہیں۔ بوا آئیں گی تو شکایت کر دوں گی کہ انہیں جانے کیا سکھا کر بھیجا ہے کہ ہم سے ملنے نہیں آتے۔ کیوں بھیا تمہیں یاد ہے کیسے بھیا مجھے گود دوں میں اٹھا کر گھوما کرتے تھے؟

شیکھر کہتا۔ میں تو کئی بار بہاری کو کہتا ہوں پگلے گھر چل آخر ایسا جتن اور اتنی تپسیا کرنے کا کیا فائدہ۔ ہر کام کے لیے وقت ہوتا ہے۔ تیرا ابھی مہاتما بننے کا وقت نہیں آیا۔

پھر اور باتیں ہونے لگتیں۔

میں بڑی بے تابی سے رات کا انتظار کرتی۔ پہلے پہل تو شیکھر بہت خوش تھا کہ چلو کسی بہانے ہی سہی۔ دیوی ماں کی سنگت میں ہی سہی چمپا کا دل تو بہلا چہرے پر کی وہ زردی اور بے رونقی تو دور ہوئی۔ ہر ایک سے اچھی طرح سے بولتی ہے۔ گھر کے کاموں میں حصّہ لیتی ہے گاؤں والوں سے ملتی ہے اس نئی چمپا کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ وسنتی سے کہتا " دیکھا دیوی ماں نے تیری بھابی کو کتنا بدل دیا ہے یہ سارا پوجا کا پھل ہے،، اور پھر دیوی ماں کی استتی گانے لگتا۔

بہاری کہتا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو پر رات میں میری ہو۔ میں رات کو مندر میں دیے جلاتی سیڑھیاں دھو کر دیوی ماں پہ نئے پھول چڑھاتی اور پھر پوجا کرنے کے لیے بہاری کے قدموں میں جھکتی کہ بہاری میرا دیوتا تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اسے دیکھ کر جیتی تھی۔ پر کبھی کبھار ایک خیال سوئے ہوئے ناگ

کی طرح میرے دل میں سر اٹھاتا، ہو سکتا ہے بہاری کی چاہت وقتی ہو اور میں جو اپنا آپ تج کر اسکے قدموں میں آن پڑی ہوں میں جس پر ترس کھا کر اس نے گرے پھول کی طرح مجھے دھول میں سے اٹھایا ہے کیا پتہ وہ کبھی مجھ سے اُوب کر واپس تارا کے پاس چلا جائے۔ ان خیالوں کا ڈنک میری خوشی میں مانو زہر بن کر پھیلتا۔ پر یہ سارے خیال یہ ساری اداسیاں ایک لمحے کی ہوتیں۔ دوسرے لمحے دریا کی بڑی لہر کی طرح اس مدہوشی کا طوفان مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔

وہی راتیں ہیں جو میرے پاس باقی ہیں انہی راتوں کا تیل ہے کہ میری زندگی کا دیا جلانے کو صدیوں کافی ہوگا۔ بہاری کے بعد اگر میرے پاس سہارے کے لیے ان بیتی راتوں کی یاد بھی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جانے کیا ہوتا۔

اندھیرے میں تیز باس والے گلاب کھلتے ہمارے چاروں طرف جھنکار ہوتی اور مجھے لگتا ہم پر پھول برستے ہیں۔ لوگ کہتے تھے ہم نے مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے لوگوں کو جانے پوترتا کس شے میں دکھائی دیتی ہے پریم سارے دھرموں سے اتم اور ساری شرموں سے اونچا ہے اس کی پدوی تو آکاش میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر دیوی ماں کو یہ سب بُرا لگتا تو ہم کو آپ مندر سے نکال سکتی تھی زمانے نے کبھی کسی کا ساتھ دیا ہے۔

بہاری کے بازو مجھے ستاروں کا ہنڈولا لگتے تھے اور پھر میں تو ندی کا دھارا تھا جو اس کے قدموں میں بہتا تھا اس کی انگلیاں میری ساری سختیاں ساری کٹھورتا پگھلا دیتیں اور میں یوں بہنے لگتی مانو سورگ میں سے آئی جل دھارا ہوں۔

میں کہتی بہاری ایک دیا ہو تو اچھا نہ رہے اور بہاری کہتا تھا تمہاری آنکھوں کی جوت سے تو سارا جگ روشن ہے تم جو آپ روشنی ہو تمہیں دیووں کی کیا ضرورت ہے۔

میں کہتی بہاری اندھیرا دشمن ہے اس سے ہوشیار کیوں نہیں رہتے اندھیرا سیاہ سانپ ہے کہ چپکے سے ڈس لیتا ہے۔

اور بہاری میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کہتا۔ پر اندھیرا کہاں ہے یہ اتنی بڑی جوت سے بھری آنکھیں یہ تمہارے بدن سے پھوٹتی کرنیں کیا ان سب کے ہوتے تمہیں اندھیرے سے ڈرنے کی ضرورت ہے کبھی ہم دیوی ماں سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھے رہتے ایک دوسرے میں مگن ایک دوسرے سے لگے ہوئے جیسے ہم میں کوئی دوسرا نہ ہو ہم ایک ہی ہوں اور پھر اندھیکار کے دھڑکتے دل سے ڈرتی میں سوچتی یہ سپنا کسی دن ٹوٹ جائے گا۔ اتنی بہت خوشی کا بوجھ سنسار نے کبھی اٹھایا ہے؟ دھرتی اس بوجھ سے پھٹ جائے گی۔ مگر ان سارے وہموں کو میں نے جھٹک کر کبھی بہاری سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا

میں بہت دنوں شیکھر کو دھوکا دینے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

راتوں کو گھر سے میرا یوں مندر میں چلے آنا اور اندھیارے میں رہنا اس کی نظروں سے چھپا نہ رہے گا۔ اور پھر بہاری کا بنا کسی کام کے یہاں رکے رہنا۔ ہے بھگوان کیا بنے گا، مگر چار گھڑی سے زیادہ یہ سوچ مجھے پریشان نہ کرتی۔

میری بدلی ہوئی نگاہیں میری چال جیسے کوئی سپنے میں چل رہا ہو۔ بوڑھی باندیوں کی نظروں سے کب تک چھپی رہتی میں گھر میں ہوتی تو دیکھتی باندیاں وسنتی کو لئے کونوں کھدروں میں چھپی باتیں کر رہی ہوتیں میری طرف دیکھتی ہوئی میرے پاس کئی بار وسنتی یوں آتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پر پلٹ جاتی۔ مجھے معلوم تھا وہ ان باتوں کا جھوٹ سچ جاننا چاہتی ہوگی۔ جو باندیاں کہتی تھیں۔ مجھے دیکھتی کہ اپنے میں مگن گیت گنگناتی ہوئی اس کے جہیز میں دیئے جانے والے جوڑوں میں کناری ٹانک رہی ہوں اور بہت ہی مصروفیت سے کسی صندوق کو الٹ پلٹ کر رہی ہوں اناج تُلوا رہی ہوں پدمنی کے

ساتھ کھیل رہی ہوں، پھر اس کے بھائی کے کپڑوں میں بڑے پریم سے بٹن ٹانک رہی ہوں تو وہ میرے پاس کھڑی ہوئی بڑی محبت سے مجھے دیکھتی رہتی اور پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی "میری بھابی تو سچ مچ اتنی اچھی ہے اور اتنی سندر۔"

اور میں کہتی "کیوں دشمنی کیا تجھے یہ سب جھوٹ لگتا ہے مجھے تو تو اپنی بہنوں کی طرح پیاری لگتی ہے تُو تو مجھے پدمنی سے بھی زیادہ پیاری ہے جب تو چلی جائے گی تو پھر جانے میں کیا کروں گی، تیرے بنا یہ گھر کتنا سونا ہوگا۔ تیری ہنسی کی جھنکار تیری آواز کی مٹھاس کہاں سننے کو ملے گی"۔ بیاہ کی بات پر وہ شرما کر بھاگ جاتی۔

آج لگتا ہے سکھ تو ایک سپنا ہے سپنے میں دیکھے رنگ محل کبھی جاگتے میں دکھائی دیئے ہیں؟ وہ سب دنوں جب میں زندگی کے پیالے میں سے خوشی کا آخری گھونٹ تک پی جانا چاہتی تھی، اصل میں ایک سپنے کے پیچھے بھاگ رہی تھی، بہاری سپنے میں دکھائی دیا ایک جوان تھا سپنا چاہے کتنا ہی لمبا ہو سالوں پر پھیلتا چلا جائے آخر سپنا ہے اور جب سونے والے کی آنکھ کھلے گی اور وہ ہوش میں آئے گا تو سپنا ٹوٹ جائے گا۔

جس طرح اور سپنوں کے نصیب میں یہ ہے کہ وہ ٹوٹیں اسی طرح میرے نصیب میں بھی آنکھ کھول کر یہ دیکھنا بدا تھا کہ یہاں نہ بہاری ہے نہ مندر ہے۔ دیوی ماں کی مورتی بڑے دکھ سے اپنی ہنسی چھپائے ہوئے ہے اور بڑے لمبے ختم نہ ہونے والے دن ہیں جن میں کام ہے اور "نشیکھر" کی لگا ہوں کی سب بے یقینی ہے میں جب اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھتی تو میری رگوں میں خون کی جگہ برف ہوتی اور وہ جس نے کہا تھا کہ تم اندھیرے کی دلہن ہو کہیں نہ ہوتا، مندر میں دیئے جلا کر آنکھیں بند کئے سوچتی رہتی ہر آہٹ پر کان دھرے اپنے سارے جسم کو مانو کان بنائے پر کسی کونے میں سے کوئی نہ اٹھتا کہ اس زہر کو جو ہولے ہولے گھل کر میری رگوں میں پھیل رہا تھا ہاتھ

مار کر گرا دے۔

آنکھ بند کیے میری جاگتی آتما بھکاری کی طرح اپنا کرمنڈل اٹھائے ایک کونے میں کھڑی تھی کہ کبھی تو وہ ان راہوں سے گزرے گا۔

میری بھول یہ ہوئی ہے کہ میں نے اپنا وہ پھول جو مجھے اس کے قدموں پر سویکار کرنا چاہیئے تھا بچا کر رکھ چھوڑا تھا کہ اس کے ماتھے پر کے تاج میں سجاؤں گی۔ اس کے سر تک میرے ہاتھ پہنچ نہ سکے اور میرا پھول میرے ہاتھ سے گر کر دھول میں مل گیا۔ آج تک اس مٹی میں بھرے پھول کو دیکھتی ہوں اور افسوس میری نگاہوں سے آنسو بن کر بھی نہیں بہہ سکتا کہ یہ پھول کسی تاج میں نہ لگ سکا سب میری بھول ہے اور بھگوان میری بھول کی سزا مجھے کتنی بڑی ملی تھی۔ میرا وہ پیالہ جس میں کبھی امرت تھا زہر سے بھرا ہے اور ہر روز مجھے اس پیالے میں سے گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے اگر ایک ہی بار اس کو ختم کر سکتی تھی تو مگر نہیں مجھے یہ سب بھُوگنا ہے کہ میں زہر بن کر جیوں اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ بہاری کے اور میرے درمیان کتنے جنموں کا فاصلہ ہے جس سے آگے اور پیچھے ہونے کی میری مجال نہیں۔

ہر ایک آدمی کے حصّے میں کچھ خوشیاں آئی ہیں اور کچھ رنج۔ میں نے اپنے حصّے کی خوشیاں ان چند راتوں میں ختم کر دیں، پر یہ آج تک سمجھ نہیں آتا۔ ان راتوں میں یہ کیوں لگتا تھا کہ یہ خوشی میری باقی زندگی کے لیے کافی ہے۔ میں اس خوشی کی خاطر کئی نرک بھوگ سکتی ہوں۔ میں سارے سنسار سے مقابلہ کر سکتی ہوں۔ بھلا آج تک سنسار کے مقابلے پر کوئی ڈٹ کر جیت سکا ہے۔ سب ہی گر گئے ہیں اور ہم دونوں بھی گر گئے۔

جب وسنتی کا بیاہ ہوا ہے تو تارا بھی آئی تھی اور بوا کی بہوئیں بھی۔ تارا اس طرح پریم سے مجھ سے ملتی، پروانوں کی طرح میرے گرد چکر لگاتی بھابی کے ساتھ لگ

کر بیٹھی ہوتی، بھر کاموں میں مگن، اگر ان دنوں وہ میری مدد نہ کرتی تو میں شاید بری طرح گر جاتی۔ بہاری کبھی اندر آتا بھی تو بس دو لمحے تارا سے بات کرتا اور چلا جاتا اس کی آواز سن کر میری رگوں میں ٹھنڈک سی بھر جاتی اور کبھا کبھی میں بھی ایسی گم سم ہو جاتی جیسے بے ہوش ہوں، تارا کہتی بھابی بھلا یو جھ کس طرح برداشت کر سکتی ہے اکیلی یہ کتنا کام ہے۔ مہینوں سے کام کر رہی ہے، بیمار نہ ہو گی تو کیا ہو گا۔ شیکھر بھاگا ہوا آتا۔ جہاں سے ہوتا وہیں بلوایا جاتا۔ مگر میں بہت بیزار ہو جاتی۔ شادی کے کاموں میں لوگوں کی فکر میری وجہ سے اور بڑھ جاتی۔

ماں بھی آئی تھی بھیا اب لگتا تھا گبرو جوان ہے اسے دیکھ کر میرا جی بڑا اداس ہو جاتا کہ میں اس کی بہن ہوں اگر کبھی اسے پتہ چل گیا تو جانے کیا ہو گا۔ اسے کتنا برا لگے گا۔ میں بہاری سے لگ کر اپنے آپ کو دھرتی کا ایک ایسا ٹکڑا سمجھتی تھی جس پر بھگوان نے آپ پاؤں دھرا ہو اور بھیا کو دیکھ کر میرا دل کانپ جاتا۔ صرف اسے دیکھ کر لگتا مندر میں دیوی ماں کے سامنے میں اور بہاری ڈاکوؤں کی طرح شیکھر کے حصے میں سے چراتے اور بھیا کی عزت میں سیندھ لگاتے رہے ہیں، بھیا کو دیکھ کر مجھے کیوں ایسا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا پر میں اس سے ڈرتی کیوں تھی۔

وسنتی وداع ہو گئی تو مجھے گھر ایک دم بہت سونا لگنے لگا۔ مجھے معلوم تھا باندیاں جو باتیں کرتی تھیں صرف وسنتی ہی ان کا منہ بند کر سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ دنیا کے اور میرے درمیان ایک حفاظت کی دیوار تھی گو کمزور سی دبلی کامنی لڑکی اس نے بہت کچھ سننے پر بھی کبھی مجھے نہیں کہا تھا۔ سنی سنائی باتوں کو جھوٹ سمجھ کر ٹالا تھا۔ وہ طوفان کے آگے بندھ کی طرح تھی۔

ماں نے ایک دن سب سے الگ مجھ سے کہا "چمپا تجھے گھر کے سکھ اور اپنے من

کے جینے کی ضرورت نہیں تو کم از کم ہماری عزت کا خیال تو کیا کر۔ دنیا کی آنکھیں شیکھر کی طرح بند نہیں بہت کھلی اور تیز ہیں۔ تو نہیں چاہتی کہ میں یا تیرا بھیا اپنا سر اٹھا کر چلیں؟ کیا تو چاہتی ہے کہ اس عمر میں تیرا بابا ڈوب کر مر جائے؟ اری چمپا ہوش میں آ۔ اگر تارا کو پتہ چل گیا تو کیا کہے گی۔ تیرا خیال ہے یہ باتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں کوئی تارا کو نہیں بتلائے گا تو سوچتی ہے تیرے ڈر سے لوگ تیرا راز چھپا کر رکھیں گے تو یہ تیری بھول ہے۔ بیٹی لوگ تو بھگوان کا راز بھی کہہ دیتے ہیں۔

میں سر جھکائے سن رہی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کہتی گئی "کیا تو سوچتی ہے مندر کو بھرشٹ کر کے تو اور بہاری بچ جائیں گے۔ بھگوان کی سوگند تم پر دیوی ماں ضرور غصے ہو گی اری تجھے لاج نہیں آتی تو ہم پر دیا کر آخری عمر میں ہمارے سفید بالوں میں کیوں کالک لگوائے گی۔ پھر تیرے اتنی سندر اور موہنی بیٹی ہے۔ آدمی کیا اپنے لئے ہی جیتا ہے تو میری بیٹی ہو کر ایسی ہو گی۔ تو نے میرا دودھ پی کر اتنا بڑا اپرادھ کیا"، اور پھر وہ رونے لگی میں اٹھ کر جانے لگی تو اس نے میرا پلو پکڑ لیا اور کہنے لگی "چمپا تو شیکھر سے نہیں ڈرتی تو اپنے بھیا سے ڈر وہ تجھ سے چھوٹا ہے پر بہت غصہ ور ہے۔ وہ تجھ سے رکے گا نہیں رکے گا اور پھر نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ اری میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی بہاری میں ایسے کیا لال لگے ہیں جو تو شیکھر کو چھوڑ کر اسے چاہنے لگی ہے۔ جس پتی نے بھگوان کے سمان تجھے سارے سکھ دیئے تو انہیں تج کر پاپ کے راستے پر کیوں چلنے لگی ہے۔ تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے۔ چمپا تیرا بھیا جب سن پائے گا تو وہ تجھ سے نہیں رکے گا۔ پھر نہ کہنا مجھے خبر نہ کی اس میں میرا کوئی دوش نہیں پھر اس نے طاق میں رکھی بھگوان کرشن کی مورتی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا بھگوان تو گواہ ہے میں نے اسے سب برا بھلا سمجھایا ہے"، اور مجھے لگا جیسے وہ بہاری

کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو۔

ہرتری کی مسکان میرے ہردے میں تیر کی طرح اتر گئی۔ مکٹ لگائے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا بھگوان اور شیش ناگ نے میرے اندر گہرے سمندر میں زور سے پھنکار ماری۔ اتنی زور سے کہ میں ہل گئی۔ بہت دنوں سے میں نے بہاری کو نہیں دیکھا تھا۔ میں برہن تھی اور باغوں سے گھرے اور کوئل کی کوک سے بھرے اس گھر میں اکیلی تھی۔

باہر بسنت گانے والوں کی ٹولیاں تھیں اور مندر میں پچھلے سال سے بڑھ کر دھوم تھی۔ ہوا میں رنگ اور مہکار تھی۔ مست سادھو ناچنے والے اور بے سُدھ ہو کر گر پڑنے والے بھگوان کے بھگتوں کی بھیڑ تھی۔ گھاٹ سے لے کر کھیتوں تک اور راستوں پر آموں کے بور کی باس سے پنچھی اور آدمی سب مست تھے۔ کنواریوں کی چنریوں میں رنگ نکھرے ہوئے ان کے چہروں پر چمکار اور ہنسی کی چھوٹ جیسے کرنوں کا دھارا ہے۔ مانجھی دن رات یاتریوں کو اس پار سے اس پار لاتے اور ان کے گیت پانی کو چھو کر آکاش تک گونجتے ہوئے دھرتی نے نیا روپ بدلا تھا۔ درختوں کی چمکتی ہوئی نئی کونپلیں اور نکھرے ہوئے آکاش کے نیچے کروٹیں لیتی ہوئی زندگی پر ماں کو میں دیکھتی اداس سی جیسے ان چند دنوں میں مرجھا گئی ہو۔ بُوا وسنتی کے دوبار سسرال جانے کے لئے رکی ہوئی تھی۔ رات آتی تو میں انگاروں پر لوٹتی جانے کب میں بہاری کو دیکھوں گی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا اور اسے کسی جگہ بلوانا میرے لیے ممکن نہ تھا اور مندر کے اندر باہر اتنے لوگ تھے۔

کوئل آموں کے جھنڈ میں بولتی تو میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آجاتے بہاری مجھ سے یوں آنکھیں چرا کر چلتا جیسے کبھی اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اجالے میں میں ایسے نقطے کی طرح جو دھوپ میں مل گیا ہو اسے دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ تارا

کتنی بھاگوان تھی جس کو ایسا دیوتا پتی ملا تھا اور جو اسے چاہتا بھی تھا۔ سورگ سے نکالے ہوئے کی طرح مجھے کسی طرح چین نہ آتا۔ بھیا آکر بیٹھتا تو میں اس سے بھی دل لگا کر بات نہ کرتی۔

لوگ کہتے میں اس لئے اداس ہوں کہ وسنتی اب اس گھر میں نہ ہوگی۔

وسنتی سسرال گھر سے پہلی بار لوٹ کر آئی ہے تو بہت خوش نہ تھی ایسے بھکاری کی طرح جس کو بس پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ملی ہو۔ اس کی کاجل سے کٹیل بنی آنکھوں میں بے رونقی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ جب تک آس ہوتی ہے انسان جئے جاتا ہے، پر جب آگے پیچھے کچھ نہ رہے اور جو ہو وہ تمہاری جھولی میں آن پڑے تو!

دوسروں کے سامنے وہ بہت خوش رہتی۔ تارا بھابی سے گھس گھس کر باتیں کرتی۔ پدمنی سے مل کر پلنگ بڑھاتی اپنے لہریا دوپٹے کو جھٹکاتی وہ مجھے ایسی بہار لگتی جس کی آنکھوں میں ویرانی کا نقشہ ابھی سے جما ہوا اور میں دل ہی دل میں پرارتھنا کرتی بھگوان تُو نے اس گھر میں کسی کے لئے شانتی نہیں لکھی۔ کیا ہم اپنی اپنی راہوں سے آپ مکتی کے لیے کھوج کریں۔ بھگوان تو ہم پر دیا کیوں نہیں کرتا۔ بھگوان!

سب لوگوں سے مل کر ایک رات جب شیکھر کسی کے ہاں پوجا میں گیا ہوا تھا اور تارا، بُوا اور ماں کے ساتھ باتوں میں مگن تھی وہ میرے پاس آئی اور پہلے چپ چاپ بیٹھی اپنے پلو کو انگلیوں میں مروڑتی رہی۔ اس کے بعد اٹھ کر میرے گلے سے لگ گئی اور ہچکیوں سے مجھے اس کا سانس رکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

میں نے کہا وسنتی ارے ہوش میں آ تو روکیوں رہی ہے ساری دنیا کی لڑکیاں مائکے گھر سے وداع ہو کر سسرال جاتی ہیں کیا میں اس گھر میں ایسے نہیں آئی تھی۔

وسنتی نے کہا "بھابی تمہیں وہ گھاٹ والے مہاتما یاد ہیں انہوں نے ٹھیک کہا تھا اور میں اسے کیا بتاتی کہ وہ مہاتما بھلا مجھے بھول سکتے تھے۔

میں نے کہا "ضروری نہیں کہ باغ میں جا کر پہلے ہی سب پھول دکھائی دیں جو ٹوٹ کر جھولی میں گرنے والے ہیں۔"

اور وسنتی نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "کیوں بھابی اس بھیڑ اور شور میں بہاری بھیّا سے تو ملنا ہوا نہ ہوگا؟"

جس پریم کو میں نے سالوں اپنا خون دے کر پالا تھا اس سے انکار کرنا میرے بس کی بات نہ تھی پھر وسنتی تو بہت کچھ جانتی تھی شاید اس سے بھی زیادہ جتنا میں سمجھتی تھی کہ وہ جانتی ہو گی۔

وسنتی پھر کہنے لگی "بھابی تم کسی کو اپنے سے اونچا سمجھ سکو ہو یہ بھی بہت ہے اس جیون میں ہر کسی کو تو خوشی نہیں مل سکتی۔ بھابی۔ اور پھر تم او بہاری بھیّا مانو ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہو۔ میں نے جب جب تمہیں دیکھا ہے تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا جی ناچ اٹھا ہے۔ جیسے تم رادھا ہو اور وہ بھگوان کرشن ہو۔ سپنے میں دیکھی سندر مورتیوں کی طرح۔ بھابی ایسی راتیں ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں ہوتیں۔ میں مر بھی جاؤں تو وہ پہلی رات نہیں بھول سکتی جب تم مندر میں دیوی ماں کے سامنے بہاری بھیا سے ملی تھی۔

میں نے کہا۔ اس رات تو میں سوچتی تھی مندر میں موت ہے اور میں ہوں۔ تم کہاں تھیں؟

وسنتی نے ہنس کر کہا مندر کا دوار کھلا تھا اور ہر کسی کو تمہاری طرح پوجا کا ادھیکار ہے۔ ہے نا بھابی۔

میرے من میں ایک شک نے زخمی سانپ کی طرح سر اٹھایا۔ کہیں وسنتی بھی بہاری کے لیے تو وہاں نہ جاتی تھی۔ کیا وہ بھی بہاری کو پوجتی ہے؟

تم کو معلوم ہے وسنتی میں تو بھگوان سے اپنی پوترتا کے لئے موت کا سہارا مانگنے

گئی تھی تمہیں تو سب معلوم ہے ۔

وسنتی نے پھر کہا، دیکھو بھابی تم یوں کیوں گھبرا رہی ہو کیا پریم اور موت میں کوئی فرق ہے؟ اور پھر تمہیں تو اس رات نئی زندگی ملی تھی۔ دیوی ماں نے تم کو جو کچھ دیا وہ کسی کو کب ملتا ہے۔ اس رات سولہ شنگار کئے باریک ساڑھی میں تمہارا روپ اتنا نکھرا تھا کہ اس سے پہلے میں نے کسی روپ وتی کو ایسا نہیں دیکھا۔ تمہارے ہاتھوں میں لگا رنگ تمہاری آنکھوں میں کاجل کی دھار اور پھر وہ خوشبو جیسے دھرتی کی ساری پوترتا نے عورت کا روپ دھار لیا ہو۔ تمہارے گھنیرے کھلے بال اور تمہارے سفید پاؤں۔ بھابی اُس رات تم سر سے پاؤں تک وہ روپ تھیں جو بھگوان کو بھی بس میں کر لے بہاری بھیا تو پھر بہاری تھے۔

وسنتی میں نے بڑے دکھ سے کہا اپنا آپ بلیدان کرنا بہت مشکل ہے۔

اور وسنتی نے بڑے دکھ سے کہا، بلیدان کرنا تو بہت لوگ جانتے ہیں پر سولیکار کسی کسی کا ہی ہو پاتا ہے۔ تمہیں تو دیوتا ملا ہے کس شے کی چنتا ہے؟

میں نے کہا چنتا یوں پوچھو چنتا کا ہے کی نہیں۔ تم دیکھتی نہیں ہو بہاری گھر میں آتے ہیں تو میری طرف دیکھتے ہی نہیں، تارا سے بات کر کے چلے جاتے ہیں اور پھر دو ایک دنوں میں سب لوگ چلے جائیں گے۔ تم بھی اور وہ بھی۔ اور پھر پیچھے دم گھونٹنے والا چپ چاپ کا سناٹا ہوگا۔ اور اس بسنتی رات کے بعد جب لمبی دوپہریں آئیں گی تو یہ سوچ کر میں بہاری سے بات تک نہ کی کتنا دکھ دے گی۔ جانے پھر کب ملنا ہو اور مل سکیں بھی کہ نہیں؟ وسنتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا یوں نراش کیوں ہوتی ہو بھابی، دو ایک دن تو تارا یہاں ہے میں کچھ سوچوں گی۔ وہ بہاری کی اور میری آخری ملاقات تھی، بھگوان جانتا ہے اس کے بعد وہ صورت میری آنکھوں سے یوں چھپ گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سوچتی ہوں تو لگتا ہے ایک سپنا تھا میں نے سوتے میں ساری زندگی

کی خوشیاں اور اپنے بھاگ کے سکھ بھوگ لیے کہ جب آنکھ کھلی ہے تو آج تک اندھیرا ہے۔ میں اس اندھیرے میں اکیلی ہوں اور وہ جو کہتا تھا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو مگر رات میں میری ہو۔ اب کہیں نہیں ہے میں اس سہاگ کی سیج پر اکیلی ہوں اور ہر آہٹ پر چونک کر دیکھتی ہوں کہ شاید وہ اب میرے قریب آئے مگر نہیں وہ چاپ قریب نہیں آتی۔ کوئی نہیں ہے یہ میں ہوں اور یہ اندھیرا ہے آگے اور پیچھے سرسراتا ہوا اور ہر گھڑی ڈستا ہوا اندھیرا۔

اس رات باغ میں نئی گھاس کی میٹھی باس اور پھولوں کی پاگل کر دینے والی تیز سوگند تھی۔ میں وسنتی کے بتائے ہوئے راہ پر ننگے پاؤں جا رہی تھی، اور آنے والی گھڑی کی بیہوشی مجھ پر ابھی سے چھا رہی تھی آکاش میں چاند ہلکے سفید بادلوں کے پردوں پر سے ابھرتا ڈوبتا جا رہا تھا آموں کے جھنڈ میں سے خوشبو نکل کر میرا سواگت کر رہی تھی اور سایوں کا اندھیرا مجھے اندھیرے کے پتی کا پھیلا ہوا انگ لگتا تھا ہوا ہولے ہولے سرسرا رہی تھی اور پتوں پر سے رینگتی لگتی تھی۔ چاندنی بڑی پھیکی تھی اور گھڑی گھڑی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ جیسے مجھے چھپ کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پتلا سا چاند کبھی درختوں کی ٹہنیوں میں اٹک جاتا اور کبھی ذرا سے پتے کے پیچھے گم ہو جاتا۔ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اندھیرا اور چاندنی۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، میں بہاری کو اس سے بعد کبھی نہیں دیکھوں گی تو شاید میں اس سے وہ سب کچھ کہتی جو ہر گھڑی اب جی میں دہراتی ہوں۔ تالاب کے کنارے گرے ہوئے درخت کے تنے پر ہم دونوں بیٹھے تھے اور دنیا ہمارے لیے کوئی پرانی کہانی تھی، وہ مجھ سے ان سب دنوں کی بے تابی کی باتیں کہہ رہا تھا، اتنے مہینوں کے بعد ہم ایک دوسرے میں دو جھرنوں کی طرح مل جانا چاہتے تھے ہمارے سانس بے ترتیب اور ہمارے ہاتھ سن ہوئے جاتے تھے میرے گھنیرے سیاہ بال ہم دونوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور پھر ہم دونوں چپ تھے، میں مندر میں

گزاری اُس پہلی رات کی طرح آخری رات بھی پگھل کر اس کے خون میں مل جانا چاہتی تھی۔ میرا اپنا وجود کہیں نہیں تھا۔ ہر طرف بانکے بہاری تھا۔ میرا دل پھُول کی پتی کی طرح ہلکا تھا اور میں اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی اس کے قدموں میں مرنا چاہتی تھی یہ بھرپور چاہت یہ خوشی جیسے اس کے بعد کچھ تمنا کرنے کو باقی نہ رہا ہو کچھ کہنے کو اور چنتا کرنے کو باقی نہ رہا ہو اگر اس گھڑی میرا دل ٹھہر جاتا رک جاتا اور ہم دو بھونروں کی طرح تالاب کے کنارے گر جاتے تو بھی مجھے کوئی غم نہ تھا۔ مگر موت پریم سے شکست کھا جاتی ہے۔ جہاں پریم ہو وہاں موت کہاں گھس سکتی ہے۔ اور اس رات کے بعد آج تک تمنا کرنے اور کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا

جب تالاب کے دوسری طرف بہاری نے قدموں کی چاپ سنی جیسے سوکھے پتوں پر کوئی چل رہا ہو تو میں نے کہا بہاری تم اتنے دنوں بعد مجھے ملے ہو اگر ان چاپوں کو سننے کے لیے سمے کھوتے رہے تو شاید ہمارے من کو کبھی شانتی نہ ہوگی۔

بہاری نے کہا تھا۔ چمپا اتنی خوشی میں بھی کیوں بھولتی ہو کہ دنیا کا وار سخت ہوتا ہے۔ میں نے کہا میں تمہارے جیسے دیوتا کے سائے میں ہوں تمہارے بازو قلعے سے زیادہ مضبوط ہیں مجھے کسی شے کا ڈر نہیں کسی بات کی چنتا نہیں۔

اور پھر وہ امرت زہر بن گیا۔ وہ گھڑی گزر گئی اور اس کا سایہ اندھیکار بن کر آج تک میرے سہاگ کے لکھے کو چھپائے ہوئے ہے۔

ماں جب جانے لگی ہے تو اس نے مجھے کہا چمپا تجھے اپنے سہاگ اور گھر کی نہیں تو اس کی تو چنتا ہونی چاہیئے جس کے لئے تو نے لاج شرم سب چھوڑ دی ہے۔ چمپا میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ دنیا سے ڈرتے رہنا اچھا ہوتا ہے۔ بہت آگے اور اندھیرے میں بڑھنے والے جب ایک بار ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو سنبھل نہیں سکتے۔

میں نے ذرا غصّے سے کہا "تم کیا کہتی ہو ماں میں نے ایسا کیا پاپ کیا ہے؟

ماں اپنے ہاتھ ملنے لگی اور بولی چمپا اب تیری بربادی اور اجڑنے میں کوئی دقت باقی نہیں، اری پاپن تجھے اس گھر پر بھی دیا نہیں آتی۔ میری کوکھ کو آگ لگ جاتی اور میں تجھے پیدا ہی نہ کرتی تو اچھا تھا، تجھے خیال تھا کہ باغ میں اس درخت کے تنے پر بیٹھے تجھے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"پر ماں"، اور ماں نے کہا بس میں اور زیادہ کیا سنوں گی، بھیا نے تجھے دیکھا ہے۔ ارے اس کا کیا حال ہوا اس کی خبر ہے؟

تب مجھے لگا میں نے بھیا کو دو تین دن سے کہیں نہیں دیکھا۔ دسنتی بھی چلی گئی تھی بہاری اس سے اگلے دن ہی تارا اور بوا کے ساتھ جا چکا تھا، پھر ماں بھی چلی گئی اور میں ڈرتی کانپتی بھول میں رہنے والی راجکماری کی طرح کسی کی روشنی کی راہ دیکھتی رہی کسی آس کا سہارا لینے کے لیے۔ جانے اب بہاری سے کب ملنا ہو۔ میرے دامن میں بندھے موتی کھل کر سب بکھر چکے تھے۔

۷

شیکھر اس دن دیوانوں کی طرح دالانوں میں گھومتا پھرتا تھا اور اپنے بال نوچتا تھا جس دن بوا کے ہاں سے سویرے سویرے آدمی آیا ہے۔ میں گم سم بیٹھی تھی اور مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ دالان میں تیز دھوپ میں سے اٹھا کر جب باندیوں نے مجھے اندر کمرے میں لٹایا ہے اور ٹھنڈے پانی سے بھگو کر پنکھا جھلا ہے تو میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی تھی سب چہرے ستے ہوئے اور اداس تھے اور مجھے بھول چکا تھا کہ شیکھر سویرے سے جا چکا ہے اور بہاری کی گردن کسی نے تیز چھری سے کاٹ دی ہے وہ گردن جس پر سے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی وہ شان سے اونچی اٹھی ہوئی اور سر جو غرور سے نہیں یونہی

دیوتاؤں کی طرح سیاہ بالوں کے تاج سے اتنا سندر لگتا تھا۔ اس سر کو انہوں نے الگ کر دیا تھا جو سر میرے کندھوں پر لٹکا رہتا تھا۔ میں دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی "بہاری نہیں ہے" اور دیکھنے والی باندیاں کہتیں بہو کا دماغ چل گیا ہے۔

وسنتی جب شام کو آئی ہے تو اس کا رنگ یوں زرد تھا جیسے اس کے کندھوں پر کسی مری ہوئی عورت کا چہرہ لٹکا دیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "بھابی پگلی بن کر کیا تم افسوس زیادہ کر سکتی ہو۔ تمہاری انہی باتوں نے تو بہاری بھیا کی جان لی ہے اور اب دنیا کو تماشا دکھا رہی ہو۔ تمہارا پریم گہرا نہیں ہے تم صرف پریم کا سکھ جانتی ہو۔ اس کی پیڑا سے واقف نہیں ہو۔ تم نے جس شے کو چاہا ہے بل بوتے ضد سے پالیا ہے اس لیے تم نراش ہونا نہیں جانتیں۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی یہ وہی وسنتی تھی جو میرے سامنے بچپن سے بڑی ہوئی تھی جو مجھے پدمنی کی طرح پیاری تھی اور جو مجھے پریم کرنے اور آس نراش کا سبق دے رہی تھی۔

میں نے کہا وسنتی تم غلط سوچتی ہو۔ میں نے اتنے دنوں نراش اور دکھ کے ساتھ گزارے ہیں۔ تم نہیں جانتیں۔

وسنتی نے اسی طرح کہا جب آگے بھی کوئی آس نہ ہو تم نراس ہونا جانو تو میں سمجھوں۔

دنوں کوئی خبر نہ آئی جس کو بھجوایا جاتا وہیں کا ہو رہتا۔ پھر شیکھر نے پیغام بھیجا کہ بہاری کی حالت سدھر رہی ہے اور تھوڑی آس ہے شاید وہ تندرست ہو جائے اور چند مہینوں میں ٹھیک ہو جائے۔ وسنتی بھی اپنی سسرال جا چکی تھی گھر کے کاموں سے نمٹ کر میں ایسی راتوں میں جب تیسری چوتھی رات کا چاند باغ پر سے کھسکتا اور پتوں کی اوٹ میں چھپتا تالاب پر آتا تو اس گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھتی اور بس پانی میں جھانکتی رہتی ان گہرے سایوں کو دیکھتی اور بیٹھی رہتی یہاں تک کہ نرم ہوا چلنے لگتی اور چڑیاں ڈال ڈال پات پات چوں چوں کرتیں اور سویرے کی سرخی

پورب میں سے اُبھرتی۔

شیکھر واپس آگیا، بہاری کی حالت سنبھل گئی تھی اور وہ بہت خوش تھا، کہتا پتہ نہیں اتنے سندر اور ہنس مکھ بہاری کا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے زور کے بل پر بھی کسی کو نہیں دھتکارا۔ اور میں بھیا کا سوچتی جس کو میں نے مہینوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کی باتیں میرے کانوں میں اسی طرح سنائی دیتیں اور پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی رہتی۔

پھر سنا بہاری کے ٹھیک ہونے کی خوشی میں بُوا نے اپنے گاؤں میں بہت بڑی پوجا کروائی ہے۔ ماں کے ہاتھ بھیا کا پیغام ملا کہ تمہارے وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر تم گئیں تو میں تمہیں بھی کاٹ کر رکھ دوں گا۔

عین اس دن جب ہم سب تیار تھے اور دروازے سے نکلنے والے تھے مجھے اپنا دل یوں بیٹھتا لگا جیسے بس لوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل ہی تو جائے گا۔

میری وجہ سے وسنتی بھی رک گئی شیکھر پدمنی کو لے کر چلا گیا۔

پھر ساری باتیں یوں تیز تیز ہوئیں جیسے آندھی چلنے لگے۔ اور میں اس تیز ہوا کے ساتھ اُڑ کر آنکھ کھلی ہے تو یہاں پر تھی۔

وہ گھر مجھ سے چھوٹ گیا جو میری آشا اور نراشا کا ساتھی تھا اور پدمنی جس کو میں نے کبھی گھوم کر نہ دیکھا تھا جو سدا پیار کی بھوکی رہی تھی۔

وسنتی کہتی تھی "بھابی تم بھیا کی بات کو کیوں اتنا بڑا سمجھتی ہو۔ انہیں گھر آنے دو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ آپ سے آپ ہر بات درست ہو جائے گی۔ تم بس تھوڑے دنوں اور رہ سکو تو کیا تمہیں مجھ پر وشواس نہیں ہے۔ مجھے اس پر وشواس تھا مجھے شیکھر پر بھی وشواس تھا۔ پر مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔

جانے میرے اور بہاری کے راز کو کتنے لوگ جانتے تھے ؟
شیکھر میرا اپجاری   اور اس نے اپنی مورتی کو اپنے ہاتھوں ہی توڑ دیا۔
اس کی طرح پدمنی کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میری صورت کو دیکھ لیتی تو پہروں دیکھتی رہتی۔ جب شیکھر کے گھر میں سوتیلی ماں کے ہاتھوں دکھ اٹھا اٹھا کر وہ مری ہے تو مجھے اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔
شمشان میں بیٹھی میں پاگلوں کی طرح اس راکھ میں پدمنی کی وہ آنکھیں ڈھونڈتی رہی جن کی روشنی اس راکھ میں مل گئی۔ اپنے پاؤں چومنے والے شیکھر اپنے من جیون کے ساتھی اپنے پتی کو بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب چتا کو آگ دکھائی گئی تو جو سفید بالوں اور سفید داڑھی والا بوڑھا رو رہا تھا اور اپنے ہاتھ مل رہا تھا وہ کوئی اور ہوگا۔ جانے کون ہوگا پدمنی کے لیے جب میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا تو اس پر رونے والا بھلا اور کون ہوتا۔
اور بھیا نے آج تک مجھ سے بات نہ کی۔
پھر سنا ایک سال بعد جب اس کے زخم چھٹ گئے تھے اور وہ تار اپر جان دینے لگا تھا اپنے پچھلے پاپوں کا پرائشچت کرنے والا تھا بہاری اچانک مر گیا۔ یوں جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کوئی نازک پھول شاخ سے نیچے آ رہے۔
میں اس دن بھی نہیں روئی اور افسوس نہیں کیا۔ بھلا کوئی سپنے میں دیکھی صورتوں کے لیے روتا ہے۔
پر اس گھڑی سے مجھے اور بہت سی چیزوں کی طرح بھگوان کی دیا پر بھی دشواس نہیں ہے، وہ ایک گھڑی دیتا ہے تو دوسرے لمحے چھین بھی لیتا ہے۔ پھر ایسے بھگوان سے کوئی کیا مانگے۔
اور یوں ادم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

نگارِ وطن

"زمین سے محبت نہ بھی کرو تو بھی زمین تم سے محبت کرتی ہے"۔ گل شیر نے اپنی زخمی ٹانگ کو ہلانے کی کوشش کی۔

نرس نے بستر ٹھیک کرتے میں سیدھے ہو کر اس کی طرف دیکھا، "کیا کہہ رہے ہو گل شیر! کتنی عجیب باتیں کرتے ہو زمین کس طرح تم سے محبت کرتی ہے۔ بے جان شے مٹی بھلا وہ تم سے کیسے محبت کر سکتی ہے؟"

ہنس کر گل شیر نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ "یہی تو تم کو پتہ نہیں چل سکتا مس یہ باتیں تم کیا جانو۔ زمین کی بھی پکار ہوتی ہے۔ وہ ہر لحظہ تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اس نے کہا: "اسی لیے میں چاہتا ہوں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں اپنے وطن کے لیے میری جان بے تاب ہے وہ پکار مجھے سنائی دیتی ہے۔

کیتھرین مارڈے نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس بھی نہ سکی۔ گل شیر کے میلے چیکٹ بالوں میں کنگھی کرنے کے لیے وہ پھر جھکی تو اس نے بہت لجاجت سے

کہا" مجھے بتاؤ میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا کب واپس جا سکوں گا ؟"

"تم واپس جانے کے لیے اتنے پریشان ہو تو ٹھیک ہونے کی کوشش کرو نا، نرسیں کہتی ہیں تم انہیں ستاتے ہو، دوا نہیں پیتے کچھ پوچھا جائے تو جواب نہیں دیتے۔ یہ ٹھیک ہونے کا طریقہ تو نہیں نا ؟"

" وہ میری بات نہیں سمجھتیں تو میں اُن کی بات کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ اس پرائے دیس میں صرف تم ہی تو ہو جو میرے وطن کی بولی بول سکتی ہو۔ ان کے ہاتھ سے مجھے دوا بھی اچھی نہیں لگتی تم مجھے زہر بھی دو تو میں خوشی سے پی لوں گا"، گل شیر طمانیت سے ہنسا۔ کیتھرین کا ہاتھ جانے کیوں لرز گیا اس نے دھیرے سے اپنی اُس جیب کو چھوا جس میں گولی تھی۔

گیلے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔"میں تمہارے لئے ایک گولی لائی ہوں، یہ تمہارے سارے درد دور کر دے گی"۔

" چلو اچھا ہوا تم اتنی مہربان تو ہوئیں لاؤ گولی مجھے دو"، اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں گل شیر یہ گولی میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی اور پھر آج تم جتنی باتیں جی چاہے مجھ سے کرو مجھے ذرا دیر کو فرصت ملی ہے"۔

" اچھا عجیب بات ہے۔ مہینوں کے بعد آج تمہیں فرصت ملی ہے باتیں کرنے اور بیٹھنے کی"، ایک لمحے کے بعد پھر بولا"میری عادت بہت خراب ہے۔ جب کبھی مجھے ذرا سا بخار آیا ہے ماں ساری رات میرے پاس بیٹھی رہی ہے۔ ہائے یہ درد رہ رہ کر اُٹھتا ہے لاؤ گولی دو"۔ اس نے میلے کمبل کے تکیے پر اپنے بھاری سر کو زور زور سے ادھر ادھر مارا۔

"سنو مجھے اپنے گھر کی باتیں بتاؤ اپنے گاؤں کی اپنی بیوی کی"۔ نرس نے تکیہ برابر کیا۔

"ور دھین لینے نہیں دیتا گولی دے دو نا پھر میں تم سے باتیں کروں گا"

پانی کا گلاس پکڑانے میں نرس کا ہاتھ کانپا اور پانی چھلک کر کمبل پر گر گیا۔

"تمہاری طرح میری ماں بھی ذرا ذرا سی باتوں پر گھبرا جایا کرتی ہے۔ بابا کی طبیعت میں البتہ ٹھہراؤ ہے وہ دلگیر ہو تو بھی اپنے آپ کو سنبھالے رہتا ہے حیرت ہے تم اس پرائے دیس میں ماں کی طرح کیسے ہو؟" یہاں کتنی سخت سردی ہے اور ہم وطن سے اتنی دور ہیں اور پھر جبری بھرتی کر کے یہاں لائے گئے ہیں۔"

"جبری بھرتی مگر جبری بھرتی کیوں؟ تم لوگ تو اپنی مرضی سے اپنے حاکموں کو خوش کرنے کی خاطر لڑتے ہو،" کیتھرین اب اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

گل شیر ہنسا تو اُس کے نئے نئے صاف ہوئے دانتوں کی چمک ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے مقابلے میں بڑی دلآویز تھی وہ اس اپنے پن سے بہت مطمئن تھا۔

"تمہیں کیا پتہ جبری بھرتی کیا ہوتی ہے؟ مگر خیر تم جان کر بھی کیا لو گی۔ میں اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہوں ہمارا پہاڑی علاقہ کھیتی باڑی میں بہت محنت مانگتا ہے۔ اس دن جب تحصیلدار کے کارندے مجھے پکڑ کر لے گئے اور میرا نام فوج میں لکھوا دیا تو میں اپنے کھیتوں کے کنارے گھوم رہا تھا اور بہت خوش تھا ہماری مکئی اس بار خوب ہو رہی تھی اور میں اس پگڈنڈی کی طرف گھڑی گھڑی جھانکتا تھا جہاں سے نور آنے والی تھی۔ نور پہاڑ کے دوسری طرف کے گاؤں کی بہت خوبصورت مٹیار ہے اس کی شربتی آنکھوں پر آدمی اپنا آپ وار سکتا ہے۔ جب وہ گھنی پلکوں کی اوٹ سے دیکھتی ہے تو شرم کی لالی اس کے گالوں پر بہت بھلی لگتی ہے جب میں ان کے ساتھ جا رہا تھا تو وہ تیز تیز قدم رکھتی اس پگڈنڈی سے مجھے دکھائی دی پہلے میں نے چاہا کہ اس سے بات کروں پھر دوسرے لوگوں کے خیال سے میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ کتنی حیران ہوئی ہو گی مگر حیران ہونا بھی آخر آدمی کے لیے بنا ہے۔ اس

شام جب میں واپس آیا تو گھر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے بھرا تھا۔ سب لوگ بہت اُداس تھے ماں روتے روتے بے ہوش ہوئی جاتی تھی مگر کوئی تسلی بھی تو نہیں دیتا تھا۔ نور گھونگھٹ منہ پر کھینچے ایک طرف بیٹھی تھی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی اس کی ماں نے میری بلائیں لیں۔ نور میں بیاہ کے دو سال بعد تک بھی بیاہ کی نہیں آئی تھی پھر رات آگئی، آسمان سیاہ لگ رہا تھا اور ستارے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے بہت سجتے تھے۔ مہمان کے ساتھ میں چوپال میں سویا۔ مگر اس رات مجھے نیند کہاں آرہی تھی۔ سردی بڑی بھلی تھی اور میرا دل یوں اتھل پتھل ہو رہا تھا چاروں طرف ہم سے اونچے ہم سے نیچے دُور دور پہاڑ کی چوٹی تک دیئے ذرا دیر کے لیے ٹمٹماتے اور بادل کی اوٹ میں ہو جاتے پھر بجھ جاتے۔ جھرنے کا شور بہت زور سے پتھروں سے ٹکراتا دھارا۔ کہیں کہیں کوئی بکری سوتے میں جاگ کر ممیاتی تو اس کی گھٹی گھٹی آواز بند کوٹھے میں یوں گونجتی جیسے وہ موت کو دیکھ کر ڈر رہی ہو بادام کے پودے مزے میں جھومتے تھے اور پانی پر سے ہو کر آتی ہوا ان کی ٹہنیوں میں جھول جھول جاتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں نور سے بات کروں مگر ایسا کرنا بھی تو ممکن نہ تھا۔

"تم اسے بلا لیتے بلا سکتے تھے، وہ تمہاری اپنی بیوی تھی"، کیتھرین نے کہانی سننے والے کی طرح ہنکارہ بھرنے کی خاطر کہا۔

"بلا لیتا"، گل شیر طنزیہ ہنسا "مس ہمارے گھروں میں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ جب بڑوں اور رشتہ داروں سے گھر بھرا ہو تو کوئی جوان اپنی بیوی کو نہیں پکار سکتا۔ ہمارے ہاں کے دستور ہیں مگر تم انہیں سمجھ نہیں سکتیں۔

"شاید یہ ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آسکتی"، کیتھرین نے کہا۔

"تم بیوی سے ملے بنا تو نہیں آئے نا؟"

یونہی ہوا میں نور سے مل نہیں سکا مجھے اور گاؤں کے دوسرے جوانوں کو وداع کرنے کے لیے تھوڑی دور تک عورتیں آئیں مگر اس بھیڑ میں نور کی صورت میں کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ لاری کے آنے تک ہمارے باپ اور بھائی کھڑے رہے پھر وہ بھی ہاتھ ہلا کر اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ بھاری قدموں سے بوجھل دلوں کے ساتھ چپ چاپ لاری ہمیں نامعلوم منزلوں کی طرف نامعلوم وقت کے لیے لے کر چل پڑی۔ راستے کے وہ سب موڑ وہ سارے کنج میری یاد میں اکثر ابھرتے ہیں۔ .... وہ سائے جن میں ہم کھیل کود کر بڑے ہوئے وہ جھرنے جن کے ٹھنڈے میٹھے پانی کی پیاس مجھے اپنی روح میں محسوس ہوتی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ دھوپ کتنی تیز اور گہری اور دن کتنے چمکیلے ہوتے ہیں، سردی اتنی مزیدار ہوتی ہے اور کھیتوں کے کنارے کے درختوں پر چڑیوں کے جھنڈ یوں فراٹے بھرتے ایک سے دوسرے درخت پر جا بیٹھتے ہیں جیسے مٹھی بھر دانے یہاں وہاں کھینچ کر مارے ہوں۔ سو طرح کی خوشبوؤں سے بھری رہتی ہے اور مست ہو کر کوئلیں یہاں وہاں اندھیرے کنجوں میں بولتی ہیں عجیب عجیب رنگوں والے پرندے ست رنگے پھولوں کی طرح کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

"ست رنگے پھول تم تو خوابوں کی باتیں کرتے ہو شیر،" کیتھرین نے اس کا بازو اٹھا کر نبض دیکھنے کے لیے اپنی انگلیاں اس پر رکھیں۔

مجھے یہ خواب ہر شے سے زیادہ پیارے ہیں، مجھے ان کی باتیں کر لینے دو نا۔ اس زمین کی باتیں جو مجھے پکارتی ہے گل شیر کی آواز بوجھل ہوئی جاتی تھی۔ مہینوں کے بعد اب اس گھڑی جب مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا اور تم ذرا فرصت سے میرے پاس بیٹھی ہو۔ مجھے خواب کی باتیں کہنے دو نا،" گل شیر ضدی بچے کی طرح اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔

"میں سن رہی ہوں گل شیر یہ باتیں مگر تعجب ہے تمہارے باغوں میں ست رنگا پھول

ہوتا ہے کیتھرن یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کوئی کام ہی نہ ہو۔
دور کہیں سے توپوں کی گھن گرج سنائی دی۔

"ہمارے جھرنوں کا پانی اتنا صاف ہوتا ہے اور اتنا نیلا کہ تم اس کے آر پار گہری جھیل کے آخر تک دیکھ سکتی ہو۔ میرا وطن دنیا میں سب سے پیارا ہے جب میں اچھا ہو جاؤں گا اور واپس چلا جاؤں گا تو تم ہمارے ہاں آنا، تمہیں نور پسند آئے گی، ان دو سالوں میں اس کا رنگ اور بھی نکھر گیا ہوگا، تم نے گندم کے کھیت دیکھے ہیں مگر تم نے کہاں دیکھے ہوں گے۔ اس کا رنگ سنہرا ہے، مگر ذرا سا زرد جیسے چنبیلی ہو مگر نہیں چنبیلی کی رنگت میں وہ چمک نہیں ہوتی جو اس کے رنگ میں ہے خیر جب تم دیکھو گی تو تمہیں اس کے رنگ کی آپ سے آپ سمجھ آجائے گی اور پھر وہ باتیں بہت اچھی کرتی ہے دھیرج سے بات کرنے والی اور بھاگوان تمہیں پتہ ہے بھاگوان کون ہوتا ہے؟ مگر نہیں تمہیں معلوم ہوگا نور کے آنے سے ہماری گایوں اور بھینسوں نے زیادہ دودھ دینا شروع کر دیا ہے۔ جب سے وہ آئی ہے ہمارے کھیتوں میں اناج بہت ہونے لگا ہے ہر شے دھل گئی ہے۔ جیسے بارش کے بعد درختوں پر نکھار آجاتا ہے۔ میری ماں اسے بہت پیار کرتی ہے۔ جب اس کے لمبے سیاہ بالوں میں تیل ڈالتی ہے تو کہتی ہے میری بہو کو کسی کی نظر نہ لگ جائے اور اس کے کان کے پیچھے سیاہی کا ٹیکا لگا دیتی ہے۔ نور مجھ سے کہتی ہے "پتہ نہیں ماں کو میں کیوں ساری دنیا سے زیادہ خوب صورت لگتی ہوں"، میں اسے ستانے کے لیے کہتا ہوں،، ہاں پتہ نہیں کیوں ہر ماں کو اپنی بہو دنیا کی ساری کنواریوں سے زیادہ حسین کیوں لگتی ہے،، وہ چپ سی ہو جاتی ہے پھر اٹھ کر ادھر ادھر چلی جاتی ہے اور پھر کہتی ہے "اچھا ماں کو ہی لگتی ہوں نا تمہیں تو نہیں لگتی نا پھر اپنی گہری نیلی چادر کو بہت اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر کہتی ہے گاؤں کی مٹیاروں میں سے تمہیں کون لگتی ہے اچھی ذرا بتاؤ تو سہی،،

میں سر ہلا دیتا ہوں ہم دونوں ہنسنے لگتے ہیں، اُسے پتہ ہے اس کا نیلی چادر میں یوں چمکتا چہرہ مجھے آسمان پر پورے چاند کی طرح کا دکھائی دیتا ہے اس کی ہنسی میں بڑی موہنی ہے۔ جب وہ ہنسے تو تم اسے پسند کئے بنا رہ ہی نہیں سکتیں، تمہیں نہیں معلوم جب سے وہ آئی ہے لگتا ہے ہمارے گھر کا آنگن سکھ کا سانس لے رہا ہے گھر بدل گیا ہے گھر کے ساتھ زمین بھی بدل گئی ہے مجھے اس زمین سے محبت ہے مس۔

"اپنے وطن سے سب کو محبت ہوتی ہے۔" کیتھرین اس کی نبض کے بوجھل پن کو محسوس کرکے مطمئن تھی گولی کا اثر وقت کے ساتھ ساتھ ہو رہا تھا وہ اب کرسی پر آگے کی طرف جھکی بیٹھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"نہیں ہماری زمین میں ایک جادو ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے، اس زمین کی چاہت کی چھاپ بہت گہری ہے، پکے رنگ کی طرح وہ تمہاری روح میں اتر جاتی ہے تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے اور اس لیے دیس سے دور ہونے پر بھی آدمی اس کے سپنے دیکھتا ہے ان صبحوں اور شاموں میں کچھ ہے جو آواز دیتا ہے وہ آوازیں جو نہ بولنے پر بھی بولتی ہیں۔ تارے جو نیلاہٹ میں آنکھیں جھپکاتے ہیں راہ دکھانے والے جو کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کر چکیں تو رات ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے، نیلے پربتوں پر نیلے دھوئیں کا جادو اور شاموں کا سناٹا پھر ایسی صدائیں جن کا کوئی نام نہیں پھلدار درختوں کی خوشبو اور پانی کی ٹھنڈک وہ جگہیں جہاں میٹھے پانی کے ذرا ذرا سے سوتے بہتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو آنکھ مچولی کھیلتے میں شیطان کی طرح تیز اور دوڑنے میں بکریوں سے بھی زیادہ چالاک ہیں وہ جگہیں جو بدل بھی جائیں تو یاد رہتی ہیں تم محسوس نہیں کرتی ہو کہ اپنے لاتعداد بازو پھیلائے زمین محبت کی جھولی میں بلاتی ہے اور آدمی اگر اس پیار کو محسوس نہ کرے تو اس کے لیے جان قربان کیوں کرے، یہ محبت یکطرفہ نہیں ہوتی۔

"گل شیر اب تم سو جاؤ بہت باتیں کر چکے ہو، کیتھرین نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا آج تمہیں فرصت ہے"۔ شیر دل نے جس ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا ہے وہ بے جان سا ہو رہا ہے، بوجھل سویا ہوا جیسے اس میں سے روح نکلی جا رہی ہو۔

"میری بات سنو مجھے تو زمین بھی دلہن کی طرح لگتی ہے۔ آدمی کے لیے جان دے سکتا ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آدمی ساری عمر سفر کر سکتا ہے۔ وہ زمین جس کے لیے وہ زندہ ہے وہ سر کے بل چل کر اس تک جانے کے لیے ایک عمر نہیں دس عمریں بھی گنوا سکتا ہے۔

"کاش تم اپنی ایک عمر اور یہ چھوٹی سی زندگی اس کے لیے دے سکتے تم نے اپنی جان ایک ایسے جھوٹ کے لیے دی ہے جس میں تمہیں یقین تک نہیں ہے اور کبھی نہیں تھا"۔ کیتھرین اس کے کان پر جھکی کہہ رہی ہے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے ایک دم بوجھل پلکیں اٹھائیں اور اپنی اونچی پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پوچھنے کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہا، جو اُٹھ نہ سکا جیسے دیئے کی لو ایک دم زور سے بھڑکے اور پھر وہ بے دم ہو کر کمبل کے تکیے پر گر پڑا۔

"گل شیر دھیرج سے کام لو میں تمہارے لیے دعا کروں، تم اب خاموش لیٹے رہو۔"

"میرے لیے تم دعا کرو گی۔ تم میرے لیے دعا کرو گی۔ نہیں میرے ساتھ میری ماں کی دعائیں ہیں، میری نور کی دعائیں ہیں، میرے گاؤں کے راستے منتظر ہیں اور دعا کرتے ہیں، میری زمین منتظر ہے، پکارتی ہے اور دعا کرتی ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

تمہاری زمین نہیں کوئی اور زمین تمہیں پکارتی ہو گی تمہاری زمین نے اپنی بولی بدل دی ہے۔ کیتھرین آنکھیں بند کر کے دعا کرنے لگی اس نے اپنے سینے پر صلیب کا

نشان بنایا۔

"تم مجھ سے بات کرو یوں چپ نہ بیٹھو مجھے وحشت ہوتی ہے آنکھیں بند نہ کرو تمہاری آواز میرے کانوں میں میٹھے گیت کی طرح آتی ہے،" گل شیر لگتا تھا پوری ہوش میں ہے۔

"اچھا جو تم چاہو۔ کیتھرین نے خیمے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "کاش یہ وقت اتنا لمبا نہ کھینچے۔"

"کیا کہہ رہی ہو میرا سر بھاری ہو رہا ہے،" گل شیر کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔

"میٹھا گیت میری آواز تمہیں میٹھے گیت کی طرح لگتی ہے۔ موت کا راگ اندوہناک، اندھیرا اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہوتا۔"

تب خیمے کے دروازے سے جھانک کر ڈاکٹر نے کہا۔ "نرس خالی بستر کے انتظار میں وہ زخمی کرنل کو لیے باہر کھڑے ہیں" پھر اس کو ذرا متذبذب دیکھ کر وہ اندر آگیا کیوں تم نے اسے گولی وقت پر نہیں دی تھی؟"

"دی تو تھی مگر پتہ نہیں کیوں لگتا ہے وہ مسلسل ہوش میں ہے، باتیں کئے جاتا ہے اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا، بے ہوش بھی تو نہیں ہوا۔"

مگر باہر ناقابلِ برداشت ٹھنڈ ہے اور وہ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے تم نے اسے باتیں کرنے سے روکا نہیں۔"

روکا تھا ڈاکٹر مگر اسے اپنا وطن یاد آرہا تھا، وہ کہتا تھا اسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی ہے

"یہ جذباتی لوگ بہت بے وقوف ہوتے ہیں اور بہت ہی جذباتی اگر اسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی ہے۔" اس نے غلط سنا ہوگا۔ ڈاکٹر نے اشارہ کیا۔

"شاید کبھی کبھار آدمی موت کے سفر تک غلط سوچوں کا غلط آوازوں کے جادو کا

اور غلط پکاروں کا جواب دینے کا شکار ہوتا ہے" کیتھرین نے جھک کر گل شیر کی ناک کے آگے اپنا ہاتھ رکھا پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا، وہ آنسو چھپانے کے لیے اپنی آنکھیں جھکائے ہوئے تھی۔

یہ کہانی میں نے ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں زمانوں پہلے پڑھی تھی تب سے اب تک کتنا پانی پلوں کے نیچے بہہ چکا ہے، وقت نے سات رنگ بدلے ہیں، وطن اور وطن کے معنی بدلے ہیں۔ ہم نے اپنے سبق سیکھے ہیں۔ قربانیاں دی ہیں اور قربان ہوتا سیکھ رہے ہیں کتنی جنگیں لڑی ہیں، مگر جانے مجھے کیوں ہر سپاہی کی کہانی گل شیر کی کہانی لگتی ہے گولی سے لائی موت عزت کی موت اور کا بلاوا لگتی ہے۔ پتہ نہیں کون نگار وطن ہے، جس کی ایک جھلک دیکھنے اور گھونگھٹ کے پیسے جس کے کانوں کی لالی پر شربتی آنکھوں پر جان وار دینے کی آس لیے وہ میٹھے مدھرا اندھیرے اور اندوہناک راگ سنتے ہیں! وہ کون ہے جس کی چاہت میں وہ سب اپنی جان سے گزر جاتے ہیں، پتہ نہیں اس چاہت کا جادو کیا ہے اور کون سی زمین کس کو کب پکارتی ہے؟ ڈاکٹر کے لفظوں میں یہ جذباتی لوگ جانے کیا ٹھیک سنتے ہیں اور کیا غلط؟

آہوئے آوارہ

اجنبی شہر میں سردی یونہی کپکپا دیتی ہے اور پھر اُس دن تو صبح سے ہی ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی ہڈیوں میں گودے تک کو جما دینے والے بادل غول در غول عصا برداروں کی طرح سورج کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے پھر فوجوں کی سی سیاہ گھٹائیں اُمنڈ کر آئیں، یورش کرنے کے لئے اکٹھا برسنے کے لیے تیار کھڑی ہوئیں میں یہاں تبدیل ہو کر آیا تھا ایک بالکل نئے محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے جس کا اپنا دفتر تک ڈھنگ کا نہ تھا رہائش کا بندوبست ایک ہوٹل میں تھا جہاں سیاحوں کی آمد ورفت رہتی تھی ابھی کام بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اور میری شامیں ناواقف ہونے کی وجہ سے تقریباً خالی ہوتیں، کبھی کبھار کلب جانے سے اور بھی بوریت ہوتی، اس لیے کہ یہاں میرے کوئی دوست نہ تھے میں شراب نہیں پیتا، سگریٹ کا شوقین نہیں اور تاش بھی بس واجبی ہی کھیل سکتا ہوں۔

جس شام کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں، اس روز میں نے پکچر دیکھی تھی اس میں بھی خوشی کی کوئی کرن تک نہ تھی عجیب دل کو اداس کرتے والی غم سے بھری کہانی تھی لگتا تھا سارے عناصر اکٹھا ہو کر آدمی کے خلاف لگے ہیں، زندگی کے ناپید کنار سمندر میں محبت کے بول کی ایک بوند بھی

نہیں ذراسی خواہش بھی پوری نہیں ہوتی یہ سیاہ المیہ تھا رگوں میں خون کو پانی کرنے والے غم کی داستان جی چاہا انٹرول میں اٹھ جاؤں پھر سوچا ہوسکتا ہے کرداروں کو تھوڑا سا امن مل سکے کہیں سے ذراسی کرن ان بادلوں کے گھیرے کو توڑے امید اور خلوص سے یہ سیاہی دور ہو۔ مگر وقفے کے بعد بھی وہی افسوس ناک فضا رہی بلکہ ہیروئن کو تو حالات کی خرابی نے ناچ کر روز کی روٹی کمانے پر مجبور کر دیا لگا دل میں سے کوئی سارا خون نچوڑ رہا ہے اسے مسل رہا ہے میں نے اپنے سے عہد کیا آئندہ ایسی فلم نہیں دیکھوں گا۔ بھلا یوں بھی کبھی ہوا ہے خدا کی بنائی اس دنیا میں انسان کے لیے صرف گرتے رہنا اور زمانے کی چکی میں پستے رہنا ہی لکھا ہو ایسی کہانیاں دیکھنے کے بعد تو آدمی خدا کی ذات پر بھی شک وشبہ کرنے لگتا ہے اس کے موجود ہوتے پر بھی یقین ڈگمگا جاتا ہے جیسے وہ ہونے پر بھی نہ ہو یا وہ کسی کو بنا کر بھول گیا ہو۔

اوورکوٹ کو لپیٹے جب میں پہنچا ہوں تو گرم موزوں کے باوجود میرے پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے سُن کر دیا تھا ناک برف کا ٹکڑا لگتی تھی۔ سائیں سائیں کے شور سے کان بند ہونے لگے تھے۔ پیدل چلنے کے باوجود جسم گرم نہیں ہوسکا تھا۔ ہیٹر ایک دم بڑا جاندار لگا آگ کی سراسراہٹ نیلے شعلے کی لپک اور تال تھی جیسے گیت کی بڑھتی اور بلند ہوتی لے پاؤں گرم کرکے میں قریب ہی مخملیں کرسی میں دھنس گیا باہر ہوا کے شور میں اور زیادتی ہوتی گئی درختوں سے گھرے اس ہوٹل کو معلوم ہوتا تھا نعرے لگاتے ایک جلوس نے گھیرے میں لے رکھا ہو خوشگواری اور باہر کے مقابلے میں اندر کے اپنے پن ذہنی تھکن تنہائی کے احساس سب نے مل کر مجھے تھپکنا شروع کیا پھر نیلے پانیوں کے خواب میں ساری آوازیں ڈوب گئیں مہا ساگر کی لہروں نے مجھے جھولا جھلایا، پتہ نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہاں مجھے یوں ہی لگا جیسے کسی نے دروازے کو ہولے سے بجایا ہو، وقفوں سے پھر ذرا زور سے ٹھوکا دیا ہو گا، لگا میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں، انجانے کا خوف آدمی کو یوں ہی ہلا دیتا ہے۔ خواب کہیں غائب ہو گئے، دور آدھی رات کا گھنٹا بجا "ذرا دروازہ

تو کھولیے" لہجہ ہرگز غیر ملکی نہیں تھا۔

دوبارہ ذرا وقفہ سے پھر دستک ہوئی۔

"کون ہے" میں نے جاگ کر ذرا تیزی سے کہا۔

میری چابی گم ہوگئی ہے"، نہ سریلی اور نہ ہی کھردری عورت کی آواز لگتا تھا زبان کی لکنت اور بدن کی لڑکھڑاہٹ کے درمیان سے کہیں مجسم ہونے کی کوشش ہو۔ اور دروازہ کھولنے کا بھی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کال گرلز کے چکر میں یونہی میں کبھی نہیں پڑا اور پھر آدھی رات پیچھے پرائی اور باسی اُترنوں سے دل بہلانے کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا کوڑے کے ڈھیروں سے یادوں کی بوری میں گودڑ بھرنے والوں سے مجھے نفرت ہے آدمی تعفن کو لپیٹ نہیں سکتا اسے اوڑھا نہیں جا سکتا روح کی پیاس کبھی گندے گدلے پانی سے مٹی ہے، ٹھنڈے کنوؤں کے میٹھے دھارے سے ہی مجھے شغف رہا ہے پارسائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں مگر تیز تیز سانسوں کی گڑبڑ اور پسینے کی بُو سے مجھے اپنے وجود کے آلودہ ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ دوست ہنستے ہیں صفائی کی میری اس عادت کو بے جا اسراف سمجھتے ہیں آدمی کبھی مٹھاس سے بھی گندہ ہوا ہے سو گندہ سے بھی گھبرایا ہے۔ کہتے ہیں تم صدیوں پہلے پیدا ہو گئے ہو۔ جنس کا آتش فشاں جواب پھٹا ہے اور آگ اگلتا ہے تو اس لاوے کو ٹھنڈا ہونے کے لئے صدیاں چاہئیں وہ کہتے ہیں میں بزدل ہوں تجربوں سے ڈرتا ہوں خود پسند ہوں اور ذہین تو قطعاً نہیں مگر چابی کے گم ہونے کا میرے دروازے کے کھلنے سے کیا تعلق ہے؟

میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ RECEPTION کو فون پر کہہ دیں" "کون سا نمبر"

"تین ہے آپ کے برابر میں کونے والا کمرہ"

آپریٹر کی سوئی ہوئی آواز آئی "یہ سدا تین نمبر کی چابی گم رہتی ہے"

میں نے کہا کیا جواب دوں" بڑبڑاہٹ برابر جاری تھی۔

"انہیں کہئے کم از کم آدھ گھنٹہ تو لگے گا جس بیرے کے پاس چابی ہے، وہ کہیں سو یا پڑا

ہو گا "، پھر ذرا جاگی ہوئی آواز میں کہا "انہیں کہیں انتظار کریں۔"

"جی میں نے فون کر دیا ہے چابی آتی ہی ہو گی"، مگر دروازہ نہیں کھولا۔

اوپر کی بتی بجھا کر میں نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا سیاہ سرد رات بادلوں کے لبادے اوڑھے سڑک کی مدھم روشنیوں کے اوپر سے محوِ پرواز تھی اس کی تیز اُڑان کا ساتھ دیتے ہوئے درخت جھکے جاتے تھے، شاخیں پاگلوں کی طرح دوڑ میں حصّہ لینے کے لیے ایک دوسرے کو دھکیل رہی تھیں۔ پتے تیز تیز کودتے تھے۔ ننھے خرگوشوں کی طرح اور وہ عورت تنہا کھڑی ہوئی چابی کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔

ہاں وہ تنہا ہی ہو گی اسے تنہا ہی ہونا چاہیئے اگر کوئی ساتھی ہوتا تو وہ خود دروازہ کھٹکھٹاتا۔ آواز میں سلیقہ تھا لفظوں کی ادائیگی عمدہ تھی یہ مہذب لب و لہجہ تھا جو کسی غیر ملکی کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے بے خیالی میں ایک مجسمہ بنانا شروع کیا ذرا بھاری تھوڑی لمبی دوشیزہ نہیں اپنے پر یقین رکھنے والی عورت ہی ہو سکتی ہے، وہ خیر خیر اور ٹھنڈے بستر میں جب مجھے وہ سردی گوارا ہی لگی تھی میں نے اپنے خوابوں کو پھر وہیں سے جوڑا جہاں سے وہ ٹوٹے تھے۔

اگلی صبح میں نے کاونٹر پر چابی دی ہے تو خوشبو کا ایک جھونکا میری ناک سے چھوا بے چین کرنے والی یہ باس سینٹ کی نہیں تھی دیسی عطر کی بھی نہیں سستا اور آوارہ سی جیسے استعمال کرنے والے کو اچھے اور بُرے میں امتیاز کا سلیقہ ہی نہ ہو، جیسے بے ترتیب کپڑے پہننے والے کو دیکھ کر طبیعت الجھتی ہے بس یونہی سی کیفیت میری بھی ہوئی ہے، آس پاس کوئی نہ تھا پتہ نہیں یہاں سے ابھی ابھی کون گزرا تھا! دور پڑے صوفوں پہ لوگ بیٹھے تھے سواری منگوا کر اس کے انتظار میں اخبار کو جلد جلد ختم کرنے کے لیے صفحوں کو پلٹ کر صرف سرخیاں دیکھتے ہوئے لمبے بالوں والے غلط ملط لباس پہنے مرد اور عورتوں کے جوڑے جو غیر ملکی ہوتے ہوئے مشرقی لباس میں مضحکہ خیز لگتے تھے اور تیز تیز گفتگو کر رہے تھے۔ بارش صبح سے بنا رُکے پڑ رہی تھی میں نے کلرک کے سر کے اوپر سے شیشوں کے پرے جھانکا درختوں کی ہریالی دھلی دھلی تھی اور بھیگی شاخیں پانی میں

کودتے پھاندتے بچوں کی طرح زور زور سے ہل رہی تھیں۔

ٹرن ٹرن ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "جی ابھی ذرا دیر ہوئی چلی گئی ہیں"۔ ۔ ۔ جی کوئی پیغام کسی کے نام چھوڑ کر نہیں گئیں۔ پتہ نہیں کب آئیں عام طور پر رات گئے لوٹتی ہیں۔ ۔ ۔ جی اپنا پتہ لکھوا دیجئے"۔ پھر اس نے چٹ پر ایک نام لکھ کر اُسے تین نمبر کے خانہ میں جو ڈاک کے لیے بنا تھا رکھ دیا۔

اداس بھاری دن ہولے ہولے گھسٹتا رہا۔

دفتر سے لوٹ کر میں خط لکھتا رہا کھلے پردوں میں سے سڑک پہ جاتی موٹریں کھلونوں کی طرح چھوٹی اور مکینوسیٹ پر بھاگتے ریل کے ڈبوں کی طرح چکروں میں گھومتی لگیں ذرا سی بلندی سے ہر شے کتنی مضحکہ خیز اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔

"دیکھو میں تم سے قطعاً محبت نہیں کروں گی اگر تم کل نہیں آئے خدا کی قسم"۔

"میرا انتظار نہ کرنا کام ختم کر کے ہی آؤں گا"۔

یہ مکالمہ عین میرے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر دہرایا جا رہا تھا۔

"دیکھو میں مار بیٹھوں گی تمہاری یہ جرات کہ میں کہوں اور تم انکار کرو"۔

"انکار کون کر رہا ہے ایڈ انگر کام تو دیکھو بس تصویریں کل تک کیسے ممکن ہیں اگر ڈرائنگ بھی بناؤں تب بھی اور تم کہتی انہیں رنگوں بھی سہی نہیں ڈرائنگ مجھ میں یہ ہمت نہیں۔

ہعا وہ اوہ پلیز جادی میرے لیے یہ بہت ضروری ہے، تمہارے لیے گھڑیاں اور پل بھی اہم ہوتے ہیں اور میں تو پوری ایک رات اور آدھے دن کی بات کر رہی ہوں"۔

پھر آوازیں روشنی کے نقطوں کی طرح اندھیرے میں ڈوب گئیں میں نے پردے بند کر دیئے۔

فون کی گھنٹی بجی میں ابھی نیم خوابیدہ تھا سردیوں کی سہ پہروں کی غنودگی بڑی دل خوش کن ہوتی ہے اور پھر جب کوئی کام نہ ہو کہیں جانے کی جلدی نہ ہو تو بستر کی گرمی آدمی کو تھپکتی ہے۔

"میں رات کی جسارت کی معافی چاہتی ہوں"۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"لگتا ہے میں نے پھر آپ کو سوتے میں سے جگا دیا ہے اور اب دوہری معافی کی طالب ہوں"

یہ تو معمولی بات ہے محترمہ"

رات کے وقت سوتے میں سے کسی کو جگانا پسند تو نہیں مگر مجھے لگا تھا آپ سو نہیں رہے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم نہیں اوپر کی پوری روشنی دروازے کے نیچے سے دکھائی دیتی تھی اس لیے سوچا آپ کو زحمت دی جا سکتی ہے اصل میں میں چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتی ہوں ——— حالانکہ بیماری سے پہلے میں ایسی نہ تھی"

"جی" بھلا میں کیا اور کہتا۔

یقین کیجئے میری چابی واقعی گم ہو چکی تھی اور سوائے آپ کو تکلیف دینے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تین منزل اتر کر جانا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا میں سارا دن چلتی رہی تھی۔

"چلتی رہیں تھیں" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی چلتے رہنا کوئی ایسی حیران کن بات تو نہیں" اس نے کہا۔

"نہیں" میں نے سوچا خاموش رہوں تب بھی وہ بولتی چلی جائے گی

"حیران کن بات نہیں ہے کمال ہے صاحب یعنی کسی خاتون کا سارا دن چلتے رہنا آپ کو بالکل نارمل لگتا ہے" اس کی آواز غصے سے ذرا تیز ہو گئی تھی۔

جی چاہا فون بند کر دوں مگر پتہ نہیں کیوں میں منتظر رہا۔

"کمال ہے صاحب آپ سردی میں چلتے رہنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، چلتے رہنا میری مجبوری ہے۔ سائیٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا" وہ چپ ہو گئی جیسے کسی سوال کی راہ دیکھ رہی ہو مگر میں نے کچھ نہ پوچھا بھلا میں کسی کی زندگی میں نجی معاملے کی نوعیت بنا جانے بوجھے کیوں دریافت کروں۔ "اچھا صاحب شکریہ" اور فون بند ہو گیا۔

باہر کھلا کھلی ہوئی نیلاہٹ کی تہ تک اتر گئی تھی اور یہ تنی ہوئی چادر کبھی دودھیا لگنے لگتی اور کبھی کاجل کا سا سایہ اندھیرا اچانک ہی اندر گھس آتا پھر ذرا سی سفیدی ہوتی جیسے آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہو۔ میں نے وقت دیکھا چھ بج رہے تھے اگر میں اپنے گھر پر ہوتا تو دوستوں سے ملنے چلا جاتا سوچا دور پار کے ایک رشتہ دار ہیں یہاں ان کی خیریت دریافت کر دوں پھر میں نے بیرے کو بلا کر چائے کے لئے کہا اور باتصویر رسالہ دیکھنے لگا چاند اور فضا سے زمین کتنی خوبصورت لگتی تھی اپنے سمندروں اور صحراؤں سمیت بستے دریاؤں اور برف سے ڈھکے پہاڑوں والی گہری نیلی جیسے کسی لاڈلے بچے کی قیمتی گیند اور آدمی اپنے کو کتنا اہم جانتا ہے کائنات کا دل۔

فون کی گھنٹی بجی "صاحب کیا آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گے؟"

"میں چائے پی رہا ہوں"، میں نے یونہی کہا اس حیرت سے کہ اس عورت نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

"تو کیا میں آپ کے پاس آ جاؤں"، یہ سن کر میں بھلا کیا جواب دیتا شاید سہ پہر اس نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا اس نے سوچا ہوگا اور لوگوں کی طرح میں کوئی مہم جو ہوں اور جانے کیوں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تیز چلتی تصویروں کی ریل سی میرے دماغ میں چلی ہوئے سے بنا کچھ کہے میں نے فون رکھ دیا۔

حیرت سے میں سوچتا رہا اور پھر بڑے زور کی ہنسی آئی دوسرے سرے پر وہ خاتون میرے جواب کا انتظار کر رہی ہوگی۔

دروازہ کسی نے دھکیلا میں عین ہنسی کے درمیان پکڑا گیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹائے بنا وہ چلی آئی تھی "کیوں جناب آپ یوں خواتین کی بے عزتی کرتے ہیں"۔ اور دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مگر خاتون میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا میں تو آپ کو جانتا تک نہیں"۔

"تو اس کے لئے لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے میرا نام ایڈا ہے میرا مطلب ہے میرے

دوست ملنے والے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں حالانکہ میں عادلہ ہوں پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی

آپ غالباً سگریٹ نہیں پیتے ۔

"مجھے اس کی بُو ناگوار لگتی ہے "۔

"ناگوار لگتی ہے تو پھر آپ کی اور ہماری دوستی کیسے چلے گی میں تو بہت پیتی ہوں ۔

چین سموکر ہوں "۔

مجھے لگا میرا سانس رک جائے گا کبھی آپ لوگ ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں ۔

"آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے ، اور یہ آپ کا رنگ کیوں اترا جا رہا ہے کسی اجنبی خاتون سے کبھی

بات کرنے کا موقع نہیں ملا "۔

میں معمول کی طرح بیٹھ گیا اس نے گھنٹی بجا کر خود ہی بیرے کو بلایا ، تازہ چائے کا آرڈر دیا ۔

مجھے لگا بیرہ زیر لب مسکرا رہا تھا ۔ "ہاں سنو" اس نے بیرے سے کہا "سگریٹ کا ایک

پیکٹ بھی لیتے آنا "۔

"سگریٹ نہیں پیتے آپ کمال ہے بھئی کمال ہے ۔ مگر آپ مجھے یہاں برداشت کریں گے تو

آپ کو اس کی بُو بھی برداشت کرنا ہو گی "۔

"اچھا آپ ابھی بچپنے کی حدوں سے نہیں نکلے با تصویر رسالوں سے دل بہلاتے ہیں" ، اس

نے رسالہ اٹھا لیا زمین کس قدر خوب صورت ہے مگر چاند سے ہی ایسی دکھائی دیتی ہے کیوں اتنی

دور سے اس کی گندگی اس کی بدصورتی اس کی خرابی اور اس کے اندر جلے ہوئے دلوں کی بُو کوئی شے

بھی تو اوپر تک نہیں پہنچتی ۔

"کیوں صاحب ؟ " اس نے میری طرف دیکھا وحشت سے بھری آنکھیں بکھری بکھری سی عورت

معمولی کپڑے پہنے سلیقے سے بال سنوارے ، اس بے چین کرنے والی خوشبو سے میرا کمرہ بھر گیا ۔

"اصل میں چائے تو مجھے آپ کو پلانا چاہیئے تھی " ۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی ۔

"کوئی بات نہیں "۔

"شکر ہے آپ بولے تو سہی" اس نے اپنے پنچ رنگی دوپٹے کو بازو سے گلے میں ڈالا میں اس کے سامنے سکول کا بچہ لگ رہا تھا۔

"کبھی آپ اپنا تعارف تو کروایئے نا" میں نے اپنا نام پتہ بتایا۔ ارے صاحب آپ کے محکمے کو سخت پبلسٹی کی ضرورت ہے نیا بلکہ بالکل ایک دم نیا محکمہ ہے نا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ عوام کو کوئی فائدہ پہنچے تو اسے فوراً پبلسٹی کرنا چاہیئے اور وہ اس کی اہمیت پر تقریر کرتی رہی یہاں تک کہ چائے آگئی۔ جب وہ کمرے سے نکلی ہے تو دھوئیں کا سفید غبار بھی اس کے پیچھے نکلا میرا دم گھٹ رہا تھا میں نے پردے کھول کر کھڑکیاں بھی کھول دیں۔ رات بیتابی سے اندر گھس آئی جیسے وہ سیاہ بلی ہو جو بہت دیر سے بارش میں بھیگ رہی تھی۔

اُس بُو کی وجہ سے جو چھت کے پاس میرے ارد گرد ہر جگہ تھی مجھے نیند ہی نہیں آئی۔ چابی گم ہونے کا ڈرامہ دہرایا گیا، مگر چند راتیں بعد سیڑھیوں پر بہت زور زور سے چڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

" ایڈا میں تمہارا یہ سارا کباڑ اٹھا کر اب اور آگے نہیں جا سکتا بھئی یہ سیڑھیوں پر رکھ رہا ہوں۔"

"تمہاری یہ مجال" لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی "سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد اب لوٹی ہوں تم ہی لوگوں کے لیے گھومتی ہوں اور تم اسے کباڑ کہتے ہو۔"

"اتنا تو تم سے ہو نہیں سکتا کہ چار گھڑی اپنے کمرے میں بٹھاؤ۔"

تو یہ میرا مقدر تھا کہ میں ایڈا کی رات کی آخری گفتگو کا شاہد بنتا رہوں۔ پتہ نہیں پھر کیا ہوا چیزیں جیسے سیڑھیوں سے نیچے گرنا شروع ہوئیں کمروں کے دروازے کھلے اور پھر بند ہوئے۔ خاموشی چھا گئی اور پھر دروازہ بجایا گیا۔

"ذرا چابی کے لیے نیچے فون کر دیجئے گا۔"

میں نے کچھ کہے بنا فون کر دیا۔ اگلے دن چائے پر ملاقات ہوئی نہ اس نے معذرت

کی نہ میں نے اس سے یہ توقع لگائی تھی آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ "چائے پلایئے صاحب"،
میں نے بنا بات کئے چائے بنا دی۔

"میں زندگی سے تھک گئی ہوں عاجز آگئی ہوں مگر زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو پتہ ہو کہ میں نے کیا کچھ کیا ہے کن چکروں سے نکلی ہوں تو آپ مجھ سے ہمدردی کریں مگر بخدا میں تو دنیا سے یہ آس لگائے نہیں جی رہی بیکار لوگوں سے یونہی امیدیں وابستہ نہیں کئے ہوں۔"

پھر خاموشی کا وقفہ لمبا ہوتا گیا۔ مجھے لگا جیسے اُسے نیند آگئی ہو۔ ایک دم آنکھیں کھول کر کہنے لگی۔

"اچھا چلو مجھے گولی مارو، یہ بتائیں آپ نے اپنے محکمے کی پبلسٹی کے لئے کیا کیا ہے۔ ارے بھائی نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ اتنا عمدہ محکمہ ہے کام نہ دھام ذرا ہاتھ پاؤں ہلاؤ تھوڑا زندگی میں دلچسپی لو، یوں کیوں بیٹھے ہو، مجھ سے جو ہو سکے گا میں تمہارے لئے کروں گی (ملاحظہ کیا فوراً آپ سے تم پر اتر آئی) تمہیں پتہ ہے میرے اتنے عمدہ جاننے والے لوگ ہیں ان سے کہہ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے لیے اشتہارات دلوا سکتی ہوں مگر تم منہ سے کچھ بولو۔"

میں نے اب بھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے سطے یہ پایا کہ جس دن مجھے چھٹی ہو اس کے ایک جاننے والے کےہاں چلا جائے

عام طور پر اتوار کو جاگ ذرا دیر میں ہوتی ہے۔ اخبار دیر میں آتا ہے چائے دیر میں پی جاتی ہے لوگ شیو نہیں کرتے دھوپ اگر ہو تو اس میں سستاتے ہیں مگر پروگرام کے مطابق جلد اٹھا شیو کی کپڑے بدلے اور ذرا سی خوشبو لگائی دس بجے تک اس کی راہ دیکھی۔ دھوپ بڑی جان بخش اور کھلی ہوئی تھی میں نے کھڑکی کھول کر گردن نکال کر ادھر ادھر جھانکا پرلی طرف ذرا پرے کھڑکی کے نکلے ہوئے حصے پر اپنا چہرہ ٹکائے وہ خاموش کھڑی تھی کھلے ہوئے بال شانوں سے نیچے لٹکے ہوئے اور اتنی دوری سے بھی ان کی سفیدی مجھے دکھائی دے

گئی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ یہ عورت جو شور اور مصروفیت سے اپنے گرد قلعہ بنائے تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا سراپا اتنا اداس کر گیا۔ اس نے گردن پھرا کر مجھے دیکھا مگر اس کی نگاہوں میں کوئی پہچان نہ تھی خفگی کے مارے میرا برا حال ہو گیا اور میں لفٹ کا انتظار کیے بنا سیڑھیاں اُتر گیا۔ بس میں سوار ہو کر اس کے روٹ ختم ہونے کی جگہ تک گیا وہاں کھیت تھے اور سرسوں کی پیلاہٹ دور تک پھیلے آسمان سے کہیں ملتی تھی میں نے کسانوں سے باتیں کیں ایک کنوئیں کی منڈیر پر گھنٹوں بیٹھا رہا چلتے ہوئے رہٹ میں بہتے ٹھنڈے میٹھے چمکیلے پانی کے دھارے کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے دُور کے رشتہ داروں کے ہاں بھی گیا زور زور سے ہنستا رہا ہم مل کر گاتے رہے رشتہ کی بہنوں سے میں نے خوب مذاق کیے آنکھ مچولی کھیلی آئس کریم کھائی پتہ نہیں میں اندر سے اداس کیوں تھا۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی کہاں چلے گئے تھے،" وہ مجھے لفٹ میں مل گئی۔ میں نے حیرت سے اس دبلی سانولی اور بے تحاشا سگریٹ پینے والی عورت کو دیکھا۔

"صبح جب تیار ہو کر نکلی ہوں تو آپ کہاں تھے بھئی کہاں تھے تم،" لفٹ بوائے نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس میں حیرت تھی۔

"دس بجے تیار ہو کر جب میں نے جھانکا ہے تو آپ کھڑکی میں کھڑی تھیں اور آپ نے مجھے دیکھا بھی تھا اس وقت تک تو جانے کے کوئی آثار تھے نہیں میں نے شکایتاً کہا "تم کتنے ملتے ہو عاصم سے میرے بھائی سے وہ بھی ذرا ذرا سی بات پہ خفا ہو جایا کرتے تھے لفٹ رکی ہم اترے وہ میرے کمرے کے سامنے رک گئی "بخدا تم نے کتنا اچھا چانس کھو دیا ہے اور ان کا فون آیا تھا کہ عاصم کو نہیں لائیں۔" "عاصم کون عاصم،" میں نے پوچھا "میں نے انہیں کہا ہے کہ تم عاصم ہو اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے تم یوں بھی مجھ سے چھوٹے ہو" اس نے میرے کاندھے پہ ہاتھ مار کر کہا "بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" "ہو سکتا ہے ہو کیوں نہیں سکتا،" میں نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے کہا، "تمہیں پتہ ہے میری نظر کمزور ہے،"

"دور کی   اور بہت قریب کی بھی" وہ وہاں میرے کمرے کے سامنے کھڑی تھی

جیسے اس کا وہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہ ہو ساری رات ہم تاش کھیلتے رہے اس نے مجھے بہت سی کھیلیں سکھائیں، دھوکے سے جیتنے کے داؤ پیچ پتے چھپانے کے طریقے وہ ہنستی تو ہنستی چلی جاتی، ایش ٹرے میں سگریٹوں کے ٹکڑوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ گیا میرے کمرے میں نیلے دھوئیں کے اوپر ہر شے دھندلی ہونی چاہیئے تھی نا مگر حیرت انگیز طور پر چیزیں واضح تھیں ساری چیزیں۔ دل کا آئینہ تک صاف تھا۔

مجھ میں کرید نہیں ہے از خود پتہ چل جائے ٹھیک ہے، ورنہ میں لوگوں سے الجھتا نہیں ان کی زندگی کے کونوں کھدروں میں جھانکنے کی میری عادت نہیں ایڈا سے میں نے خود کچھ نہیں پوچھا۔

"عاصم کو بھی تاش کی کوئی بازی سوائے رمی کے نہیں آتی تھی، وہ تمہاری طرح اناڑی ہے اور اپنے سے لاپرواہ لباس کے معاملے میں تم اس سے ذرا خوش ذوق ہو وہ یہاں ہوتا تو تم دونوں کی خوب بنتی، وہ یادوں کے کارواں کے پیچھے چلنے لگی، میں اور وہ خوب جھگڑتے تھے، اتنا لڑتے تھے ہر وقت ایک دوسرے کو شکست دینے کی فکر میں یہاں تک کہ کھانا کھانے اور پڑھنے لکھنے میں بھی اندر سے ہر وقت مقابلے کی فکر میں لگے رہتے اماں ایک کو اچھا کہیں تو دوسرا روٹھ جاتا ہر شے ہمارے لئے چیلنج تھی۔

"عام طور پر اوپر تلے کے بہن بھائیوں میں ایسا ہوتا ہی ہے"، میں نے یونہی کہا۔

ایک دم اُسے غصہ آگیا "اوپر تلے کے بہن بھائیوں میں اتنی شدت سے رقابت نہیں ہوتی ہم تو جڑواں بہن بھائیوں کی طرح تھے اسے بخار آتا تو مجھے بھی خواہش ہوتی کہ بیمار پڑ جاؤں۔ مجھے اس کے بنا ایک پل قرار نہیں آتا تھا۔ اماں عاجز تھیں کہتیں، "میری دعا ہے تمہارے درمیان آگ کا پہاڑ ہو تم جدا ہو جاؤ تو میں چین سے ہوں گی" اور پھر انہیں چین بھی آگیا۔ اس کی آنسوؤں سے خالی آنکھیں بڑی بے نور لگ رہی تھیں۔

جنگ ہوئی ہے تو وہ بھی بھرتی ہو گیا اُن دنوں لڑکوں کو تھوڑی تھوڑی ٹریننگ دے کر

محاذ پر بھیجا جا رہا تھا، انہیں فوراً کمیشن مل جاتا تھا، اسے بھی مل گیا لیفٹیننٹ کی وردی اس پر بہت سج رہی تھی۔ مجھے چڑانے کے لیے وہ گھڑی گھڑی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا اور سلیوٹ کرتا یہ فرق ہوتا ہے لڑکوں اور لڑکیوں میں،" جی چاہا چیخ چیخ کر رو دوں اس لئے نہیں کہ وہ جا رہا تھا اس لئے کہ میں وہاں نہ جا سکتی تھی۔

"عورتیں بھی تو فوج میں جا سکتی ہیں،" میں نے کہا۔

"کیا تم چپکے نہیں رہ سکتے" اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اگر میں جا سکتی تو چلی جاتی مگر ایسا نہ ہو سکا، وہ واپس نہیں آیا پتہ نہیں اسے زمین نگل گئی وہ قید کر لیا گیا یا کیا ہوا ہم لوگ منتظر ہیں اور رہیں گے لمبی فہرستوں میں مرنے والوں میں گم ہونے والوں میں کہیں اس کا نام نہ تھا۔

بیرے نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا "آپ کے ملنے والے کچھ لوگ آئے ہیں۔"

"ابھی آتی ہوں،" وہ اپنی سگریٹ کا پیکٹ بھی چھوڑ گئی۔ جانے کون ہو۔

رات کے اندھیرے میں لمبے گھنٹے ایک کے بعد ایک بجتے رہے کھانا کھا کر میں لیٹ گیا اور دھوئیں سے بھرے اس کمرے میں خوب گہری نیند سویا۔

سرکاری مکانوں میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں، باورچی خانے کا مسئلہ اس کو صاف ستھرا رکھنے کا مسئلہ نوکروں سے نمٹنے کا مسئلہ اکیلے آدمی کی جان کو یہ روگ بے وجہ کی مصروفیت بن کر لگتے ہیں اور ان سے بچنے کے لئے میں نے وہیں ہوٹل سے ذرا بہتر کمرے میں نقل مکانی کر لی اپنے حالوں زندگی رواں ہو گئی کام بھی بڑھ گیا تھا اور پھر میں کچھ لکھنے پڑھنے میں بھی لگا رہتا تھا سردی بڑھی اور دن ذرا ذرا سے ہو گئے صبح ہوتی اور شام کو آ لیتی، شامیں میں اکثر کمرے میں گزارتا۔ محکمے کے لوگ ادھر ادھر سے چند لکھنے لکھانے والے دوست بن گئے تھے وہ جمع ہو جاتے اور دلچسپ بحثیں ہوتیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں لگا تھا تر جمے ہو رہے تھے سیاست ہے مذہب ہے اپنا دکھ ہے پرایا غم ہے۔ جب جوانی ہوتی ہے تو کتنا جوش ہوتا ہے۔ کبھی کبھار یہ سب چھوڑ کر ہم کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے۔

نئے سال کی شب آئی میرا ارادہ تھا کہ گھر جاؤں گا بہن بھائیوں سے ملوں گا مگر دوستوں نے جانے نہیں دیا، ہمیشہ تو تم گھر والوں کے ساتھ ہوتے ہو ایک یہاں رہو ہم تمہیں کسی سے ملوائیں گے نئے سال کا تحفہ سمجھ لینا اس دعوت کو ان کے ہاں بڑی زبردست شب منائی جاتی ہے، کتنے ہی نئے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں، سارا شہر الٹ پڑتا ہے، تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔

یہ ایک گالا نائٹ تھی، یوں تو میں نے ناچ رنگ شراب ہنسی سبھی کچھ دیکھا ہے مگر اس گھر میں ہولی کے رنگوں سے بڑھ کر رنگ تھے صورتوں پر گلال بکھرا ہوا جیسے فن کار کی لگن سے اس نے حسن جمع کیا تھا جانے کہاں سے سینت سینت کر رکھی مورتیوں کو لا سجایا تھا، بہتے ہوئے بدن، اپنی دلآویزی سے نشہ دلاتے ہوئے مخطوط والی عورتیں کنواریاں جو جھیل سی آنکھیں چہرے پر سجائے تھیں، بیاہتا حسن کی کشش کے سامنے فرشتے بھی پگھل جائیں، بے خبر ہرنیوں کی طرح اپنے آپ سے گھبرائی ہوئی لڑکیاں تنکاری نازنینیں، بے سُدھ کرنے والی ناگنیں۔ اپنے بھولپن سے جادو جگاتی الھڑ دوشیزائیں بچپن اور جوانی کی حدوں پر کھڑی کنواریاں، کھائی کھیلی ترنگ میں آئی عورتیں، اپنے آپ کو سنبھال کر چلنے والیاں شرمائی لجائی، کونوں میں چھپتی مدھ ماتی اداؤں والیاں اور ہر ایرے غیرے کے بازو میں بازو ڈال کر اپنے آپ پر یقین رکھتے اور کسی سے بھی نہ ڈرنے والی بے اختیار جام پہ جام لنڈھانے والیاں، سب طرح کا جمگھٹا تھا۔

"اپنے آپ کو اس مجمع میں گم کر دو" میرے دوست نے کہا اور پھر مجھے ایک کونے میں کھڑا کر کے وہ کہیں غائب ہو گیا۔

"سیکس کو کیا سمجھتے ہیں صاحب۔ مردوں کے دائرے میں گھری کسی عورت کی آواز آئی، "سب کچھ سب کچھ" اپنے جام ٹکرانے کے بعد انہوں نے کہا۔ چھت میں بتیاں ستاروں کی طرح جڑی تھیں کمرہ دھوئیں سے اندھا اور روشنی کے باوجود عجیب اداس اداس سا تھا۔ کسی نے جام میرے ہاتھ میں تھما دیا، پھر اسے بھر دیا اور میں کونے میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا، سینٹ، سانسوں، جسموں کی مختلف مہکیں ملی ہوئی تھیں عجیب بوجھل فضا تھی، جام چمک رہے تھے۔

لوگ مسلسل باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے، آرکسٹرا کوئی دُھن بجا رہا تھا جو بیک وقت نئی بھی اور پرانی بھی لہروں کی طرح بہا کر لے جانے والی ناچنے والوں کے جسموں سے یہ موجیں ٹکرا رہی تھیں۔ روشنیاں مدھم ہوتے ہوتے گم ہوتی لگتی تھیں۔

"تم پی کیوں نہیں رہے"، کسی نے میرے قریب آکر کہا " اکیلے ہو کیا ؟ اوہ عاصم تم ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہاں ملو گے۔ پیو"۔ "نہیں ایڈا میں نہیں پیتا !" میں نے بھرے ہوئے جام کو پرے دھکیل دیا۔

"سنو پیو ہو سکتا ہے یہ شب لوٹ کر نہ آئے۔ کچھ بھی لوٹ کر نہیں آتا زندگی پلوں کے نیچے سے تیزی سے بہنے والے پانی کی طرح ہے اور دیکھو سُرخ شراب میں نرمی اور گھلاوٹ ہوتی ہے"، اس نے اپنا جام خالی کر دیا۔

"یہ سیال جب رگوں میں اترتا ہے تو لگتا ہے تم قدیم یونانی دیوتاؤں کی شراب پی رہے ہو"۔

"میں تمہارے علم کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہوں"۔

"نہیں تم صرف میرا مذاق اڑا رہے ہو سبھی میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے مجھ پہ ہنستے ہیں اور میں سب کا مذاق اڑاتی ہوں۔ خدا کا اور انسانوں کا تمہیں میری ہمت کا کیا اندازہ ہے"۔

"میں غلط اندازے لگانے کا ماہر ہوں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا"۔

"شرابوں کے متعلق میرا علم اتنا مکمل ہے کہ تمہیں حیرت ہو گی"۔

"اب مجھے کوئی شے حیران نہیں کر سکتی۔ تمہارے گم ہو جانے کے بعد سے نہیں"۔

سر پیچھے ڈال کر وہ ہنستی رہی یوں جیسے کوئی چیخوں کو روکنے کی کوشش میں لگا ہو۔ شاید وہ نشے میں تھی۔

"میں ساری رات پی سکتی ہوں اور نشہ مجھے نہیں ہو سکتا میں نشے کو ہو جاتی ہوں"۔

"ایسا ہونا ممکن ہے"، میں نے سر جھکا کر کہا۔

تمہاری باتیں بہت کھوکھلی ہیں جیسے اندر گرہیں ہی گرہیں ہوں گھٹن ہی گھٹن ہو۔"

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ پورا چاند بالکل اکیلا اپنے زرد ہالے میں سے نیچے زمین کی طرف جھانک رہا تھا ہوا میں باس تھی پھولوں کی رات کی رانی کی پیوندی گلابوں کی۔

صاحب خانہ کے ساتھ وہ پھر میری طرف آئی۔

میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھے بنا کہا "باغ بہت خوبصورت ہے۔"

ایڈا ہمیشہ خوب صورت لوگوں کو اپنا دوست بناتی ہے جو اچھی چیزوں کی تعریف کر سکیں اُسے سمجھنے کا سلیقہ اور ذوق رکھتے ہوں مگر مجھے افسوس ہے آپ پیتے نہیں ہیں، پتہ نہیں کیوں اگر برا نہ مانیں تو ذراسی چکھ لیں۔ آج جاتے سال کی آخری رات ہے۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو میں اسے سنبھال لوں گی۔" ایڈا میرے برابر کھڑی ہو گئی میزبان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت چاہی۔

تم بولتے نہیں ہو کیا خفا ہو"۔ اس نے خاموشی توڑنے کے لئے یونہی بات کرنے کے لیے کہا۔

"نہیں میں تو تمہیں جانتا تک نہیں،" میں خفا ہونے کا حق نہیں رکھتا میں سوچ رہا تھا چلو اچھا ہوا اس اجنبی رات میں اجنبی جگہ میں وہ مجھے مل تو گئی۔

"تمہاری خاموشی اور ایسی باتیں میرے اندر ہلچل سی مچا دیتی ہیں۔ سوال کرنا تو جیسے تم جانتے ہی نہ ہو اور تمہاری یہی ادا مجھے دیوانہ بنا گئی ہے۔" وہ میری طرف جھکی ہے تو مجھے واقعی دیوانی لگی۔

"پی لو ذراسی ہی سہی میری خاطر" اس نے ہاتھ میں پکڑا جام میری طرف بڑھایا۔

میری طبیعت اتنی بوجھل ہو گئی تھی ایک دم کہ میں اس کا ہاتھ پرے نہیں ہٹا سکا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔

"بے بی پی لو نا ایک گھونٹ ہی سہی،" وہ اور جھکی۔

"شٹ اپ" میں نے زور سے تقریباً چیخ کر کہا۔
ہاتھ ہٹا کر وہ بہت سنجیدگی سے میری طرف دیکھنے لگی اچھا تو تم بول بھی سکتے ہو بخدا مجھے اپنی بے عزتی گوارا ہے، مگر تمہارا یہ گونگا، بہرا پن تو دُور ہُوا۔

"ایڈا تم ایسی کیوں ہو"، میں بدستور کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں صدیوں پرانا یا نجانے کب کے بنے آسمان تلے کیڑوں کی طرح کلبلاتے اور اپنے کو خوش کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کرتے ہوئے انسانوں کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔

آؤ کہیں بیٹھ جائیں پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں ایسی کیوں ہوں، مجھے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بھلا میں کوئی دوسروں سے الگ ہوں، تم میرے معمولی لباس کی وجہ سے جس کی مجھے پرواہ نہیں ہے سمجھتے ہو کہ میں ضرورت سے زیادہ بہکتی ہوں، نہایت بیباک ہوں جس طرح جی چاہے گفتگو کرتی ہوں اور مجھے آئندہ کا خیال نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں، یہی باتیں ہیں نا؟"

میں اتنے بہت سے سوال نہیں پوچھنا چاہتا میں تو صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے مجھے اپنے مزاح کا نشانہ کیوں بنا رکھا ہے؟" او بے بی کم ان تم کو پتہ ہے میں تمہیں عاصم کی طرح سمجھتی ہوں آؤ۔" اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف بیٹھنے کے لیئے کسی جگہ کی تلاش میں چلی۔

"میں بھاگ نہیں جاؤں گا، بس میرا ہاتھ چھوڑ دو"،

"ایڈا۔ ایڈا"، کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں ادپر آؤ ہمارے ساتھ نیا سال مبارک ہو۔ نیا سال تمہارے لیے خوشیاں لائے، دور کہیں شور کے اوپر سے گھنٹیوں کی صدا آئی جام ٹکرائے سنہری سیال سے بھرے ہوئے شیشے اٹھے صراحیاں لڑھکیں بھلا نیا سال ان کے لیے کیا لانے والا ہے کون بتا سکتا تھا؟

لوگ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے اور پرانا سال زخم خوردہ سپاہی کی طرح وقت کے مورچے میں بے ہوش گر گیا تھا۔ ہنستے ہوئے مدہوش آدمی ساڑھیوں کے گھسٹتے پلوؤں کو سنوارنے کی ادھوری کوشش میں عورتیں، اندر بے پناہ گھٹن تھی، سٹیج پر لڑکھڑاتی لکنت بھری آواز

میں کچھ کہہ رہا تھا پھر پردہ اٹھا اور گھنگروؤں کی تال پر سہج سہج ہلکورے لیتی کشتی کی طرح ایک لڑکی صبح نو کی خوش خبری بنی سامنے آئی۔ میں باہر نکل آیا "تم جا کیوں رہے ہو ٹھہر جاؤ نا میں معروف ہوں رانا اناؤنسمنٹ کے لئے کسی سے کہہ دوں۔"

میں ٹھہرنا نہیں چاہتا، مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ دوست جن کے ساتھ میں آیا تھا اس مجمع میں گم تھے اور سواری کا مسئلہ بہرحال تھا یہ جگہ ہوٹل سے تقریباً پانچ میل تو تھی سردی کا شباب تھا اور چاندنی کے باوجود سڑک پر بکھرے سایوں سے اکیلا آدمی خوفزدہ ہوتا ہی ہے۔

ہوا میں خنکی اسے رہ رہ کر کانپتے دیکھ رہی تھی، وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اور پھڑپھڑاتے پلو کو اپنے گرد لپیٹنے میں لگی تھی۔ اس کے بازو بہت ہی کمزور تھے جسم کے خطوط دلآویز بھی نہیں تھے اور ادھورے جیسے کھینچنے والے نے انہیں مکمل نہ کیا ہو مصور نے پہلے اسے ایک اچھوتا خیال سمجھ کر بنانا شروع کیا اور پھر یوں ہی چھوڑ دیا، تنہائی اور رنگوں کے اس پس منظر میں وہ مجھے بہت مبہم لگی، مٹتی ہوئی بے رنگ سی۔ پہلے تو تم یہ جاننا چاہو گے کہ میں ہوٹل سے بنا تمہیں بتائے کیوں آگئی تھی! مجھے کسی سے کہنے سننے کا وقت ہی نہیں ملا، اماں آئیں اور بس گھیر گھار کر مجھے لے گئیں پھر ہنس کر کہنے لگی ہوٹل کا بل ادا کرنے کا بھی مسئلہ تھا۔ انہوں نے وہ بھی دیا تمہیں معلوم ہے اگر وہ نہ آتیں تو میں تم سے مدد کرنے کو کہتی سولہ سو روپیہ تو کجا میرے پاس تو کبھی سولہ روپے بھی نہیں رہے ہتھیلی میں سوراخ ہے جو آتا ہے خرچ کر دیتی ہوں جو کماتی ہوں اڑا دیتی ہوں جوئے بازوں کی سی فطرت ہے میری۔ اس نے سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا میں اندر سے کانپ گیا بخدا اگر وہ کہتی تو میں مجبور ہو جاتا۔ اب تک مجھے ایک ذرا سی بات کا بھی پتہ نہیں تھا اور اس کے باوجود بھی میں اُس کا حکم ماننے کے علاوہ اور کیا کر سکتا۔ وہ میرے لئے بنا چہرے کے ایک ہیولے کی طرح تھی جو سایوں سے نکل کر ساری جمی جمائی زندگی میں کھنڈت مچادے۔

اندر سے کسی نے پکارا، "ایڈا۔ ایڈا بھئی کہاں ہو تم۔" آواز پھٹی پھٹی اور کھردری تھی۔

"یہاں ہوں" اس نے ستون کے ساتھ لگے لگے جواب دیا پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی۔

بے بی لوگ تم کو اور مجھ کو اکٹھے دیکھ نہیں سکتے۔ جانے کیا سوچتے ہیں۔ اچھا سو لونگ میں چلوں وہ ڈرنکس کے لیے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور تم تو پیتے بھی نہیں ہو۔" تھوڑی دور گئی مڑ کر آئی اور کہنے لگی "میں کل آؤں گی اور تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔ تمہارے ذلیل ہوٹل میں نہیں کہیں باہر چلیں گے، کہیں نیم تاریک خاموش سے ریسٹوران میں تصویروں کی ایک نمائش ہو رہی ہے وہ بھی دکھاؤں گی تمہیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے تم اس شہر میں نو وارد ہو اور تمہارے ساتھ میں نے نہایت سرد مہری کا سلوک کیا ہے۔" اور وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کہیں دُور گھڑیال نے تین بجائے میں بڑے کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں صوفے پر نیم خوابیدہ تھا جب دوستوں نے مجھے ڈھونڈا اور ہم واپس ہوئے۔

تصویروں کی نمائش سردیوں کی نیم گرم سہ پہر میں اچھی لگی۔ وہ مجھے لینے آئی تھی۔ دفتر سے لوٹا ہوں تورات کے واقعہ کو بدخوابی سمجھ کر تقریباً بھول چکا تھا اور پھر اُس کا آنا پتہ نہیں کیوں مجھے ان ملاقاتوں میں لگنے لگا تھا کہ وہ جو کچھ ہے اس کے سوا دکھائی دیتی ہے۔ اس کی شخصیت میں کوئی رخنہ ہے کہیں کوئی کمی ہے یا پھر زیادتی لوگ اسے پسند کرتے ہیں اس کے باوجود وہ پُراسرار سی ہے۔ بھولے ہوئے گیت کی کوئی دھن سیٹی کی طرح بجاتے ہوئے جب میں کمرے میں گھسا ہوں تو وہ پلنگ پر دراز تھی۔ میں دروازے میں پتھر بن کر کھڑا رہ گیا۔

"بے بی" اُس نے کمبل سر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "میں صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ رخشندہ کے ہاں سے میں گھر نہیں گئی یہاں آگئی۔ کمرہ صاف ہو رہا تھا میں نے اسے باہر نکال دیا رات کی تھکن کو کہیں تو اتارنا تھا نا" مزے میں خرخر کرتی بلی کی طرح اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جی چاہا دیوار سے سر پھوڑ لوں وہ مجھے کیا سمجھتی ہے۔ خدائی خوار لوفر پیشہ ور عاشق اس کی اداؤں پہ ریجھ جانے والا اس پر نہیں اپنے پر غصہ آیا۔ غصے کے مارے مجھ سے ایک لفظ نہیں بولا گیا۔ اس نے پھر آنکھ کی جھری میں سے مجھے دیکھا۔ بھئی کھڑے کیا کر رہے ہو، جلدی

سے منہ دھولو کپڑے بدلو تو ٹھیک ہے ورنہ یہی چلیں گے کوئی بڑے نہیں ہیں اچھے سمارٹ لگ رہے ہو۔

میں نے غسل خانے کے آئینے میں جا کر اپنی شکل دیکھی کیا میں اتنا بیوقوف لگتا ہوں، وہیں تپائی پر بیٹھ کر بوٹ کھولے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس حرکت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے اس کے متعلق کچھ سوچنا بھی ناممکن تھا۔ بیرہ کیا کہے گا، ہوٹل کے باقی لوگ کیا کہیں گے۔

"کیوں بھئی کیا خواب دیکھنے لگے ہو نمائش میں جانے کا ارادہ نہیں کیا" اس کی سوئی ہوئی آواز سنائی دی، ایک دم جاگ کر جیسے میں نے سوچا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فوراً باہر چلا جائے، باہر جا کر میں اسے اس حرکت پر برا بھلا کہہ سکتا ہوں، اپنی شہرت صدہا اور باتیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

"عجیب لڑکے ہو تمہارے پاس روز نہیں ہے کوئی ڈھنگ کی خوشبو نہیں ہے، اب کبھی میرے پاس پیسے ہوئے تو یہ سب چیزیں تمہیں تحفتاً دوں گی مجھے دوستوں کو تحفے دینا بہت اچھا لگتا ہے، اور پھر تم"۔

باتیں کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا میں نے آنکھیں جھکا لیں بوٹ ٹھیک کرنے لگا اور اس نے جلد جلد بالوں میں اوپر سے کنگھی کر کے پرس پکڑا۔ بے بی یہ پرس تو خالی ہے اس نے اسے دوبارہ میرے پلنگ پر پھینک دیا۔

"خالی ہونے کی کوئی بات نہیں تم اسے لیتی چلو" میں نے پرس اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا۔

بادل نخواستہ اس نے اسے پکڑ لیا ہم باہر نکلے۔

ٹیکسی میں بھی میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اصل میں حیرت کے مارے اور کچھ سوچا ہی نہ جا سکتا تھا لگتا تھا مجھ پر سکتہ ہو گیا ہے۔ میں نے یہ امید کبھی نہیں کی تھی کہ میری ذرا سی بزدلی اس کی اتنی جسارت کا سبب بن جائے گی، یہ پیشہ ور کال گرلز کے طریقے ہوئے بلکہ

اس سے بھی کمتر جیسے وہ جال کو میرے گرد تنگ کھینچ رہی ہو مجھے پھنسانا چاہتی ہو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہو۔ میں کوئی رئیس زادہ نہ تھا، تنخواہ تھی جس کا بیشتر حصہ گھر بھجوا دیتا تھا میری ذمہ داریاں تھیں بہن بھائی تھے اماں تھیں میرے لیے انہوں نے بہت دکھ اٹھائے تھے اس جگہ پہنچانے میں ان کا حصہ تھا انہوں نے ہی مجھے وہ بنایا تھا جو میں ہوں، رنگوں اور شکلوں کے اس میلے میں پہلی بار مجھے اپنے کم علم ہونے کا احساس ہوا لوگ نہایت سنجیدگی سے برو شر لئے تصویروں کو دھیان سے دیکھ رہے تھے، ان کے مطلب سمجھنے لگے تھے، تجریدی آرٹ یوں بھی کبھی پلے نہیں پڑا، اس کی باریکیاں میں کہاں جان سکتا ہوں۔

ہیلو ہیلو بہت سی آوازیں ایک ساتھ آئیں تمہیں بھی نمائش دیکھنے کی فرصت مل گئی ہے! وہ دوستوں کے نرغے میں تھی۔ جان پہچان والے لوگوں کے درمیان میں الگ سے ان لمبی گیلریوں اور راہداریوں میں پھرنے لگا۔

بولتی ہوئی تصویروں تمہارے آر پار دیکھتی ہوئی نگاہوں چپ چاپ اور بہت کچھ کہتی آنکھوں کا بازار سجا ہوا تھا، عجیب وغریب اور بے حد معمولی احتیاط سے استعمال کئے ہوئے اور بہائے ہوئے رنگ، اندھیرے کا احساس دلاتی ہوئی روشنیاں اور روشنیوں کا نشان بتاتے ہوئے اندھیرے۔

"ادھر آؤ میں تمہیں ایک تصویر دکھاؤں جو زمانوں سے اس نمائش میں سجتی ہے اور پھر اتار کر رکھ لی جاتی ہے" وہ میرے برابر چل رہی تھی۔

"اس تصویر میں کوئی خاص بات ہے کیا کوئی راز؟" میں آگے چلنے کی کوشش کر رہا تھا، اس سے علیحدہ ہونے کی۔ پتہ نہیں وہ کب تک اپنے آپ کو مجھ پر مسلط رکھے۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"بے بی آخر بھاگ کیوں رہے ہو کیا تمہیں اس تصویر میں دلچسپی نہیں ہے؟

میں اس کے برابر چلنے لگا، ساری ان کہی باتیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں۔

یہ ایک جوان ہوتے لڑکے کی شبیہ تھی، مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں لگی یا پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا وہ خاموش چپ چاپ عبادت کرنے والوں کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے کھڑی رہی پھر اگلی تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ دیر تک گیلری میں گھومتا رہا۔ سوچا آنکھ بچا کر نکل جاؤں پھر باہر برآمدے میں رک گیا میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے سیاہ دھوئیں کی چادروں کی طرح ایسا اندھیرا پھیلا تھا جو خوشی میں دل کے اندر روشنی کردے۔ جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں اور سردی میں سڑک پہ ہوا کے رخ ہوا کے ساتھ اڑنے لگوں مگر ہم ٹیکسی میں بیٹھے تھے وہ میرے برابر پچھلی سیٹ پہ بالکل خاموش تھی۔

"کہاں جانا ہے" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی"۔

"آخر کہیں تو! ٹیکسی والے سے کیا کہوں!" مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

"کسی ریسٹوران میں جہاں چائے مل سکے کھانا مل سکے اور خاموشی ہو، کچھ کھائے ہوئے تقریباً چھتیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔" وہ پھر مراقبے میں چلی گئی، بنا کچھ کہے جیسے میرے وجود سے بے خبر ہو، وہ کھانا کھاتی رہی آہستگی سے، یادوں میں کھوئی ہوئی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی دنیا کو بھولی ہوئی میں کیا اس کا محافظ تھا؟

تم چائے تو پی سکتے ہو میں نے اپنے آپ سے کہا آخر اس قدر گھمبیرتا کی کیا ضرورت ہے یہ ایسا سانحہ ہے جس پر بعد میں اور لوگوں کے ساتھ تم ہنسو گے بلکہ اب بھی ہنس سکتے ہو اور میں ہنسنے لگا۔

"بڑی بات پڑھوں پر نہیں ہنستے۔" اس نے آنکھیں اٹھائے بنا کہا چائے پی لو پھر مجھے گھر پہنچا آنا اور تم اپنے ہوٹل جا سکتے ہو۔

باہر نکلے ہیں تو سیاہ رات نے اور سردی نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا "بے بی مجھے اپنا کوٹ دے دو۔" میں جتنا چڑتا تھا وہ مجھے چڑاتی تھی، اس لئے اس

کے بے پی کہنے پر میں نے احتجاج کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بہت دیر ہم یونہی سڑکوں پر چلتے رہے کئی موٹریں ہمارے پاس سے گزر گئیں ٹیکسیاں زن سے نکلتی چلی جاتیں میرے دانت بج رہے تھے بغلوں میں ہاتھ دیئے میں اپنے کو کوس رہا تھا کس مخمصے میں پڑ گیا تھا میں۔

"اوہ اوہ جوتا کاٹ رہا ہے" اس نے پاؤں کو ٹانا شروع کیا عین سڑک کے درمیان بیٹھ گئی۔

خدایا میں نے سوچا اب کیا ہوگا "تم جاؤ بے پی میں اب اور نہیں چل سکتی مجھ سے نہیں چلا جاتا" یہ عورت جو کہتی تھی کہ پیدل چلنا اس کی مجبوری ہے، سارا دن سائٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔

ہوٹل اب نزدیک تھا تقریباً ایک فرلانگ پرے وہ سارا بوجھ میرے کندھے پر ڈالے تھی ناریوں کی طرح ہم قدم قدم رکتے ہوئے ہوئے فاصلہ طے کر رہے تھے۔

لفٹ میں وہ میرے ساتھ ہی سوار ہوگئی، کمرے کے دروازے پر میں نے کہا "اچھا خدا حافظ"

مگر مجھ سے پہلے وہ اندر تھی، "ایسی سرد رات میں تو کوئی کسی کتے کو بھی ایسے نہیں دھتکارتا اور تم مجھے خدا حافظ کہہ رہے ہو"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا لگا آنسو میری آنکھوں میں تیزی سے بھر رہے ہیں۔

غسل خانے سے باہر نکل کر اس نے کہا "تم بیچارے، مجھے تم پر ترس آتا ہے، مشرقی گھروں کے لڑکے بھی لڑکیوں کی طرح شرمیلے ہوتے ہیں"

"زمانوں سے میں نے کسی سے بات نہیں کی مطلب ہے اپنی اور شیر علی کی باتیں تم سننا پسند نہیں کرو گے کیا؟"

سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر وہ صوفے پر گھٹنوں کو سکیڑ کر لیٹ گئی مجھے روشنی کا سیدھا آنکھوں میں پڑنا سخت ناپسند ہے۔

مگر میں نے بتی اسی طرح جلنے دی۔

"ٹھیک ہے یہ تمہارا کمرہ ہے اور تم بتی جلائے رکھنے کا ہر حق رکھتے ہو تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"

بہت سی گالیاں سنی ہوئیں اور لاشعور میں بھولی بسری زبان پر آتے آتے رہ گئیں اس گھڑی مجھے لگا جو لوگ گالی دیتے ہیں ان کا صبر آزمایا جاتا ہوگا آخر کب تک۔

"کیسا عمدہ لگے سرد رات گرم کمرہ کافی کا بھاپ اڑاتا پیالہ خواب آگیں فضا ہو جائے" دانت پیستے ہوئے میں نے کافی کا آرڈر دیا مرنے والے کی طرح میں نے دل میں کہا، بیرہ جو بھی سوچے اُسے سوچنے دیا جائے اب کیا علاج ہو سکتا ہے یہ مصیبت بہرحال تو تھی۔

"ہاں تو شیر علی کی کیا کہانی ہے اصلی یا فرضی، میں کمبل لپیٹ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا رات گزارنے کے لئے اپنی طرف سے تیار ہو کر۔

"تم نے یہ کیوں کہا ہے" وہ لیٹے لیٹے ذرا سی آنکھ کھول کر بولی "جب تمہیں یقین ہی نہیں نہ میری ذات پر اور نہ ہی جو میں کہوں اُس پر تو پھر کیوں سنتے ہو۔"

رات گزارنے کے لئے اور کیا کیا جائے آخر" میں چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح بے عزتی سمجھ کر وہاں سے جائے۔

"وہ بس شیر علی تھا اور نہیں رہا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا زمین اسے نگل گئی یا آسمان نے اسے اٹھا لیا میرا منگیتر تھا وہ ——— پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی، آج جو تصویر تم نے دیکھی وہ اسی کی تھی۔

مگر اس کی پینٹنگ وہاں کیسے لگی ہوئی ہے۔ تمہارا پاس کیوں نہیں منگیتر تو وہ تمہارا تھا۔

" وہ بہت اچھا مصوّر تھا اور بہت بڑا،،

"تم ماضی کے صیغے میں کیوں بات کر رہی ہو لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں" اپنی بے یقینی سی میں میں نے پوچھا "کتنے عرصے کی بات ہے یہ"

دس سال ہو گئے ہیں۔ دس سال اور کچھ مہینے میں اس کے جانے کی تاریخ سے ایک ایک ساعت گنتی ہوں۔ اب آئے گا تو۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ آئے گا ہی کیوں کہیں کسی اور ملک میں کسی اور دیس میں کسی اور کے بازوؤں میں ہوگا اور میں یہاں برہن بنی اس کی یاد میں جی رہی ہوں کبھی کبھار دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں پھر موہوم سی آس مجھے پیچھے ہٹاتی ہے، میرے ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔"

سامنے لیٹی اس عورت کی صداقت اور استقامت اس کی بہادری یقیناً قابل تعریف تھی۔ میں نے بڑی عقیدت کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا احترام سے میرا سر جھک گیا۔

"وہ آخر کہاں جا سکتا تھا کہاں چلا گیا۔ تمہیں کچھ تو پتہ ہوگا۔"

"ایک دن میں اس کے سٹوڈیو گئی مل کر ہم پرانی کتابوں کی کھوج میں نکلنے والے تھے، اُسے نوادرات جمع کرنے کا خبط تھا، گاؤں میں پتہ چلا تھا کسی شخص کے پاس بزرگوں کا کتب خانہ ہے اور وہ اسے ضائع کر رہا ہے۔ بھلا پرانی عربی فارسی کی کتابیں نئے زمانے میں کس کام کی ہیں متروک ہوئے علوم کو کون پڑھتا ہے کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ بیٹھے اور انہیں کھنگالے حاصل کیا ہوتا ہے۔ میں یہ شوق بیکار سمجھتی تھی مگر کہہ نہ سکی تھی، اسے اور بھی بہت سے شوق تھے، عجیب و غریب لوگوں سے ملنا بڑی پُراسرار زندگی! اسی پراسراریت نے پہلے پہل مجھے اس کی طرف لگایا۔ بے بی میں نے اس کی پرستش کی تھی، ہر لحظہ وہ ایک نیا انسان ہوتا تھا۔ بے چین شعلے کی طرح تابناک اور بے حد خوبصورت۔ تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں، ایسی خواب لیتی اور پھر بھی جاگتی ہوئی مجھے کبھی کبھی لگتا جیسے میرے خواب مجسم ہو گئے ہوں۔

بہت دیر وہ چپ رہی سامنے پڑی کانی پہ ہوتے ہوتے جھلی سی آتی گئی رات اپنے گھنگروؤں اور سازوں سمیت ناچ کر تھکتی جاتی تھی۔

جب میں گئی ہوں تو وہ نہیں تھا۔ میں بیٹھی رہی اندر آتی دھوپ میں تصویروں کی آنکھیں مجھے اپنی طرف گھورتی لگتی تھیں، تھک کر میں نے اپنی پسند کے موسیقی کے ریکارڈ بجانے کے لئے گراموفون کا ڈھکنا سرکایا، نکھار رکھا تھا۔

" ایڈا میرا انتظار نہ کرنا، جانے اب کب ہماری ملاقات ہو اور ہو بھی کہ نہیں۔
میری خواہش ہے تم زندگی کے دل میں رسو بسو اور سکھی رہو۔"
اس نے آنکھیں بند کرلیں کمبل کو سر پر کھینچ لیا جیسے دنیا کے دروازے اپنے پر بند کر لیے ہوں۔

میں نے بتی بجھا دی اور بستر پہ چلا گیا، جاگتا اور سوچتا رہا کہ دل پتہ نہیں کیا شے ہے یہ ٹکڑا خدا نے آدمی کے سینے میں اسے بے پناہ اذیت دینے کے لیے آخر کیوں لگایا ہے؟
رات کے پچھلے پہر میری آنکھ ایک دم کھل گئی جیسے نیند کی چادر کو کسی نے کھینچ لیا ہو وہ میرے پہلو سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی "بے بی مجھے اکیلے سونے کی عادت نہیں" اس نے زیر لب کہا ذرا پرے ہٹو تھوڑی سی جگہ دو، میں تڑپ کر اٹھا تو بجلی کی سی تیزی سے اس نے مجھے گھسیٹ لیا دفتر جانے کے لئے تیار ہوا ہوں تو ہاتھ کانپ رہے تھے ٹائی کی گرہ ٹھیک نہیں بندھ رہی تھی، آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ عجیب کیفیت تھی اپنے وجود سے شرم آ رہی تھی برہنگی کا احساس تھا اور رگوں میں خون سن سن کر کے سر کی طرف دوڑتا تھا سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا چکر آ رہے تھے اور ہر لحظہ یہ احساس ہوتا تھا کہ میں گر جاؤں گا' وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ میں کمرے سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا بھاگ جانا چاہتا تھا۔

کلرک اور لوگوں کے ساتھ مصروف تھا میں چابی کا کہے بنا آنکھ بچا کر باہر آگیا۔ دفتر فون کر کے کہ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں، اسٹیشن چلا آیا۔ اسٹیشن سے میں نے ہوٹل فون کیا سامان میرے دفتر کے پتے پہ بھجوا دیا جائے اور ایسی ضروری ہدایات دیں۔
دن کی روشنی پھیکی اور بے کیف تھی۔

بہن بھائیوں کی محبت شفقت ماں کی دلداری نے مجھے اپنے سے صلح کرنے میں مدد دی پندرہ دن کے بعد میں واپس آیا اور مستقل اپنے دفتر کے ایک کمرے میں رہنے لگا

زلزلے کے بعد کی حالت کو درست کرتے میں بھی کافی دن لگ گئے، میں اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا سڑکوں پر نکلتے ہوئے گھبراتا تھا مبادا وہ کہیں دکھائی دے جائے مجھے پھر پکڑ لے میرے ساتھ لگ جائے، سب سے زیادہ مصیبت تو یہ تھی کہ کسی سے بات کر کے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتا تھا، بخار کی طرح یہ خیال مجھے پکڑے رکھتا، دوست کہتے نہ کوئی کام کرتے ہو نہ سوچتے ہو کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں ہنس کر چپ ہو رہتا۔

منیر نے ایک دن مجھے پکڑ لیا "سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے گم شدہ ہو گئے ہو زخمی ہو کیا؟ کب سے عشق کر رہے ہو۔ ہمیں بتاؤ نا، دوستوں سے اتنی پردہ داری ٹھیک نہیں آدمی اکیلے اکیلے یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ بوجھ کو بانٹ لو ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں یقین کرو ہم تمہیں برا بھلا نہیں کہیں گے۔"

میں نے اسے ایڈا کا بتایا رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر جیسے گرنے سے بچ رہا ہوں۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا "تو تم آتے ہی اس دیوانی عورت کی مٹھی میں آ گئے۔" اور ہمیں تم نے ہوا تک نہ لگنے دی۔ اس سارے معاملے کی، تم کو اس نے پھانس لیا تشکل سے تو اتنے بیوقوف نہیں لگتے مگر ہو سہی ناتجربہ کار ہونا اور تم اندر کیوں گھسے رہتے ہو ساتھ چلا کرو، اکیلا پن تو اچھے بھلے سوچنے والے کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔

ہم ایک نئے ریسٹوران میں بیٹھے تھے جو اس ہوٹل کے بیس منٹ میں تھا۔ صرف کنوارے لوگوں کو اس میں داخلے کی اجازت تھی آرکسٹرا بج رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں نیم تاریکی میں قدم سے قدم اور چہرے سے چہرہ ملائے پتہ نہیں چلتا تھا کہ ایک جسم کہاں سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا کہاں ختم۔ پھر کسی نے اشارہ دیا موسیقی کی دھن بدل گئی ساز ہولے ہولے دھیمے سروں میں کوئی نہایت پرانی گت بجانے لگے تیز تھرکتے ہوئے جسموں کے تال دیتے بھی ان لہروں پر جیسے لیٹے ہوئے یہ چھوٹا سا ہال ایک آہستہ رو ندی کی طرح تھا طوفان اور جوش کے بنا۔

میئر نے کہا "یار میں بھی ناچنا چاہتا ہوں اور وہ اٹھ کر چلا گیا کسی ساتھی کی تلاش میں۔"
ہیلو بے بی کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا زمانوں کے بعد دکھائی دیئے ہو کہاں چلے گئے تھے اور میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا، ہر جگہ تمہارے دفتر میں اور یہ تمہاری امانت ہے میں اسے لوٹانا چاہتی تھی۔

سفید رسٹ واچ مدھم روشنی میں میز پر پڑی اس کے اور میرے درمیان گزرے اور آنے والے وقت کا نشان بنی چمکتی رہی۔

"اتنی بہت سی باتیں تم سے کہنا تھیں مگر تم بولتے ہی نہیں ہو خیر خیر بے بی شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے آدمی تجربات میں سے گزرتا ہی ہے۔"

"شٹ اپ، میں نے نہایت آہستگی سے کہا میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتا" "چلی جاؤ یہاں سے ایک دم"

"بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔" اور وہ میز پر سر رکھے رونے لگی زور زور سے جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو میں نے اس کی بے عزتی کی ہو۔ اور میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔
ہاتھ بڑھا کر اس نے کہا "خدا کے لئے ایک لارج جن کا آرڈر دو ورنہ میں یہیں ڈھے جاؤں گی تھکن کے مارے شرم کے مارے۔"

منیر اس ہلکورے لیتے گروہ میں جانے کہاں تھا اور میرے لیے نجات کی ساری راہیں بند تھیں۔

اپنا گلاس بھرنے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا تو نقاہت کی وجہ سے کانپ رہا تھا بہت بڑی ایکٹریس ہے یہ خاتون اور میں تو اب مکمل جہنم واصل ہو گیا ہوں "تم اس رات سے ایک دن بھی زیادہ عمر کے نہیں ہوئے"، وہ ذرا ہنسی۔ اس کے پیسے میں خود ادا کروں گی۔ سنا تم نے آج کل مجھے ایک بہت عمدہ سا کام مل گیا ہے، اور کام بھی کیا ہے میری ایک بہت سویٹ دوست ہیں اس کے انکل کو پتہ نہیں کیوں حکومت نے کسی کی مخبری پر جیل میں بند کر رکھا ہے بس

ان کی ملاقات کے لیے ہر ہفتے جاتی ہوں۔ اتنی دولت کے مالک ہونے پر بھی وہ بے حد سیدھے اور پیارے آدمی ہیں کہتے ہیں جب خدا کو منظور ہو گا انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ اس کی ذات پر اتنا بے حد یقین ہے انہیں۔ بیٹے دور دراز ملکوں میں ہیں بہت پھیلا ہوا کاروبار ہے فرصت نہیں ہوتی کہ باپ سے مل سکیں، میں جاتی ہوں تو خوش ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ادھر ادھر کی باتیں پوچھتے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کوشش کر کے انہیں جیل سے باہر نکالا جائے مگر وہ مانتے ہی نہیں کہتے ہیں ابھی وقت نہیں آیا اور ان کا وہیں رہنا ٹھیک ہے۔ ایک بار ملاقات کے مجھے تقریباً پانچ سو روپے ملتے ہیں۔ سرحد کی جیل میں ہیں نا وہ۔ اور مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنا پڑتا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا گلاس ختم کر کے اس نے کہا ”بے بی مت سمجھنا میں ہر روز پیتی ہوں بس کبھی کبھار اور وہ بھی بہکتی نہیں سمجھے۔“ جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ کہنے لگی ناچو گے؟ پھر خود ہی کہنے لگی تمہیں ناچنا کہاں آتا ہو گا۔ آؤ میں تمہیں سکھاؤں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی میں نے زور سے چھڑایا تو وہ پورے قد سے پیچھے گر گئی

شرمندہ ہو کر میں جلدی سے جھکا کہ اسے اٹھاؤں مگر وہ بے ہوش تھی یا پھر مدہوش۔ بیرے بھاگتے ہوئے آئے۔ منیر بھی کہیں سے آکر میرے برابر کھڑا ہو گیا۔

”ایڈا اٹھور یہ تم ہمارے دوست کو چک پھیریاں کیوں دے رہی ہو بھائی۔ اسے اتنا بے آسرا مت سمجھو“

”اوہ منیر تم ہو“ — وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی۔

”ہاں یہ میں ہی ہوں، زمانے ہو گئے تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی“ منیر نے ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

”کل رات میں ایک دعوت دے رہی ہوں تمہیں پتہ ہے“ اس نے بوتل اپنی طرف کر لی۔

منیر نے کہا ”میں اور عاصم کل موجود ہوں گے میرے خیال میں یہ بھی عاصم ہی ہو گا۔

ایڈا نے جیسے سنا ہی نہ ہو اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس غار کی سیڑھیاں طے کر کے ہم آئے ہیں تو چاند کہیں بادلوں کی اوٹ سے نکلا تھا اور بھیگی ہوئی ہوا میں نمی نہیں خوشگواری تھی، زرد کرنوں کے جال میں بندھے ہوا کے خیمے اُڑے جا رہے تھے۔

"چوتھی سڑک ہے چوراہے سے سیدھے ہاتھ اور "گولڈ ویو" گھر کے باہر لکھا ہے" اس نے چیخ کر ہمارے پیچھے کہا۔

"تو تم سنجیدگی سے اس کی دعوت میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو واقعی"، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک اچھی دعوت کو رد کرنا کور ذوقی ہے عاصم" منیر نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا۔

یہ ایسا گھر تھا جس کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہے اپنی روشنیوں اور شان و شوکت کی وجہ سے پرانے زمانے کے نوابوں کے محلوں سے کسی طرح کم نہیں، باوردی بیرے بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے، دبے دبے رنگوں اور عمدہ طور طریقے سے سجائے ہوئے اس محل میں ایڈا کے موجود ہونے کا تو سوچ ہی نہیں سکتے تھے مگر ہمیں جس خاتون نے خوش آمدید کہا وہ سفید بالوں اور عمدہ خدوخال والی بہت ہی مہذب ملکہ کی سی شان والی تھی، "آیئے آیئے آپ ایڈا کے دوست ہیں نا" بہت لوگ نہیں تھے مگر خاصا اچھا مجمع تھا، ایڈا کا ایک انکل تھا جو بار بار رومال پر ناک صاف کرتا اور پھر اسے جیب میں ڈالتا تھا، وہی رومال نکال کر ہاتھوں میں گولہ بناتا تھا اور اپنے گلاس پر جھکا ہوا تھا، ایک خاتون تھی جو مسلسل گفتگو کرتی تھی اور چڑیا کی طرح پھدک کر کبھی ایک کے پاس جاتی اور کبھی دوسرے کے پاس لگتا تھا اسے انگریزی بولنے کا بہت شوق ہے گھڑی گھڑی YOU SEE کہتی، ہاتھ ہلا کر اپنا مطلب سمجھاتی اور جام رکھ کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتی تھی جن میں سیاہی اور سرخی کا لہریا روشنی پکڑ کر چمک اٹھتا تھا۔ کچھ لمبے بالوں والے ادھیڑ عمر لڑکے تھے سیاہ عینک لگائے جیسے فلموں کا ہیرو ہو نہایت سمارٹ ایک شخص تھا جس کے بہت ہی کم

ہلنے سے کے باوجود لگتا تھا اگر وہ ہلا تو سیمسن کی طرح کرسی کو توڑ دے گا اور یہ شیشہ و جام ہاتھ مار کر بکھیر دے گا۔

ایڈا نے نہایت اونچی چولی پہنی تھی جس کا گلا بہت نیچا تھا کمر سے کھلے حصے پر پوڈر کی تہ صاف نظر آرہی تھی، وہ بہت مضطرب تھی اور اس کی ساڑھی کا پلو گھڑی گھڑی گر رہا تھا۔ میک اپ کی وجہ سے کم عمر نظر آرہی تھی اور بالوں کے رنگ میں سیاہی نے اس کو دس سال پیچھے کر دیا تھا، وہ انکل کے ارد گرد منڈلاتی پھرتی تھی مسکراہٹ سے اسے رجھاتی ہوئی جیسے بس اسے دیکھ کر ہنسنے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

میں اور منیر شام سے ایک کونے میں بیٹھے تھے ہمارے ساتھ بیٹھی خاتون کے ترشے بالوں میں مصنوعی لہریئے تھے جو بھیگتی رات کے ساتھ ساتھ اور دلفریب لگنے لگے تھے اس کا دہانہ چھوٹا اور باتیں بڑی بڑی تھیں، وہ اپنے دنیا کے سفر کا قصہ سنائے چلی جا رہی تھی جب میں پیرس میں تھی جب میں ہانگ کانگ میں تھی، منیر مفت کی شراب کو بڑی بیدردی سے لنڈھا رہا تھا اور مجھے ایڈا کی نقل میں بے بی کہہ رہا تھا وہ تو کب سے لہک رہا تھا اور ہم سے ذرا دور ایک جوڑے میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ابھی تک سب لوگ ذرا لئے دیئے تھے، اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ انکل نے ایڈا سے کہا "میوزک کا بندوبست کیوں نہیں ہے" اس کی آواز میں جھگڑا کرنے والے کی سی تلخی تھی ایک نہایت بیہودہ قسم کا گانے والا بلایا گیا اس کا ساز درست نہیں تھا جیسے آؤٹ آف ٹیون ہو طبلہ نواز بیمار تھا کھانس رہا تھا۔ طے یہ ہوا کہ محفل میں ہر کوئی گائے۔ جس کو گانا آتا ہی نہ ہو وہ بھی کوشش کرے، انکل نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا، وہ بے ہنگم پھٹی ہوئی آواز میں گانے لگا تو چپ ہی نہیں ہوتا تھا۔ منیر اب اپنے قصے سنانے لگا تھا اور گانا سن نہیں رہا تھا "اگر تم سننا نہیں چاہتے ہو تو نکل جاؤ۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور آدمی کو کالر سے پکڑ کر کھڑا کر دیا، میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جھگڑا زیادہ نہ بڑھ جائے۔ ایڈا کبھی ایک کے آگے ہاتھ جوڑتی کبھی دوسرے سے کہتی "میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں منیر ساری فضا

خراب نہ کرو۔"

میں نے بہت مشکل سے منیر کو چپ کروایا پھر وہ اس مرد سے الجھ پڑا "آؤ بیوٹی آخر ہم سے بھی بات ہو سکتی ہے" اس نے بہت خوب صورت بالوں اور میکسی پہنے خاتون سے کہا "آپ کو شاید محفل کے آداب نہیں آتے" اس کے ساتھی نے منیر سے کہا۔

"آداب کس چڑیا کا نام ہے" اس نے خالص غنڈوں والے انداز میں جواب دیا اور اس عورت کو بازو سے پکڑ لیا۔

"بے بی تم منیر کو سنبھال نہیں سکتے" ایڈا نے منت کی۔

"تم اب میرے دوست کو مزید اپنے مطلب کے لئے نہیں برتو گی" منیر جلدی سے میری طرف آیا۔ "یہ تم اس کے کان میں کیوں بات کر رہی ہو؟" میزبان کی حمایت میں آدمی منیر کو ڈانٹنے لگے بات بڑھ گئی۔

ایڈا نے کہا "منیر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ سنبھلو ہوش میں آؤ مجھے شینا کے یہاں ہونے کا بالکل پتہ نہ تھا۔"

میں نے کہا "یہ تم اتنے جھگڑالو کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"میں اس کی بے عزتی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی محفل درہم برہم کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو تم ویسے بھی کر سکتے تھے، مگر تمہاری اپنی ڈگنٹی، اس عورت کا ہونا، گھر والے میزبان انکل میری بات کاٹ کر اس نے کہا تم اس حرافہ عورت کو کہتے ہو۔ یہ کون سی شریف گھر دار عورت ہے اور یہ انکل وغیرہ بھی فراڈ ہی ہوں گے۔ تم زیادہ تلخ کیوں ہوتے ہو؟"

ایڈا نے کہا "میزبانوں کا کچھ خیال کرو۔ جس بڈھے آدمی کو تم نے کالر سے پکڑا تھا وہ گھر کے مالک کا خاص الخاص مہمان ہے تم پہلے کبھی یوں نہیں بہکے نہایت تمیزدار مشہور ہو۔"

شینا اور اس کا ساتھی کہیں غائب ہو گئے تھے، کھانے پر بھی بہت کم لوگ نظر آئے، کچھ صوفوں پر نیم خوابیدہ تھے صرف ایڈا لوگوں کی خاطر داریاں کرتی پھر رہی تھی، کمروں کی لمبی قطار

اندھیری تھی اور راہداری میں کوئی روشنی نہ تھی، ہم باہر نکلے ہیں تو چاند کا ایک کونہ ریت میں دبے سکّے کی طرح آسمان کے کونے پر چمک رہا تھا۔

"خوب ونگا کیا، زیادہ ہی پی گئے تھے تم" میں نے سیدھی سڑک پر آ کر کہا۔

"کون پیئے ہوئے تھا؟ میں تو سارے جام پاس پڑے گلدان میں گراتا گیا"، منیر کی ہنسی میں شرابیوں والی لٹک نہ تھی۔

"کیوں آخر کیوں؟ اور پھر دعوت میں جانے کا کیا فائدہ ہوا یہ ساری شام بلکہ رات برباد گئی"

پچھلے پہر کا چاند بھی ڈوبنے والا تھا، تاروں کی ضیا پھیکی پھیکی تھی سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

"کسی کیوں کا جواب بھی نہیں دیا جا سکتا یونہی کبھی کبھار آدمی کو مافی بہت پریشان کر دیتا ہے اور اپنے اندر کی بے چینی اسے نہایت مضحکہ خیز حرکتیں کرنے پر مجبور کرتی ہے،،

منیر آیا" چلتے ہو ذرا ایک جگہ جانا ہے اس دن کی طرح تمہاری شام غارت نہیں جائے گی"

وہ کئی دنوں کے بعد ملا تھا میں نے اس کی غیر حاضری میں خوب لمبی نظمیں لکھیں تھیں اور خوش تھا اپنے سے مطمئن آدمی تو جہنم میں جانے سے بھی نہیں ڈرتا۔

"جوتے ذرا چلنے والے پہننا گلیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑے گا،،

آج کی مہم کو کیا نام دیا جا سکتا ہے،، میں نے تسمے باندھتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا نوادرات دکھلانے لے جا رہا ہوں تمہیں اندرونِ شہر کی زیارت کرنا چاہو گے کیا؟ منیر سیٹی بجاتا ہوا آگے آگے چلا۔

تنگ گلیوں، گنجان بازاروں اونچی اور تاریک عمارتوں پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم بہت دیر میں پہنچے۔ گھر کا دروازہ پرانا تھا اور ڈیوڑھی میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا گھنٹی بجا کر خاموش کھڑے رہے پھر گھنٹی بجائی منیر نے باہر نکل کر گلی میں جھانکا آس پاس کے مکانوں میں کئی سر دکھائی دیئے۔ اندھیرے میں بتی جلی جو بیمار دکھائی دیتی تھی "بیٹے منیر تم ہو اندر آ جاؤ"۔

پھر میں اور منیر ایک اور ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں گئے، ایک دم کشادگی کا احساس ہوا۔ گملوں میں رنگ برنگے پھول تھے سلیقے سے کیاریوں میں موتیا اور بیلا کی ترشی ہوئی جھاڑیاں کھڑی تھیں، ایک انار کا درخت تھا جس پر کلیاں آئی ہوئی تھیں اور پھر قطار اندر قطار ناکھ اور آلوچے کے پیڑ تھے۔ طوطا اور مینا اپنے پنجروں میں بے تاب ہو کر ایک دم بولنے لگے "کون ہے، کون ہے"

کسی دالان میں کتا بھونکا۔

"کنگ پیپر ابھی تک کسی کو نہیں پہچانتا اماں" سامنے کھڑی خاتون کی طرف بڑھتے ہوئے منیر نے کہا۔

میں وہیں آنگن میں کھڑا تھا۔

"آؤ بیٹے تم بھی آؤ" اماں بولیں "جیسے منیر ویسے تم"۔

جس کمرے میں ہم بٹھائے گئے اس کی کھڑکیاں اونچی اور بڑی تھیں گلی میں سے ہوا مسلسل آ رہی تھی، دیوان قاعدے سے جھاڑے ہوئے اور ستھرے تھے اور گاؤ تکیوں پر غلاف خوب کسے ہوئے تھے۔ اس روشنی میں بیٹھے ہوئے نیم تاریک ڈیوڑھی اور بیمار روشنی کسی اور گھر کی بات لگتی تھی۔

"چائے پیوگے یا پان کھاؤ گے" انہوں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ممکن ہو تو دونوں"، منیر نے ادھر ادھر دیکھا غور اور تجسس سے۔

"جمال کی تصویر دیکھ رہے ہوگے، مجھ سے لوٹ گئی۔ فریم ایک دم شیشے سمیت کرچیں ہی ہو گیا۔ ایسا تو میرے پاس کوئی نہیں نا جو بنوا کر لا دے۔ جگہ خالی خالی بری لگتی تھی خود مجھے بھی اور دن ہوتے تو وہم سے میرا جی ہول جاتا مگر اب تو میں وہموں میں نہیں پڑتی۔ ان سے کیا ہوتا ہے الٹا کرچیں تکلیف دیتی ہیں۔ یہاں اتنا سونا ہو گیا ہے، پتہ نہیں ان کا اشارہ کس طرف تھا؟

میں دھوپ کو دیواروں سے اترتے اور نیچے صحن میں آتے دیکھتا رہا روشنی کا دھارا جو آبشار کی طرح اونچی چھتوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔

"پان نہیں کھاتے بیٹے تم" اماں اب میری طرف مخاطب تھیں "لے لو ناپسند کرو گے"!

"ہاں بھئی اماں کے ہاتھ کا پان تم واقعی پسند کرو گے" منیر نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ چائے پی کر بھی ہم بیٹھے رہے میں حیران تھا کہ منیر تو مجھے نوادرات دکھانے لایا تھا۔

"اماں یہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں" اس نے انہیں بہت دیر خاموش پا کر کہا۔ انہوں نے سر اوپر اٹھایا۔

"بیٹا تم اپنی سعادت مندی کی وجہ سے شاید میری مصیبت کو سمجھ سکو۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے تمہیں بلایا ہے۔ تم میری مدد نہیں کرو گے تو کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا" جانے وہ کس کی بات کر رہی تھیں۔

"اماں اسے سمجھانا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ فاصلے بہت ہو گئے ہیں" منیر نے جواب دیا۔

"میرے لیے تم ایک کوشش اور کر دیکھو، وہ اپنا سامان لے گئی ہے اور کہیں مشرقِ وسطیٰ میں یا جانے کہاں جانے والی ہے"

"یہ کب کی بات ہے؟" منیر فکر مند ہو گیا۔

"ایک ہفتہ پہلے یہی دن تھا دوپہر کو آئی اور اپنا سارا سامان کتابیں، تصویریں پرانے جوتے تک سب کچھ سمیٹ کر چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں جاتے ہوئے کہنے لگی اچھا اماں اب حشر میں ملاقات ہو گی یا نہ بھی ہو تو آپ کو کیا غم۔ دروازہ دھڑ سے بند کیا اور بس، اتنا بڑا ڈھنڈار گھر تمہیں تو پتہ ہے میں نے سب بچوں کو اس آفت ماری کی وجہ سے الگ کر دیا ہے۔ کوئی آتا نہیں جاتا نہیں گھر میں اکیلی پڑی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اسے روکو۔ تم سے دبتی ہے وہ۔"

"اماں میں آپ سے کیسے کہوں وہ پہلی سی بات نہیں بلکہ کوئی بات ہی نہیں میرا اس پر

دباؤ نہیں، اسے تو ملے ہوئے بھی زمانے ہو گئے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے وہ ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تھی" پتہ نہیں وہ کس خاتون کی بات کر رہا تھا۔ میکسی پہنے اور ڈھیروں میک اپ کئے اس لڑکی کی جس کا اس نے ہاتھ پکڑا تھا یا پھر کسی اور کی۔ میرا دماغ اس رات کی دعوت اور اس کی بدمزگی کی طرف گیا۔ سب عورتیں لڑکیاں لگتی ہیں، آج کل تو کسی کی عمر کا پتہ نہیں چلتا مصنوعی پلکیں لگائے مصنوعی جوڑوں کے طومار باندھے ہر خاتون COSEMETIC کی کسی کمپنی کا اشتہار لگتی ہے میزبان خاتون منیر تو اس کو پہلے نہیں جانتا ناممکن۔ چڑیا کی طرح پھدکنے اور انگریزی بولنے والی کوئی سوال ہی نہیں۔ اپنے سفر کے قصے سنانے والی ہرگز نہیں اور ایڈا ایڈا تو بالکل ہی نہیں۔ اس ماحول سے نکل کر بھی تھوڑا سا رشتہ تو آخر محسوس ہوتا کچھ مناسبت، کوئی تعلق، ایڈا تو مجھے بے جڑ کی پانی میں زندہ رہنے والی بیل لگتی تھی جسے کسی سے نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

"پچھلے سال مجھ سے ذراسی بات پر اختلاف ہوا بس گم ہو گئی دنوں رشتے کے ایک بھتیجے کو اِدھر اُدھر دوڑایا پتہ چلا ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ ملنے گئی تو دھتکار دیا جانے کون کون لوگ جمع تھے میں نے کہا گھر چلو تو دھمکایا اگر پھر یہاں آئیں تو دھکے دلواؤں گی بیروں سے"۔ ایسی بے عزتی پر بھی نہ میرے آنسو نکلے اور نہ ہی میں نے دل برا کیا پھر خدا نے میری مدد کی اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے سولہ سو روپے کا بل تھا وہ میں نے چکایا اور اسے گھر لائی۔ تم ہی بتاؤ یہ گھر کیا برا ہے میں آنے جانے پر کوئی پابندی اس کے نہیں رکھتی۔ گھر نہ آئے راتوں غائب رہے تب بھی کچھ نہیں کہتی۔ ہر طرح کا آرام مہیا کرنے میں لگی رہتی ہوں مگر اسے تو جیسے اس گھر سے چڑ ہو گئی ہے۔

وہ ذرا کی ذرا رکیں۔ میں نے سوچا تعجب ہے اس پُرسکون آرام دہ ماحول سے وہ اس قدر مختلف ہے یہ گھر تو خاصا خوبصورت تھا پُرشکوہ سا مغلوں کے دور کی یادگار حویلی۔

"اماں جن لوگوں کے ساتھ اب اُس کی دوستی ہے اور جہاں ہر کوئی اُس کا انکل، اور ہر عورت اس کی دوست ہے پتہ نہیں وہ کیسے ہیں میرا خیال ہے انہی کے ساتھ جا رہی ہو گی۔ منیر نے

ہنے کو کہا۔

"بیٹے لوگ کسی پر یونہی بے فائدہ جان نہیں لٹاتے کوئی ایک پائی بھی فالتو خرچ نہیں کرتا میں کہتی ہوں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے"۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔

"جب پہلے پہل اس کی حالت خراب ہوئی ہے اور یہ ہسپتال گئی ہے تو میں نے صدقے دیئے خیراتیں کیں۔ آدھی آدھی رات کو دعائیں کیں خدا سے گڑگڑا کر رو رو کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی۔ پتہ نہیں میرے کن کرموں کا پھل ملا ہے کہ خراب سے خراب حالت میں ہوتی چلی جاتی ہے"۔

"دیوانی بھی نہیں اور پھر بھی دیوانی ہے کیا کروں بیٹے" وہ رونے لگیں ــــ آنسو اتنے گدلے لگ رہے تھے اتنے میلے جیسے دل پر غبار کا ڈھیر ہو۔

"روئیں نہیں اماں میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ شان و شوکت موٹریں کوٹھیاں آج کل کی گرینڈ زندگی کی تو وہ سدا سے شیدائی رہی ہے اور اس کی تلاش میں بھی ہے اب ایسے لوگ اسے ملے ہیں جن کے نوابی ٹھاٹھ اور بے حد رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ سمجھ تو نہیں سکتی میرے خیال میں ابھی تو نہیں کچھ ہڈ ٹھوکر لگے، دھتکاری جائے تب اسے ہوش آسکتا ہے مگر اپنی جگہ ہر طرح نکال لینے میں اس کا جواب نہیں"۔ منیر نے نہایت بے چینی سے پہلو بدلا۔

پان کی گلوری بنا کر دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے، اتنی فرمانبردار اتنی نرم مزاج تھی یہ بچپن میں، عاقلہ اور زاہدہ کو بھی گئے ہوئے زمانے ہو گئے ہیں وہ لوگ وہیں جم گئے ہیں واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بلال نے امریکہ میں شادی کر لی ہے رشتہ داروں کی باتوں سے عاجز آکر میں نے انہیں ملنا چھوڑ دیا ہے۔ تنہا پڑی رہتی ہوں اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ کوئی آتا ہے تو لوگ کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں۔ اور اس گھر کی شان کے سامنے بڑے بڑے

دم نہیں مار سکتے تھے۔ اپنے سامنے ہی زندگی کا قطرہ ڈھے رہا ہے اور میں کچھ کر نہیں سکتی کسی سے فریاد نہیں کسی سے مدد کی امید نہیں۔ واپس آتے ہوئے منیر نے کہا" ایک بات کا تو میں اعتراف کرتا ہوں'ایڈا میں بے پناہ طاقت ہے لوگوں کو گھیرنے'ان کے دل میں گھسنے کی ایک عجیب قوت ہے اس کے اندر، جس کو چاہے پھانس لیتی ہے، جس کا ساتھ جی چاہے چھوڑ دیتی ہے لگتا ہے اس کے چشمے پھوٹ رہے ہیں کسی پراسرار قوت کے۔ اب مجھے ہی دیکھو شینا سے ملوایا اور پھر جب ہماری محبت اس کے سامنے پروان چڑھی تو اس نے ہمیں جدا کر دیا۔ دیکھا تھا تم نے اس دن شینا یوں تھی جیسے اس کا میرا کبھی ساتھ نہ رہا ہو مجھے پہچان ہی نہیں رہی تھی۔

خاموشی سے ہم گلیاں اور سڑکیں طے کرتے ہوئے باہر آگئے۔

"ہو سکتا ہے وہ دلوں کو محبت کرتے دیکھ ہی نہ سکتی ہو۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے" بہت دیر بعد میں نے کہا۔

"نہیں"، منیر بولا"جب میں اور شینا ملتے تھے تو وہی ہمارے لیے مواقع فراہم کرتی تھی'اصل میں یہ پودا اس کا لگایا ہوا تھا پہلے پہل جب میں ایڈا سے ملا ہوں تو بہت متاثر ہوا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے خواب لیتی جھیلیں ہوں، بہت شفاف تھیں، باتیں کرنے کا ایک مخصوص انداز اور سر ہلا کر چپ ہو جانے کی ادا'میں اس پر فدا ہو گیا تھا" وہ پھر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

شینا نے ان دنوں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اس جلال اور شکوہ سے بہت مرعوب تھی سنی ہوئی داستانوں اور آزادی کی فضا میں جیسے پھول چاندنی لگنے سے کھلے وہ بھی روز بروز زیادہ حسین اور شوخ ہوتی گئی میرا وہاں آخری سال تھا جلسے جلوسوں کی فضا تھی دھواں دھواں سی۔ ہم لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے جو بات کہتا اسی کی بات جی کو لگنے لگتی دھڑے بندیاں سیاست قوت کا نیا احساس اپنے کچھ ہونے کا اپنے وجود کا میں بھی سٹوڈنٹ لیڈر تھا اور ایڈا بھی شینا اور مجھے سمجھ لو اپنی حفاظت میں لے لیا اس نے۔

کہنے لگی "منیر تمہارے لئے شینا ٹھیک رہے گی اچھی مہذب لڑکی ہے ٹھہراؤ ہے طبیعت

ہیں۔ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔ تمہیں بہر حال زندگی کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہو گی اور مجھے اس لڑکی سے بہتر کوئی نہیں لگتا،" ہم ملتے رہے ہمیں قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا پھر اچانک شینا میں مَیں نے ایک تبدیلی محسوس کی۔ جب ہم تینوں موجود ہوتے تو عجیب گھٹن ہوتی ایڈا ادھر اُدھر نہ جاتی۔ میں یونیورسٹی سے خاصی دُور ایک فرم میں ملازم ہو گیا تھا اور مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا بس شینا اور میں اور وہ بنا ایک دوسرے سے باتیں کئے بیٹھے رہتے۔ ایڈا نے دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا پھر شینا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی یا اسے کوئی بُلانے آجاتا میں اور ایڈا بیٹھے رہتے میں اُٹھتا اور خدا حافظ کہتا تو وہ اسی طرح بیٹھی رہتی۔ چھ ماہ میں ساری کایا پلٹ گئی، میرے خواب میری زندگی کچھ بھی تو پہلے جیسا نہ رہا۔

شینا سے دو ایک بار اس کے گھر جا کر ملا بھی تو وہ بہت رُکی رُکی سی تھی میں محبت کی کرچیں پیر پہ چلتا دُور نکل آیا ایڈا نے شینا کی شادی کا سن کر مجھ سے رسمی افسوس بھی نہ کیا جس لڑکے سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ بھی ایڈا کا لے پالک تھا اس کا پرانا چاہنے والا۔

"ہو سکتا ہے تم جو الزام اس کے سر دے رہے ہو اس میں اس کا ذرا سا قصور بھی نہ ہو،" میں نے کہا۔

"نہیں میں اتنا جذباتی اب نہیں رہا ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی نہ کسی احساس میں شدت سے مبتلا ہے اور شینا کو مجھ سے بدظن اسی نے کیا ہو گا۔"

"اگر شینا کو تم سے کوئی لگاؤ ہوتا تو......"

"تم سمجھتے ہو میں محبت میں اور لگاؤ میں کوئی فرق نہیں کر سکتا، آدمی میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"تم شینا پر الزام نہیں دھرتے اور ایڈا کو سارا قصور وار ٹھہراتے ہو۔"

"جو لڑکا تم نے شینا کے ساتھ دیکھا وہ اس کا تیسرا یا چوتھا شوہر ہے منیر نے تلخی سے کہا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"ہوتا کیوں نہیں کچھ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو یہ سانحہ نہ ہوتا ہم دونوں خوش رہتے"
"تو پھر اس کا نصیب، تم اتنے تلخ کیوں ہو یہ کیوں نہیں سوچتے جو لڑکی ایک کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی کسی کے ساتھ بھی وفا نہ کرتی۔ تم میں کیا خصوصیت تھی کیا محبت کی شادیاں ناکام نہیں ہوتیں۔ شینا میں یوں بھی وفا کا فقدان ہوگا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ شاید میری بات کا کوئی جواز ڈھونڈھ رہا ہو۔

سڑک کے چوراہے پر ہم پھر کسی وقت ملنے کے لیے خدا ہو گئے، زندگی کتنی عجیب ہے نہ سمجھ میں آنے والی پہیلیوں سے عبارت —— اس عرصے میں دو ایک بار منیر سے ملنا بھی ہوا مگر یہاں وہاں کسی سرکاری ڈنر میں کہیں کلب میں ذرا ذرا سی دیر کے لیے۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیا کیا تھا یہ موضوع میں نے خود نہیں چھیڑا۔ لگتا تھا کام کی مصروفیت میں وہ بھول ہی گیا ہے۔ بھلا بوڑھی عورتوں کے لیے کون پریشان ہوتا ہے پھر نئی نسل کے اپنے مسائل ہیں اپنے حل ——

اس رات بارش تیز تھی آسمان زمین والوں پر نہایت خفگی سے برس رہا تھا۔ روشنی بھی ڈرتی کانپتی لگتی تھی۔ ٹیبل لیمپ ہوا کے زور سے ہل رہا تھا۔ شیڈ پر لگی جھالر کپکپاتی تھی گرج کی آواز آسمانوں پر رقص کرتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتی۔ کہیں بجلی گرتی تو کڑک دل کو ہلا دیتی۔ میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، بیٹھا تھا مگر لفظ ہلتے تھے اور کان باہر کی آوازوں پہ لگے تھے۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ اپنے آپ کو لپیٹے نیلے پھولوں والی بیل سو نہیں سکی ہوگی لان میں آکر دھوپ میں لوٹ لگانے والی بلی کا رونا، ٹھکانے کی تلاش میں اس کا گھومنا، دبے پاؤں میرے دروازے پر آکر پنجے مارنا اور پھر واپس جانا۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ کر گر رہی تھی پرنالوں سے پانی بڑے زور سے گر رہا تھا۔ بہتے ہوئے دھارے کی صدا جیسے میں ندی سے گھرا ہوں۔ کھڑکی کے پٹ کھٹکے کے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے آگے پیچھے ہوتے ہوئے اور ایسی آواز آتی تھی جیسے کوئی کھٹکھٹا رہا ہو۔ میں پریشان ہو رہا تھا۔ اٹھ کر میں نے چاہا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے آگے لگا دوں تاکہ ان سے بے چین روحوں کی آمد و رفت کا یہ منظر توڑ کے

پتلے پردے کے پیچھے سے مجھے ایک چہرہ دکھائی دیا۔ کتابیں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئیں ایسے وقت کون ہو سکتا ہے۔ پسینے کے قطرے میرے ماتھے پر آئے اور ڈر کی وجہ سے دل ٹھہرتا لگا۔ یہ کیفیت ایک دو منٹ رہی، پھر سوچا ہو سکتا ہے چوکیدار ہو اور بارش سے ڈر کر اپنی کوٹھڑی کی بجائے برآمدے میں آگیا ہو۔ میں نے اُسے پکارا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پھر زور سے پکارا جلال جلال اتنے زور سے تاکہ میں خود میں بھی تو کوئی ہمت پیدا کر سکوں۔ کبھی کبھار اپنی آواز کا آسرا بہت ہوتا ہے۔

"یہ چیخ کیوں رہے ہو یہ میں ہوں ایڈا دروازہ کھولو۔"

اگر کوئی کہتا کہ ساری پرانی روحیں جاگ کر تمہارے کمرے کے باہر جمع ہیں تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس نام کے سننے سے ہوئی۔ جانے کب تک میں حیران کھڑا رہا۔

"کیا اب مجھے ساری رات باہر کھڑا رکھنے کا ارادہ تھا تمہارا؟" لیٹے ہوئے ایک بڑے بنڈل سمیت۔" افوہ خدا کی قسم نہایت عجیب صورت حال ہے"، کہہ کر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

"عاصم بے بی کچھ خیال نہ کرنا تم اس کرسی کو پھر سے ٹھیک کروا سکتے ہو مگر میں بہت بھیگی ہوئی ہوں کھال کے اندر تک پانی ہی پانی ہے۔" خاموشی سے الماری کھول کر میں نے اسے ایک پائجامہ اور قمیض پکڑا دی۔ لمبے کمر تک پہنچتے بالوں کو تولیے سے خشک کرتی ہیٹر کے سامنے نیچی تپائی پر ٹکی ہوئی وہ مجھے بڑی بے آسرا لگی۔ "اگر چائے مل سکتی تو . . . مگر تمہیں کیونکر تکلیف دوں۔

ایسے میں وہ مجھے جو حکم بھی دیتی مانتا۔

چائے پیتے ہوئے لگتا تھا وہ خوابوں میں کھو گئی ہے۔ یہ چپ چاپ پتہ نہیں کن ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی اکیلی بے ٹھکانہ۔

بے بی بہت بڑے خطرے میں ڈال رہی ہوں تمہیں! پتہ ہے میرے پیچھے پولیس لگی ہے اور اس بنڈل میں وہ سارے کاغذات ہیں جن کی انہیں تلاش ہے جب ہم لوگ بھاگے ہیں تو ناز آپا اور میں ایک ہی موٹر سائیکل میں تھیں۔ تمہارا ٹھکانا آیا تو جیسے الہام ہوتا ہے سوچا یہاں

رک جاؤں بارش میں نشان مٹ جاتے ہیں کھوج نہیں نکالا جا سکتا۔ پتہ نہیں کس نے نہایت تفصیل سے ہمارے متعلق ایک ایک بات دی۔

"تم نازآپا کو نہیں جانتے ہا بھئی وہی جو دعوت والی رات سب لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ میں پاس کی کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اور لگتا تھا میرے اردگرد آسمان گر رہا ہے۔

"مگر تم یہ مت سمجھ لینا اس سارے ریکٹ کا مجھے علم تھا۔ ان لوگوں نے مجھے کہا تھا کہ جیل میں صرف انکل سے ملاقات کرنا ہوگی یہ بات تو اتنی بے ضرر تھی بظاہر آپا ناز کہتی تھی کہ کسی وجہ سے وہ ایسے انکل کے ساتھ اپنا تعلق لوگوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ جو جیل میں ہو۔ میں نے سوچا میرا کیا جاتا ہے! روز روز مارے پھرنے سے ایک دن ہفتے میں جا کر مل آنے سے کون جانے انکل کی کچھ لگتی بھی ہوں کہ نہیں اور پھر نازآپا اس پیار سے مجھے کہتی تھیں سوچو تو سہی یہی یہ ٹھکانہ تھی جس کا اپنا اس بھری پڑی دنیا میں کوئی نہیں ہے یوں چاہی جاؤں، ایک گھر کا تصور جس میں اپنا پن ہو کتنا مکمل عیش تھا۔"

"مگر تمہاری اماں تھیں اور سولہ سو روپے کا بل چکا کر وہ تمہیں واپس گھر لے گئیں تھیں ہوٹل سے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے بہت قطعیت سے بات کی۔

وہ چپ ہو گئی پھر جیسے لفظوں کے لئے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ ٹھیک ٹھیک نشانے پر تیر مارنا چاہتی ہو۔

"اماں کتنا اچھا میٹھا نام ہے؟" بہت دیر بعد اس نے کہا۔" وہ میری اماں کہاں ہیں انہوں نے مجھے میری ماں کے مرنے کے بعد پالا تھا۔ باوا کی کچھ ہوتی تھیں! یونہی انہیں ترس آگیا تھا مجھے نہیں معلوم مگر بڑے ہونے پر میری بہنیں مجھ سے اتنی شدید نفرت اور حقارت کا سلوک کرتی تھیں، صرف انہی اماں کا وجود ہی مجھ سے محبت نچھاور کرتا۔ باوا نے دوسری شادی کر لی تھی، وہ کہیں دور رہتے تھے۔ اس بڑی حویلی کے دالانوں میں محبت اور نفرت کے شدید جذبوں کے درمیان میں بڑھی۔ پتہ نہیں اماں جتنی شدت سے مجھے چاہتی تھیں اتنی ہی شدت

سے وہ لوگ مجھے دھتکار کیوں تھے۔ میں سمجھتی ہوں یہ اماں کا تصور ہے مجھے ان لوگوں سے بچانے کے لیے اپنے پر مجھ پر پھیلائے رکھتیں کوئی میلی آنکھ سے میری طرف دیکھتا تو اس پر برسنے لگتیں۔ کبھی عاقلہ یا زاہدہ میں سے کوئی ان کے ساتھ سونا چاہتا تو ڈانٹ دیتیں اس محبت پر ان کا حق تھا مگر میں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مجھ سے دوستی نہیں کی وہ میری نہیں ہو سکتی تھیں۔ عاقلہ تو تقریباً میری ہم عمر تھی۔ جب تک میں سکول میں رہتی خوش رہتی مگر گھر آنے کے نام سے ہی مجھے بخار سا چڑھ جاتا۔ نہایت تھکے قدموں سے اکیلی دالانوں اور کمروں میں پھرتی۔ دیکھا تم نے شروع سے ہی میرے خلاف اتنا بڑا محاذ تھا میں اور اماں ایک طرف باقی گھر ایک طرف۔ اماں کہیں جاتیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں اگر کبھی غلطی سے وہ مجھے چھوڑ جاتیں تو وہ لوگ طعنوں سے میرا ناک میں دم کر دیتے اتنا رلاتے اتنا رلاتے کہ مجھے ہوش نہ رہتی، ہوتے ہوتے گھر سے مجھے نفرت ہو گئی میں باوا کو یاد کرتی ان کی شکل کا تصور باندھتی جی چاہتا تھا اُڑ کر ان کے پاس چلی جاؤں مگر میرے تو پَر کٹے ہوئے تھے کبھی کبھار سینے میں اتنی گھٹن ہوتی اتنی گھٹن کہ چیخیں مار کر روتے لگتی بہنیں کہتیں ”یونہی ہسٹریا ہو گیا ہے۔ اماں تو پہلے ہی تمہاری ہیں انہیں پریشان کر کے زیادہ محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اب اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔“

پھر وہ سب مل کر ہنسنے لگے۔ جلال اور جمال اور عاقلہ اور زاہدہ۔

ان کی ہنسی نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا کہ آنسوؤں کو میں نے اپنے اندر ہی خشک کر دیا ہے۔ سہارے کے لیے میں نے ہر راہگیر کا دامن پکڑا ہے۔ اپنے آپ سے بچنے کے لیے میں نے قہقہوں اور ہنسی میں پناہ چاہی ہے مگر بے بی میں پھر بھی اکیلی رہی۔“ شیر علی یہاں رہتا تو شاید حالات کچھ اور ہوتے پتہ نہیں وہ کیوں چلا گیا۔ میرے اندر کے خلا کا اسے احساس ہو گیا جس خلا کو محبت کے سمندر بھی نہیں بھر سکتے۔“ بہت دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پھر کہا تھا ”پتہ نہیں کیسے جھانک لیا میرے اندر میں پتہ نہیں۔“ اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا۔ کہا کرتا تھا۔ قوس قزح کے رنگوں سے بنی تمہاری تصویر اصلی نہیں لگتی۔“ اور میں ہنس کر یہ

بھی اس کی محبت سمجھتی تھی بات کہنے کا ایک انداز۔

زمانے نے مجھے بہت ٹھوکریں ماری ہیں یونیورسٹی کے بعد جہاں پر بھی میں نے قدم جمانے کی کوشش کی ہے مجھے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ امر بیل کی طرح لوگوں نے مجھے ہر ہر درخت سے زبردستی جدا کیا ہے۔ جہاں بھی میں لپٹی ہوں۔

رات طوفان میں اڑی جا رہی تھی۔ میں نے آتشدان میں آگ جلائی اور بنڈل کھول کر کاغذ جلاتا گیا۔

ناز آپا نے تو کہا تھا انہیں سنبھال کر رکھنا اب میں کیا جواب دوں گی۔ کچھ بوسے بنا میں نے آگ میں انہیں جھونک دیا۔ تپش سے ایڈا کی زردی اور سرخی جھلکنے لگی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

جب میں اسے لینے گیا ہوں تو وقت تنگ تھا اور میری رشتہ کی بہن اس کے گلے سے لگ کر رو رہی تھی۔ ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا اور برقعے میں الجھتی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "بے بی میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتی تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔

تمہیں معلوم ہے منیر نے ایک دن کہا۔" جن لوگوں کے ہاں ہم اس دن دعوت میں گئے تھے وہ بین الاقوامی سمگلنگ کرنے والا گروہ تھا اور انہیں کے ساتھ ان کے ذریعے ہی تو ایڈا مشرقِ وسطیٰ جانے والی تھی۔ وہ سب لوگ تو یہاں وہاں سے پکڑے گئے ہیں۔ صرف ایڈا کا پتہ نہیں چلا اور ساتھ ہی ایک کاغذ نہیں ملا۔ ان کے خلاف ذرا سا ثبوت نہیں۔

"تم نے مجھے اتنے دنوں بتایا ہی نہیں" میں نے شکایت کی۔

میں اپنے طور پر ایڈا کی کھوج میں تھا گر اسے تو جیسے آسمان نگل گیا ہے زمین نے کھا لیا ہے اب میں اماں کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

جب آسمان پر چاند نہیں ہوتا ان راتوں میں تارے ٹوٹتے تو روشن چمکدار لکیر سی کھینچ جاتی ہے اندھیرے کے پس منظر میں وہ زیادہ تابناک لگتی ہے اور پھر فضا یاد ہی نہیں خلا کو احساس ہی نہیں ہوتا ان تاروں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ پتہ تارے ٹوٹتے کیوں ہیں؟

دشتِ جنوں پرور

کھمپ کے پودے پر اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے لیے مجھے دین گڑھ جانا تھا اور اس لئے میں ینرمان کی بستی میں لاریوں کے اڈے پر بیٹھا محکمہ زراعت کے اُس انسپکٹر کا انتظار کررہا تھا جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہاں آکر ملے گا۔ سواری کا بندوبست بھی کردے گا۔ اور مزید اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو مہیا کرے گا۔ بنچ پر پہلو بدلتے بدلتے میری کمر دکھنے لگی تھی۔ دو چار جواں مارے تجسس کے گھڑی گھڑی میرے قریب سے گزرتے تھے اور کھانستے تھے۔ ادھیڑ عمر کے راہی نہایت عجلت میں سلام کرتے اور چلتے چلے جاتے۔ سگریٹ اور چائے کی دکان پر گاہک نہ ہونے کے برابر تھے۔ اونٹوں کی قطاریں، کجاووں میں بچے اور عورتیں رنگین کپڑے اور ہچکولے سب گڈمڈ ہوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مردوں کے ٹھٹھول کی آوازوں پر شام کی ہوا گویا ہولے ہولے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

بے چین ہو کر میں نے اپنے تھیلے میں سے رنگین تصویری رسالہ نکالا جس میں صحراؤں کے مختلف مناظر تھے، ریلا ٹیلوں سے بھرے ویرانوں کی دلفریبی، تنہا کھجور کے اونچے تناور

اور قدیم درخت ڈھلتی دھوپ میں اکا دکا قدموں کے نشانوں سے زیادہ ہوتے ریت کے لہریے جو بل کھاتے لگتے تھے، اونچے ٹیلوں پر چڑھتے سورج کی لالی کا گلال، طویل سرابوں پر ہرنوں کی ڈاریں، ہرنیوں کے چوکنے بچے ذرا ذرا سی دمیں اٹھائے بھاگنے کو تیار۔ رنگین لمبی کلغیوں اور بڑی بڑی دموں والے پرندے جو جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے تھے، آڑ میں ہو کر صحرا پر جھانکتے ہوئے تیتر، افق کے قریب ملتے ہوئے جذبوں کی شدت سے تپتے ہوئے زمین و آسمان، شرمیلی مسکراہٹوں والی سیاہی مائل نیلی راتیں، سہاگ سنگار کو تاروں بھرے آنچل میں چھپائے اور کہیں کہیں زرد رو بیمار آہستہ خرام اکیلا چاند تیتر کے پروں جیسی بدلیوں کے قید خانے میں گھرا ہوا، اونٹوں کی لمبی قطاروں کے قدموں تلے نامختتم پُراسرار راستے۔

"کہاں جانا ہے؟" ایک نوجوان نے پوچھا، وہ بنچ کے قریب کھڑا تھا۔

"دین گڑھ"

"دین گڑھ" اس نے دہرایا اور پھر بے یقینی سے کہا۔ "دین گڑھ"

"ہاں دین گڑھ" میں نے مسکرا کر اپنے بہتر اخلاق کا گویا مظاہرہ کیا۔

"مگر صاحب بہادر!" اس کی آواز میں طنز نہیں تھا۔ "دین گڑھ تو یہاں سے کم از کم پچاس میل ہے، وہ بستی جہاں موٹر جاتی ہے دس میل دور ہے اس کے بعد ہم لوگ تو پیدل چلتے ہیں آپ کیا کیجئے گا، کبھی کبھی تو اونٹ بھی کرائے پر نہیں ملتے۔" میں نے جواب دینے سے پہلے اپنی موہوم امید کے سہارے پھر محکمہ زراعت کے انسپکٹر کے لیے دور تک نگاہ دوڑائی۔ لوگوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ اس جگہ جمع ہو گئی تھی اور سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے شام بڑی تیز سرسراہٹ سے کچے راستوں پر دھول اڑاتے ریوڑوں کے تعاقب میں گویا بھاگ رہی تھی، ریوڑوں کے ممیانے کی آوازیں موسیقی کے ختم ہوتے بند کی طرح دور ہوتی جاتی تھیں۔ لوگ اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ نزدیک ترین مگر نہایت مشکل راہوں کے متعلق آپس میں بحث

کر رہے تھے، نہایت محبت سے گویا وہ مجھے اپنی ذمہ داری سمجھ کر میری طرف سے فکر مند تھے۔

"وہ لاری جو آپ کو بنگلے تک لے جاتی سہ پہر کو ہی چلی گئی ہے اور اب آٹھ دن کے بعد دوسری لاری ملے گی، ہماری مانیں تو آپ بنگلے تک کسی طرح چلے جائیں، وہاں سے اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی اونٹ کرائے پر مل جائے گا۔"

"اونٹ پر دن کے وقت یہ کہاں سفر کر سکیں گے؟ دیکھتے نہیں ہو" کسی نے کہا۔

میں دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور واپس لوٹ جانے کے امکانات پر دل ہی دل میں غور کر رہا تھا۔ میں جو محکمے میں ترقی کا خواہش مند تھا اور اپنا آپ ثابت کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا، کھپ کے پودے اور ریشے کے لیے صحرا کی گرمی برداشت کرنا دیوانے کا خواب تھا اور میں نے اپنے ہیڈکوارٹر میں اپنے ڈائریکٹر جنرل کے سامنے یہ خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر کے لیے پتہ نہیں مجھے کہاں کہاں خوار ہونا تھا، مگر میرے اندر کے مسئلے کا ان کی باتوں سے کوئی تعلق نہ تھا وہ اپنی باتوں اور دین گڑھ جانے تک کی قیاس آرائیاں کیے جاتے تھے۔

جھومتے ہوئے اونٹوں کے برابر چلتے ہوئے لمبے کُرتے اور رنگین تہبند پہنے مضبوط مردوں کا ایک قافلہ پانی کے حوض پر اترا۔ جوان عورتیں ٹخنوں سے اونچے گھاگرے پہنے لڑکیاں گندھی ہوئی مینڈھیوں میں چاندی کے پھول پروئے ہوئے پیلے آنچلوں میں سے سفید چوڑیوں سے کہنیوں تک بھرے ہوئے بازوؤں والی بوڑھی عورتیں۔ گھونگھٹ ماتھے تک سرکائے ہوئے بہوئیں نہایت بھاری گھاگریں پہنے جو چلنے میں یوں گھومتے تھے جیسے لہر کا رخ کسی کنارے سے ٹکرا کر لوٹتا ہے اور بنا بیاہی جوان لڑکیاں سادہ اور رنگین کپڑوں میں ہرنیوں کی سی بد کتے والی چالیں۔ بچوں نے میٹھی گولیاں اور چنے خریدے لڑکوں نے بڑی بڑی آستینیں کہنیوں تک چڑھا کر منہ دھوئے اور مشکیزوں میں پانی بھرا

ادھر ادھر کی خبریں سنائیں۔

"لو بابو یہ لوگ دین گڑھ جا رہے ہیں اگر چاہو تو ان کے ساتھ جا سکتے ہو۔" لوگوں نے گویا اپنے قرض سے سبکدوش ہو کر کہا۔ "یہ اونٹ بھی کرائے پر دیں گے اور ساتھ بھی رہے گا۔ اکیلا آدمی پہلی بار سفر نہیں کر سکتا۔ کھانے پینے اور پانی کے ٹھکانوں کو ان سے بہتر کون جانے گا، یہی ساتھ ٹھیک رہے گا۔" سب نے کہا۔

جب میں ان کے ساتھ یزمان سے نکلا ہوں تو سائے گہرے سیاہ اور بہت لمبے ہو چکے تھے سورج آگ کے گولے کی طرح تپا ہوا سرخ تھا۔ اور مغرب کے سمندروں میں بجھایا جانے والا تھا۔ ہوا لوہار کی بھٹی کی آخری سانس تھی کہ تپش اور چنگاریوں کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ہم روہی کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس آخری پل کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے جو یزمان کے جنوبی علاقوں کو سیراب کرنے والی نہر پر تھا اور جس پر سے ہر آٹھویں دن کھڑکھڑاتی ہوئے ڈھیلے انجر پنجر والی پرانی لاری کچی سڑک پر دھول اور ریت اڑاتی گذرتی تھی، یہ دھول جو راہ کے ساتھ کی جھاڑیوں پر غازے کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

کجاوے میں ایک طرف میں سوار تھا اور دوسری طرف توازن کے لیے ان کا الم غلم سامان بھرا تھا۔ ہچکولوں سے میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی نہایت لمبی تانوں والے راگ جو آگے مہار پکڑ کر چلنے والے جوان اٹھاتے تھے اور کبھی کبھی اس میں عورتوں اور لڑکیوں کی آوازیں بھی مل جاتی تھیں، یہ لوریاں تھیں جو سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر ان کی سرد مٹھاس نہایت خواب آور تھی۔ کجاوے میں جگہ کم تھی اور اس میں بیٹھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا، مگر جانے کیسے مجھے نیند آ گئی۔

اس ٹھنڈک کے احساس سے جو ریت پر بہتی ہوا اپنے ساتھ لاتی ہے میں جاگ گیا۔ اونٹ بٹھائے جا رہے تھے اور تاروں کے اجالے میں جھاڑیوں کی مختلف خوشبوئیں جادو کے دیس کی سی آوازوں میں ملی تھیں، کیونکہ پرندے سوتے میں چونک گئے تھے۔ کال کڑچھی باریک

چیخ کے ساتھ ہمارے قریب سے تیر کی تیزی سے اُڑتی پھر واپس آتی اور رفضا کے سنجیدہ سکون کو پریشان کر رہی تھی۔

"یہ چادر لے لو ٹھنڈ اب اور بڑھے گی۔" قافلے کے سالار نے خوش دلی سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں ذرا سا ہچکچایا "یہ تو اونٹ کے کرلئے میں شامل نہیں تھا۔"

ہنس کر اس نے کہا "لے لو بابو تم ہمارے بچے ہو۔ یہ ریت اور آندھیوں کا ملک ہے یہاں راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور پھر ہم میں سے کسی نے ابھی تک اس چادر کو نہیں پہنا۔"

میں نے خاموشی سے چادر لے کر اپنے گرد لپیٹ لی۔

جھاڑیوں کی آگ کا الاؤ روشن تھا اور عورتیں روٹی پکا رہی تھیں۔ بچے سوتے میں سے اٹھائے جا رہے تھے۔ عجیب دل خوشی اور گہما گہمی تھی۔ سروں کے اوپر قریب اترے ہوئے تارے دُودھیا کہکشاں گھومتی ہوئی مستانہ خرام ہوا۔ جیسے ہم دنیا کے پہلے یا دنیا کے آخری انسان تھے۔ آگ کے لپکتے شعلوں میں بہوؤں کے تپتے ہوئے گالوں کا رنگ ان کی آنکھوں کی چمک اور ان کی آوازوں کی موسیقی بھری نازکی میں گھلا ہوا تھا۔ اونٹنی کے تازہ دودھ کا برتن اور گرم روٹی خوشبو اور رس سے بھرے تھے اور تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تو دوپہر کی دوڑ دھوپ میں کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ اس کھلے نیلے خاموش آسمان کے نیچے جھاڑیوں میں جھونکے سرسرا رہے تھے اور پرندے چونک چونک کر گویا کہانی سنتے ہوئے ہنکارے بھرتے تھے۔ پروں کی تیز پھڑپھڑاہٹ سن کر میں نے اوپر دیکھا تو میرے میزبان نے کہا "یہ سیاہ تیتر اور تیلور ہیں۔ آگ کو دیکھ کر جاگ گئے ہیں اور بے چین ہیں۔"

"سیاہ تیتر" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں یہ سیاہ تیتر جو سویرے جاگتا ہے تو خدا کی پاکی بیان کرتا ہے عبادت کرتا ہے" اس نے کہا۔

"اچھا سنا تھا وہ گھنے درختوں اور جنگلوں میں ہوتا ہے" میں نے نمکین دودھ کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا

"بابا پانی کی باس ہے"، ایک چھوٹے بچے نے اپنے دادا سے کہا۔

بوڑھے قافلہ سالار نے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ ہولے ہولے چاروں طرف گھمایا جیسے محبت کے سحر آگیں بوسوں تلے آنکھیں جاگیں پر کھلیں نہیں۔ اس کی بند آنکھوں تلے روشنی جاگی پرسکون چہرے پر لیکی مسکراہٹ میں ہوا کی طرح گھلی۔

"ہاں مٹھو" اس نے بچے کو اپنے کندھے پر بٹھالیا، "تو تو بڑا سیانا ہو گیا ہے، ارے پانی تو اوپر ہی کو آ رہا ہے"۔ اس کی آواز خوشی کی پکار تھی۔

"پانی آئے گا" سب ایک ساتھ بھاگے۔ جوانوں نے تیزی سے اپنی کدالیں کجاووں میں سے اتاریں اور تقریباً سخت جگہ کو دیکھ کر کھودنے لگے۔ عورتوں نے اون کے رنگ برنگ بھاری کپڑوں سے سامان کو ڈھک دیا، مہمان کا استقبال کرنے کو تیار ہو گئے جو ان جانے دلیسوں سے ان کی جانب آتا ہے۔

"سبیل مہمان کو نلاشی دے دو"، بڈھے نے کسی سے کہا اور خود کدال لے کر مٹیوں کی طرف چلا گیا۔

اس قافلے میں صرف میں تھا جو چپ چاپ یہ تماشا دیکھ رہا تھا جسے کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔

"یہ لو"، ایک لڑکی نے بھاری کپڑا مجھ پر تقریباً پھینک دیا، ملائم مگر مضبوط۔ پتہ نہیں یہ کپڑا انہوں نے کہاں سے خریدا تھا۔

"کھمن۔ کھمن"، بچے چلائے، سیاہ گہرا دھواں ساماروں کو ڈھانپتا چلا آتا تھا، تیزی سے روشنی کے اور لوگوں کے درمیان ایک پردے کی طرح تن رہا تھا۔ عورتوں نے آگ پر ریت ڈال کر اسے بجھا دیا تھا۔ ایک گہرا سناٹا چاروں طرف چھا گیا، منتظر منتظر اور لرزاں

ہوا بھی تھم گئی تھی۔

پانی سے بھرے نیچے میں بڑھیا نے کہا" اور کھمبے تلوار کی سی ہے" پھر دم دم جیسے کوئی شمع لیے ہوئے کھلے ایوانوں میں کوئی شے کھوجتا پھرے، سارے بادل جھک جھک روشن ہو گئے۔

"بہت پانی پڑے گا۔ اتنا کہ ایک سال کے لیے کافی ہو" بڑھیا نے کہا اور کوئی بولا تک نہیں، اجنبی خوشبوئیں ایک جھونکے کی طرح آئیں پھر ہوا جھاڑیوں میں سرسرائی اور پہلی بوند ٹپ سے میرے ماتھے پر گری۔ زمین تالیاں بجا کر گویا پانی کے آنے کی خوشی میں گانے لگی ہو، ہمیں آوازوں اور پانی نے گھیر لیا۔ سُن سُن کر کے تپی ہوئی ریت بجھ گئی میں فلاسفی کا خیمہ سا بنائے بیٹھا تھا اور اونٹ کی اوٹ میں تھا جو گردن بڑھا کر بلبلاتا تھا اور ہماری مسرت میں شریک تھا، پانی کی چادریں بجلی کے لہریوں اور بادل کے اندھیروں سے ہم پہ پردوں کی طرح گرائی جا رہی تھیں۔

"تم بھیگ تو نہیں گئے؟ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟" بڈھے نے نہایت اپنائیت سے سے پوچھا۔

"بیچارے کو ڈر تو لگ ہی رہا ہو گا" عورتوں میں سے کسی نے کہا۔

"یوں مت کہو مرد تو انجانے سے لڑ جاتے ہیں اور یہ تو صرف پانی ہے یہ اور بات ہے کہ اس نے کھلے میں اتنی برسات ہوتی کبھی نہیں دیکھی ہو گی"۔ پتہ نہیں یہ کون تھی، دھاروں کے درمیان ہم جیسے بھنوروں کے بیچ ہوں بچے بہتے پانی پر گر جاتے ہیں۔ پھینکے اور گھمائے جاتے۔ بھک سے روشنی ہوتی اور گڑگڑاہٹ سے رتھ گزر جاتے اور بن چکی کے پاٹ رگڑ کھا کر چیختے۔ قدرت کی وحشی طاقتیں یکایک آزاد ہو گئی تھیں۔ ہوا سنتی اور پانی کی چادروں کو پورے زور سے جھٹکتی پھر جھک کر بھاگتی اور چک پھیریاں کھا کر گرتی اور سنبھلتی۔ اندھیرا بادل کے ایوانوں میں روشنی کے ساتھ آنکھ مچولی

کھیلتا تھا اور غصہ ور سنجیدگی کے ساتھ آگ انہیں کوڑے مارتی اور بے فائدہ روکتی تھی۔ زمین چپکے چپکے ہنستی، روکنے کی کوشش میں ٹھنڈے سانس بھرتی تھی اور بے کسی سے گویا دامن پھیلائے ہوئے تھی، بھیڑ بکریاں اچانک ممیاتیں اور پھر چُپ ہو جاتیں۔ پانی پڑ رہا تھا۔ بے رحمی سے بنا رکے۔ ظالم دشمن کی طرح چھا گیا تھا۔

اگلی صبح ہم تازہ دم نہائے ہوئے اونٹوں پر آگے چل رہے تھے۔ بانسری کی طرح صحرا راگوں سے بھرا تھا۔ ہزار تانیں اَن دیکھے پرندوں کی بولیاں۔ ریشمی سرسراہٹ سے بہتی ہوئی ریت اور پانی میں جھلکتا سبزہ، اونٹ کی مہار میں بندھی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جیسے جل ترنگ ہو، باری باری اپنی الگ الگ راگنیوں سے بج رہی تھیں اور پھر بھی وہ اُن تانوں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں جو کوے اور کاونیاں جھاڑیوں میں اڑ رہے تھے۔ چرواہے بکریوں اور مویشیوں کے گلے چراتے پھرتے تھے اور ناز بھری لمبی لے والے راگ گا رہے تھے گھاس میں ہر طرف ٹیں ٹیں سنائی دیتی تھی، گویا کسی بڑے باجے کے سُر بجانے سے پہلے درست کئے جا رہے ہوں۔ میں گھبرا کر ایک ٹوبے کے اونچے کنارے پر کھڑا ہو گیا اور آوازوں کی سمتوں کی دریافت کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ سب کچھ لکانے میں لگی تھیں۔

"یہ جادو نہیں ہے۔ جانوروں کے گلوں میں گھنٹیاں ہیں کہ وہ گم نہ ہو جائیں ان کی الگ الگ پہچان رہے۔" یہ شاید سبل تھی۔

"یہاں گم ہونے کیلئے کونسی جگہ ہے،" میں نے کہا۔

"واہ کیا گم ہونے کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے گم ہونا ہوتا ہے ہو جاتا ہے،" وہ سخت خفا تھی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا دیکھتے ہو اجنبی مہمان ماں پوچھتی ہے گڑ تم کو روٹی کے اندر پکا دیں کہ تم گڑ

سے روٹی کھاؤ گے؟"

"سب ٹھیک رہے گا" میں نے ٹوبے میں جھانکتے ہوئے کہا جو صحرا میں کسی آنکھ کی طرح گہرا کھلا ہوا روشن اور ٹھنڈا تھا۔ چشمے کی طرح نغمہ طراز اور پُر غرور۔

لائی لانے اور پھوگ پر بہار آئی تھی۔ اغن اور پپیہے بولتے تھے اور دھلی ہوئی ریت یوں چمکتی تھی جیسے اس کے ہر ذرے میں آفتاب اترا ہوا اور صحرا آئینے خانہ ہو۔ نکھری افق پر دو نیلے دھبے سے دکھائی دے رہے تھے" وہ ساون کی جھوک ہے" ایک نوجوان نے مجھے روٹی پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا لوگ اکیلے اکیلے بھی رہتے ہیں" میں نے نوالہ توڑ کر منہ میں بھر لیا۔

"یہ تو پھر بھی دو چار گھر ہیں۔ روہی میں تو ایک ایک گوپے کی جھوک ہوتی ہے۔"

بڑھیا نے مہربان مسکراہٹ سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا" اچھا ہوا تم آ گئے تمہارے قدموں کی برکت سے روہی وقت سے ذرا پہلے آباد ہو گئی ہے۔

"اماں میں تو ان باتوں کو نہیں مانتا" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہ مانو تمہاری مرضی۔" اس کی آنکھوں کی چمک بڑی گہری تھی جیسے جھیل کی سطح کرن سے جگمگائے روشنی کسی آئینے کو چھوئے بالوں کی سفیدی کے مقابلے میں یہ آنکھیں حیرت انگیز طور پر صحت مند تھیں اور معصوم ٹوبے میں آسمان اترا ہوا تھا۔

اونٹ جھاڑیوں پر منہ مار رہے تھے۔ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ کر تتلیوں کو پکڑ رہے تھے جو جھاڑیوں کے تنوں سے نکل رہے تھے۔ چھوٹی لڑکیاں اونٹوں کی ٹانگوں کے اندر باہر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں ہوئیں اپنے منوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور ریشم کے تاگوں سے کپڑوں پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ کنواری لڑکیاں ڈنٹھلوں سے ریشے الگ کرتی جاتی تھیں اور جوان سوت بٹنے میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ جیسے سکون کے ساتھ گاؤں

آباد ہو گیا ہو۔ بڈھے نے اکتارہ نکالا۔

روہی لگڑی اے ساونی تریت ولا ہوت مہاراں
کھنیاں کھمن رنگیلڑیاں رم جھم بارش باراں
سارے سگن سہاگڑے یار ملیم آ باراں
بدلے گھوڑھے سانورے وٹح برسات دیاں دھاراں
کارن ڈھڑے یار دے گل گلزار بہاراں
سوہنا عربی سانورا آہو ساڈیاں ساراں

وہ ایک ایک بول کو کئی کئی بار دُہراتا تھا اور آنکھیں بند کئے لے میں کھو گیا تھا۔ بچے کھیل چھوڑ کر آلتی پالتی مار کر ریت پر بیٹھے تھے۔ بہوؤں نے اپنے بیل بوٹوں والے کپڑے الگ رکھ دیئے تھے۔ جوان لڑکے رسی بٹتے ہوئے جھومتے جاتے تھے۔ مجھے اپنے اندر ساری حرکتیں رک کر ایک نقطے پر جمع ہوتی لگتی تھیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پاؤں تال دینے کے لیے گویا بے چین تھے۔ پھر سبل کا سر اس کے گھٹنوں پر جھکتا چلا گیا جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ سسکیاں روکنے سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ اِکتارے پر تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ بجانے والا اپنا خونِ دل تاروں سے لگا رہا ہو۔ عبادت گزار کی طرح اپنے سارے اندر اور باہر کے جذبوں کے ساتھ۔

بُڑھیا نے سبل کے گندھے ہوئے بال کھول دیئے۔ فضا یک لخت بہت بوجھل ہو گئی اُن منے دل اور بھاری قدموں سے اپنے وجود کو گھسیٹتی وہ دونوں ہاتھ ٹیک کر اپنے گھٹنوں تک اٹھی اور کسی نامعلوم محبوب کے سامنے جھک گئی۔ لمبے سیاہ بال کوڑوں کی طرح سیدھے ہوئے اور گردن بے پناہ رفتار سے گھومنے لگی جیسے ان کوڑوں کی زد سے بچنا چاہتی ہو۔ اکتارے پر بڈھے کی انگلی بے پناہ مشاقی سے چل رہی تھی۔ زندگی اور موت کے مقابلے میں وہ ہارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور نہ سبل ٹھہرنے کا۔

میری رگوں میں سنسناتی خون کی روانی سرد پڑ گئی۔

جانے کتنی دیر کے بعد لڑکی کا سر اس کے کندھوں پر کم رفتار سے گھومنے اور جھکنے لگا پھر وہ ڈھے گئی اور بڑھیا نے اپنے زرد موٹے دوپٹے سے ڈھک دیا۔ سرد سوت کو اینٹھنوں پر سب لپیٹنے لگے بڈھے نے اکتارے کو کجاوے میں رکھ دیا۔

"ہم تو آپ روحی کی روحیں ہیں"۔ وہ بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا اور نہایت اداس تھا۔

یہ راستے کسی زمانے میں آباد تھے خوب رواں تھے۔ تباہی کی ہوائیں چلیں اور فنا نے ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ بے چین مخلوق نے یہاں وہاں قبضہ کر لیا۔ اب وہ کبھی کبھار کسی کو بے ڈھب پکڑ لیتی ہیں۔

لڑکی زرد دوپٹے کے نیچے آہستہ آہستہ ہلی۔ اسے ہوش آ رہا تھا۔ عورتیں مل کر اسے دبانے لگیں۔ بڑھیا نے اسے گھی ملا دودھ پلایا۔ اس کا چہرہ بالوں کی سیاہی میں دوپٹے سے بڑھ کر زرد تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی گویا زمانوں سے پیدل چلتی آ رہی ہو۔ کسی روح نے اسے نہایت بے ڈھب پکڑا تھا۔ دوسری رات ہم نے ساون کی جھوک سے آگے نکل کر پڑاؤ کیا۔ اونٹنیوں کے دودھ کی نمکین خوشبو روٹی کی رسیلی باس سے ملی تھی اور بچوں کا رونا راگ لگتا تھا۔ بہوئیں لڑکیوں اور لڑکوں کو جگا اور سلا رہی تھیں۔ میں نے سبل سے کہا۔ "آج تو تم کل کے تماشے کو نہیں دہراؤ گی!"

اس نے منہ پھیر لیا۔ سفید دیدے گھما کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائی تک نہیں۔ اونچی گھاس چاروں طرف تھی۔ بڑھیا نے کہا کھپ کاٹو لڑکو۔ ذرا کچا بھی ہو تو کیا ہے۔ اس کے دھاگے سے ہم سبل کے بیاہ کا جوڑا بنا لیں گے۔ درانتیاں لے کر سب کاٹنے میں لگ گئے۔ میں گٹھے باندھنے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ گٹھے بندھواتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ سبل تمہارے بیاہ کے جوڑے میں میرا ہاتھ بھی لگ گیا ہے۔ اس نے گردن کو اور

اونچا کرلیا بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو پورا کھول کر میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر کام میں لگ گئی۔

یہ عجیب آزاد زندگی تھی۔ میری دنیا سے یکسر مختلف۔ مجھے تو اس زندگی سے پیار ہو چلا تھا۔ کہیں جانے کی جلدی نہیں، کچھ کرنے کی جلدی نہیں، کوئی عجلت نہیں، کوئی ڈر نہیں، کوئی قانون نہیں اور پھر بھی ایک نظام ہے، مربوط اور سادہ جس سے ہر کام ہوتا ہے اور اندر بس امن ہی امن تھا۔ سکون ہی سکون۔ نفرتیں کدورتیں۔ سب دھل دھلا کر گویا سب کچھ اجلا ہو گیا تھا۔ میں پہلی بار راتوں کی سجاوٹ کے جادو سے آشنا ہو کر ان کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ رات کی آوازیں اس کا سحر، ستاروں کی ان سنی جھنکاریں، ٹوٹتے ہوئے تاروں کی روشنی اور لکیریں، صرف رات کو بولنے والے پکھیرو، پچھلی راتوں کو خوشبو دینے والی گھاس کی سرسراہٹ، ریت پر نرم چلنے والی ہوائیں۔ سیاہی کے اندر سے پھوٹنے والی روشنیاں اور سناٹے کی گونج جیسے مجھ پر وحی اتاری جا رہی ہو۔

بے نام و نشان بے سمت کی اس دنیا میں آسمان پر بکھرے لاتعداد تاروں میں سے چند کی رہبری میں سفر کرنا وقت کا اندازہ بھی ان کی مدھم پڑتی اور تیز ہوتی چمک سے کرنا۔ حیرت نے میرے اندر اپنے ڈیرے ڈالے تھے۔

"اگر تم محض کھپ کے لیئے دین گرڈھ جا رہے ہو تو یہ تکلیف کیوں اٹھا رہے ہو۔" بڑھیا نے ملنے ریشے کو دو انگلیوں کے درمیان آہستگی سے کھینچتے ہوئے کہا "مجھ سے بڑا ماہر تم کو ساری روہی میں کوئی نہیں ملے گا۔" وہ ذرا سا ہنسی۔ "ہاں جوان" میرے میزبان کے بیٹے نے کہا۔ "ناں کو سب پتہ ہے۔" پھر وہ مجھے بتاتی رہی کیسے موسم میں گھاس کے گٹھے بنائے جاتے ہیں اور سخت جاندار کپڑا بنانے کے لیے اسے کاتا جاتا ہے۔ جب نرم اور ریشمی ملائم کپڑا بنانا ہو تو اسے بھگو کر رکھتے ہیں، کوٹتے ہیں اور زیادہ ملائمت پیدا کرنے کے لیے کون سی چیزوں کو اس میں شامل کرتے ہیں۔ کون سی جڑی بوٹیاں اس کام میں کہاں سے ڈھونڈی

جا سکتی ہے۔ خوب گہرا رنگ دینے کے لیے کتنے دنوں لوہے کے برتن میں یا زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں، کون سے پھول کتنے مسلے جائیں تو کیا رنگ بنتا ہے۔"

میں بے دلی سے سنتا رہا اور سبل کو دیکھتا رہا جو نہایت پر غرور اور بے حد کم گو تھی جس پر راگ سن کر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اور جس کی زردی میں چاند کی روشنی گندھی تھی جو اجنبی مہمان کو ذرا سی اہمیت دینے کو تیار نہ تھی۔

بڑھیا نے کہا، "آتی سردی میں ہم سبل کا بوجھ اٹھا دیں گے۔ پھر میرے چھوٹے بیٹے کی بہو آئے گی۔ کھپ کا کپڑا بنانے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ بہت سیانی ہے اور بڑی دلیر۔"

مگر سبل تو بیمار ہے"، میں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے بابو۔ یہ بیماری نہیں شدت ہے شدت۔ سمجھتے ہو شدت کیا ہوتی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کو نظر ہے اوپر والوں کی پکڑ ہے۔ بہت اچھی صورت والوں کو شدت ہو جایا کرتی ہے۔ میری بہو کے بھائی کو بھی پکڑ ہے وہ بڑا گبھرو جوان ہے جب دورہ پڑتا ہے تو ٹوٹے تنے کی طرح ڈھے جاتا ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے بیٹے جب تک زندگی ہے سب چلتا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے اور موت کے آگے تو کسی کا زور نہیں۔"

میں ریشوں کو ہاتھ میں سے گزار رہا تھا اور بظاہر ان پہ جھک کر خوب غور سے دیکھ رہا تھا کہ سبل نہایت ہوشیاری سے وہ کچے ڈنٹھل الگ کر رہی ہے جن کے ریشوں سے آئندہ سردی میں اس کی شادی کا جوڑا تیار کیا جانے والا تھا، ہرنوں کی ایک ڈار اونچے ٹیلے پر سورج کی لالی میں دکھائی دی گویا ہوا کی گنگناہٹ میں خطرے کی بو سونگھ رہی ہو۔ پرندے شور مچاتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے اور جھاڑیاں ہولے ہولے ہلنے لگیں جیسے ان کی آمد کی منتظر ہوں۔ فضا جاگی ہوئی چوکنی اور اپنی آوازوں کے ساتھ دن رات جاگتی ہے۔ اگر میں چند دن اور اس جادو کی سرزمین میں رہا تو اس طلسم سے رہائی

ناممکن ہو جائے گی۔ اپنے دل پر میری گرفت یونہی سدا سے کمزور ہے۔ ابھی سے یہ زمان مجھے کسی دوسری دنیا کا شہر لگنے لگا تھا ایسا دروازہ جس کے پار کی دنیا میں کبھی میں معلق تھا اس زندگی میں اور اس زندگی میں مجھے صدیاں حائل لگتی تھیں۔ یہ نئے رشتے جو میں نے ان دنوں آسمان اور زمین سے جوڑے تھے حیرت زدہ کرنے والے قدم قدم پر قدم پکڑنے والے تھے۔ فضا اور راگ راگنیوں کے دھارے آسمان، پھول اور زندگی دینے والی زمین سے میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

مجھے کھپ پر ساری تحقیق اور محکمے اور ترقیاں بیکار کا کھیل لگنے لگے تھے ، وقت گنوانے کا ایک ذریعہ۔ مگر مجھ میں ہمت کی کمی تھی اس حیرت کدے سے ناتا جوڑے رکھنے کیلئے بڑھیا نے کہا تھا، "اگر تم نے کھپ کے ریشے سے کپڑا بنانے کا راز سمجھ لیا تو تم کو کیا ملے گا۔"

میں نے کہا تھا، ہمارا ملک ترقی کر سکے گا۔ ہم دوسروں کے مقابلے میں اپنا آپ ثابت کر سکیں گے۔

"پھر کیا ہوگا اس سے آگے اور اس سے آگے"۔ اس سادہ دل عورت نے مجھ سے نہایت مشکل سوال پوچھا تھا۔ اس سے آگے اور پھر اس سے آگے۔

"کیا دھرا ہے ان سب باتوں میں، آدمی کی ضرورتیں ہی کیا ہیں؟ اماں نے مجھ سے کہا اسے ملک اور ترقی جیسے بڑے بڑے لفظوں کے مطلب کیا سمجھ میں آتے۔

قافلہ سالار نے کہا تھا، "بچے تم اس کی باتوں میں مت آنا۔ تمہاری اپنی زندگی ہے، مگر مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی، دنیا آگے جائے یا پیچھے آدمی کے لیے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم دیکھتے ہو نا۔ دین گڑھ کے قلعے کو، ان پانچ کنوؤں کو، ان مٹے ہوئے شہروں کو، یہاں سے پرے اور بھی ایسے نشان ہوں گے ہماری طرح ہم سے بہتر لوگ ہوں گے۔ پر وہ لوگ کہاں ہیں؟ موت اچھا برا برابر کر دیتی ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

اَمر بیل

چاند ابھر کر میری کھڑکی کے برابر آن رکا ہے۔ پر بہو نہ جانے اب تک کیوں نہیں آئی۔ دُور مندر میں مردنگ پر کوئی بھگوان کی لیلا گا رہا ہے۔ بہو آئے گی تو اس کے بچھوؤں کے بجنے سے جیسے ٹھہرے پانی میں پتھر گرے ذرا سا راگ پیدا ہوگا۔ پھر وہ سولہ سنگار کئے آن کر میرے چرن چھوئے گی اور سر جھکا کر کھڑی رہے گی۔ میں اس کو آشیرباد دونگی سدا سہاگن رہنے کی، سدا سکھی رہنے کی، سدا جوان رہنے کی، سُورِیر جوان بیٹوں سے گود بھرنے کی، عورت کی آشائیں کتنی کم ہیں۔ وہ گھنے پیڑ کی طرح دھرتی کی گود سے نکل کر اس پر چھا جانا چاہتی ہے۔

ہر کرواچوتھ پر یہی ہوتا ہے نند لال کی ستونتی بہو برت کھول کر ایک سال کے بعد اس اندھیری گلی میں سے جو بڑے گھر کے پچھواڑے سے پرانے گھر کے آنگن میں آن نکلتی ہے گزر کر میرے پاس آشیرباد لینے آتی ہے۔ میری باتیں سن کر اس کا چہرہ پھول کی طرح ہولے ہولے کھلتا ہے پیلی ساڑھی میں اس کا ترشا ہوا جسم جیسے کسی مورتی کا بہت بھلا لگتا ہے۔ گلال سے لال کئے ہوئے پاؤں میں بچھوے پہنے پور پور سنگار کئے ہوئے وہ ایسا دیولا لگتی ہے جس سے سارا جگ روشن ہو جائے۔ جوانی تو آپ روشنی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار مجھے یوں جان پڑتا ہے جیسے اس کے چہرے سے چاند کی کرنیں نکل رہی ہیں۔ اور کیا پتہ

ایسا اس لئے لگتا ہو کہ میری آنکھوں میں اب جوت نہیں رہی اور مجھ سے خود سیدھا کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ کرواچوتھ کی اس رات جب میں سنگار کر کے آدھی رات کو دیا جلاتی ہوں تو میرے ہاتھ کانپتے ہیں اور آگے پیچھے سنسناتے اندھیروں میں سے کسی کے قدموں کی چاپ اُس چپ کے جادو کو نہیں توڑے گی جو جنم جنم سے میرے نصیب میں لکھا ہے پھر دئے کی لَو ساری رات مدھم مدھم جلتی رہتی ہے، اور چاند آنگن کی اُس دیوار سے پرے ڈوب جاتا ہے جب یہ دیا جلتا ہے تو مجھے معلوم ہے وہ زندہ ہے وہ جس کے لئے میں ایسا پیڑ بن گئی ہوں جس میں نہ پھول آئے نہ پھل وہ جس کی ایک جھلک دیکھ کر میں نے اپنا سارا کچھ تج دیا تھا۔ میرے لئے کرواچوتھ پہ دیا جلانا اور سنگار کرنا دھرم کے سمان ہے۔

پر بہو ابھی تک نہیں آئی اور کھڑکی کے کھلے پٹ ہوا کے زور سے یوں بج رہے ہیں جیسے دو آتمائیں گلے مل رہی ہوں چاند ابھرتی ڈوبتی ناؤ کی طرح گھٹاؤں میں سے بہتا جاتا ہے اور جب وہ ابھرتا ہے تو کھڑکی کے ساتھ لگی بیل کی ایک کونپل چمک اٹھتی ہے جیسے اس میں جوت سما گئی ہو۔ ساری جوان چیزیں روشنی ہیں اور سارا اندھیکار بڑھاپا ہے۔ پر جب چاندی کے دیوے کی لو بھڑکتی ہے تو اس ننھے سے شعلے سے جانے یوں کیوں لگنے لگتا ہے کہ میں نے اپنے بالوں کی سفیدی میں سیاہی بھر لی ہے اور سنگار نے مجھے ویسا ہی چنچل بنا دیا ہے، جیسا بہو کو۔

اب یہ بھی تو میرا ایک وہم ہے کہ دیا ضرور جلایا جائے اور وہ جس کے لئے یہ ساری دیوالی میں برسوں سے جلا رہی ہوں اسے اس کی خبر بھی نہیں۔ من ہی من میں ہنس دیتی ہوں۔ دھیرے دھیرے بند کواڑوں کو کھولتی ہوں وہ مورتی اس آسن پہ رکھتی ہوں۔ اپنے سہاگ کے لئے پرارتھنا کرتی ہوں۔ آدمی کبھی کبھار پاگل کیوں ہو جاتا ہے۔ ایسے سپنے کیوں دیکھتا ہے جو کبھی سچے نہ ہوں گے، ایسے راستوں سے کیوں چلتا ہے جو کہیں نہ پہنچیں گے پہلے پہل میں نے اپنے آپ سے بہت باتیں کی ہیں۔ اب تو ایسا

سناٹا ہے مانو کوئی آواز کبھی تھی ہی نہیں، باندیاں کہتی ہیں۔
"کیسی بڑھیا ہے، کبھی مندر تک نہیں گئی۔"
نند لال کے بیٹے کہتے ہیں۔

ابھی تک ماں کا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔

بہوئیں اپنے بچوں سے کہتی ہیں۔ "دیکھو دادی ماں کو ستانا نہیں انہیں آرام کرنے دو چپ رہنے دو کبھی کبھار جاکر پرنام کر آیا کرو۔"

اور وہ خود بھی بس کرواچوتھ کو اشیرباد لینے آتی ہیں دور کھڑی رہتی ہیں اور میرے چہرے پر ٹھہراؤ، سناٹے اور چپ کو دیکھ کر سوچتی ہیں جانے اس کا جی اس قید سے گھبراتا بھی نہیں ہے۔

پھر میرے چرن چھو کر وہ واپس چلی جاتی ہیں اور ان کے پیچھے ان کے بچھوؤں کے گیت گونجتے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے سے نکلی کرنیں مجھے کھینچ کر پیچھے لے جاتی ہیں مانو میں ایک کمزور ناؤ ہوں، لہروں کے تھپیڑوں سے کبھی آگے جاتی اور کبھی پیچھے آتی۔

اندھیری گلی میں بہو کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے میں نے سنگار کا پٹارہ پرے کھسکا دیا ہے۔ بہو آگے آؤ دوار میں کیوں کھڑی ہو میں تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔

"ماں جی آج کیسی تیز ہوا تھی مندر میں جانے کہاں سے جھونکا آیا کہ میرے دیئے بجھ گئے اب کیا ہوگا؟" اس کی آواز میں آنسوؤں کی رندھن ہے۔

"دیئے بجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بہو رانی۔ تم وہموں میں مت پڑو۔ تم نے پھر سے انہیں جلا لیا ہوتا"، میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہتی ہوں، اس کے نرم بالوں کی سیاہی پہ میرے کھردرے ہاتھوں کی سفیدی بڑی عجیب لگتی ہے۔ بہو کے بالوں میں پھول ہیں اور ان کی سوگندھ سے میری کوٹھری مہک اٹھی ہے۔ وہ میرے پاؤں میں بیٹھی ہے اور بڑی اداس

لگ رہی ہے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی جوت ستاروں کی طرح لگئی ہے۔

پھر میری باتیں سن کر اس کا دل کچھ ٹھکانے ہوا ہے وہ کھڑکی سے باہر جھکنے والی کونپل کی طرح خوش ہو رہی ہے۔ سر اٹھا کر اس نے اس اندھیکار سے بھری کوٹھری میں ادھر ادھر دیکھا ہے کالے بادلوں کی فوجیں کھڑکی کے سامنے سے اڑتی جاتی ہیں۔

"ماں جی دیئے بجھنے سے تو کچھ نہیں ہوتا نہ۔ میں کل پوجا کر داؤں گی۔ برہمنوں کو بھوجن کراؤں گی پرماتما اس کٹھن گھڑی کو ٹال دیں۔" اس کی آنکھوں میں امید ہے۔

ہاں بہو نراش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب جا کر سو جاؤ۔ تم کو اچھے سپنے دکھائی دیں گے۔"

بہو کے بچھوے اندھیری گلی میں بج رہے ہیں۔ اب وہ بڑے گھر میں چلی گئی ہے۔ اس کے اور میرے درمیان ساری بیتی صدیاں ہیں۔ وہ سارے زمانے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ وقت بھی جو ہم نے الگ گزارا ہے۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے بہو نے اور میں نے کبھی چار گھڑی بھی ایک ساتھ نہیں گزارہ کیا۔ اور پھر بھی وہ میری بہو ہے۔ انسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ناطہ کتنی کچی ڈور میں بندھا ہے۔ آدمی ایک دوسرے کو کتنا کم جانتے ہیں اور پھر بھی کتنا ہنستے ہیں اور آج تک کوئی بھی تو ایسا نہیں جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ جو میرے اتنے قریب رہا ہو جس نے میرے دل میں جھانکا ہو جس کو میں نے اپنی ساری پاگل آشائیں اور دیوانے خیال بتائے ہوں سارے آدمی اکیلے اکیلے کیسے گزر جاتے ہیں اور وقت کیسے بیت جاتا ہے۔

آئینہ دیکھتی ہوں تو کہتا ہے۔ بڑی بہو رانی سمے بیت گیا ہے۔ پدمنی سمے بیت گیا ہے ستونتی سمے بیت گیا ہے۔ ستی ساوتری سمے بیت گیا ہے۔ وہ جس کے سہاگ کے لئے میں یہ دیا جلاتی ہوں وہ بھلا میرا کون ہے؟ میں نے اسے دیکھا ہی کب ہے؟ سہاگ کا پٹارہ کھلا رکھا ہے یہ سولہ سنگار کیوں کرتی ہو پدمنی۔ دبے قدموں چپکے چپکے

کوئی بھی تو تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔ کوئی تمہاری آنکھوں پر ہاتھ نہیں دھرے گا۔ کوئی تمہیں کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا نہیں کرے گا۔ تم ہاتھوں کو لال کیوں کرتی ہو۔ پٹارے میں سوکھی لالی کی طرح ہاتھ بھی سوکھے ہیں۔

پرم آتما

اور یہ ریکھائیں تو اب مٹ گئی ہیں۔

اور ان ہاتھوں میں اتنی ہمت بھی تو نہیں کہ آئینے کو سیدھا پکڑ سکیں دیے کی کانپتی لو کی طرح کانپتے ہاتھوں میں اب ہمت کہاں سے آئے گی۔

اور نند لال کو مرے بھی تو زمانے بیت گئے ہیں۔

چاند اب بوڑھے برگد کی اوٹ میں ہو گیا ہے اور ہلتی شاخوں میں سے چاندنی کھڑکی کی چوکھٹ پر سے پلٹ پلٹ جاتی ہے۔

پورب کی ہوا میں منت کرتی ہوں آج کی رات تو میرے دیئے کو جلنے دینا۔

مگر پورب کی ہواؤں نے کبھی میری سنی ہے جو آج سنیں گی۔

میں نے کبھی کبھار کتنی منتوں سے کہا ہے کہ اس دیس کی باس تو میرے لیے لادے وہ دیس جس کی مٹی نے مجھے جنم دیا تھا وہ مٹی جس کی باس نند لال کہتا تھا کہ میرے انگ انگ میں رچی ہے۔ اس دیس کی راتوں کی سیاہی میرے لمبے گھنے بالوں میں تھی۔ اُن برساتوں کی طرح میری آنکھوں نے برس برس کر اس پرانے دیس میں راتوں اور دنوں کا فرق مٹا دیا تھا۔

میں تو ایسے پودے کی طرح ہوں جسے کسی نے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کی کوشش کی ہو، پرائی دھرتی نے مجھے سویکار نہیں کیا۔ میں ایسے ٹھنٹھ کی طرح ہوں جس پر کوئی کوئل کبھی نہیں گائے گی۔

پرندے پر مارتے تیز تیز اڑتے ہوئے میرے قریب سے نکل جائیں گے اور کبھی کسی

نرم پروں والی بھولی بھالی چڑیا کے کمزور پاؤں مجھے نہیں چھو سکیں گے۔ تالابوں میں جل پریوں کی طرح نہاتے غوطے لگاتے، چمکتی جھاگ اڑاتے۔ ناریل کے پیڑوں سے گھرے گاؤں میں رہتے۔ میں رُکمنی سے اور ماں سے بچھڑ گئی۔

وہ گاؤں میری یادپریوں ابھرتا ہے جیسے دُھند کے پرے سے بادلوں پر بنی شکلیں دکھائی دیں۔

اکتارہ بجاتا کوئی سادھو مندر سے نکل کر بستی کی طرف جا رہا ہے، اس کی آواز زمانوں کے پار سے مجھے کھینچے لئے جاتی ہے، اس ایک پل کی طرف جو میرے اور میرے مائکے گھر کے درمیان لٹک رہا ہے پر جس پر سے گزر کر دوسری طرف جانے کی ہمت کبھی مجھ میں نہیں آئی۔

مینا متی کے کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے رکمنی کو اور مجھے ایک پتھر کا ٹکڑا ملا تھا۔ ایک دیوی اور دیوتا کی مورتی تھی۔ جب ہم نے اسے تالاب کے پانی میں دھویا تو میل مانجھے سے چھوٹ گیا اور وہ پتھر چاند کی طرح پیلا نکل آیا۔ ماں نے ہم سے لے کر اسے طاق میں سجا دیا تھا۔ بھگوان کی مورتی کے ساتھ ساتھ روز اس پر بھی پھول چڑھاتی اور اس کے آگے بھی ماتھا ٹیکتی۔ اس سال مجھے یاد ہے گاؤں والے بہت نہال ہو گئے آکاش سے مانو چاندی کی برکھا ہوئی۔ مچھلی بیچنے سے دھان بیچنے سے ہر گھر میں لکشمی دیوی آگئی، ان دنوں بابا بانس کے گھر سے باہر چوپال میں بیٹھے گڑگڑی پیا کرتے اور بہت خوش رہتے۔ گائیں خوب دودھ دیتیں ایسے کہ ماں روز ہم کو بھات کی کھیر لپکا دیتی جس میں خوب تیز میٹھا ہوتا۔ وہ مٹھاس میری زبان پر چپک سی گئی ہے دنیا کی ساری چیزیں مجھے ملیں اتنا بڑا گھر، دھن دولت، پر وہ مزا میں بھول نہیں سکی۔

نئے نئے کپڑے پہن کر ہم لوگ میلہ دیکھنے جاتے۔ ہاٹ بازار میں ماں جب مچھلی دے کر آتی تو اس کی ساڑھی کے پلو میں بندھے اور کمر میں اُڑسے پیسے ہم کو دُور ہی سے

دکھائی دے جاتے۔ ان دنوں اس نے سونے کی نقلی بنوا کر مجھے اور رکمنی کو دی۔

تاڑی پی کر ناچنے والوں کے قدموں میں جادو سا لگتا۔ اور تاڑی کی باس سے بے ہوش مکھیاں ناریل کے پیڑوں کے نیچے جھولتی لگتیں۔ ہمارے گھر میں طاق پر سجے دیوی دیوتاؤں کی آنکھوں میں نکھار سا آتا گیا۔ میں اور رکمنی کبھی چپکے کھنڈروں سے لائی ہوئی مورتی کو اتار لیتیں اور اپنی گڑیوں کے گھر میں رکھ کر ہمسائے میں کھیلنے چلی جاتی کئی دفعہ ماں نے منع کیا تھا کہ مورتیوں سے کھیلو تو اتنا بڑا پاپ ہوتا ہے جس کا پرائشچت نہیں ہوسکتا۔ پر ان دنوں جب ساری دنیا کھلونا لگتی ہو۔ مورتیوں سے نہ ہی ڈر لگتا ہے اور نہ ہی پاپ سے۔

پھر برسات لگی اور آکاش بھی برس کر گاؤں میں آن بسا۔ گاؤں تالاب بن گیا اور بانس کے گھر بارش میں بہہ گئے وہ طاق جس پر مورتی سجی تھیں، اندھیرے میں گم ہوگیا۔

یہاں آکر جب میں نے مٹی کی ایسی ہی مورتی دیکھی ہے تو مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ دیوی ہارتی تھی زندگی کی دیوی۔ پیدائش کی دیوی۔ دیوی جو اپنا سایہ ڈالے تو بہوؤں کے سہاگ میں پھول لگتے ہیں دیوی جو ناراض ہو جائے تو گود سونی ہو جاتی ہے دیوی جو خوش ہو تو گھر بچوں سے بھر جاتا ہے۔ دیوی جس کی مدھر مسکان عورت کو دھرتی کے سمان بنا دیتی ہے۔ اور وہ دیوتا پنچکا ہے دولت کا دیوتا سونے روپے، کھیتوں پر برستے حسن کا ہاٹ بازار میں ماں کے پیسوں سے بدھل ٹپو کا بابا کے چوپال میں بیٹھ کر باتیں کرنے کا اور تاڑی کی باس پر مست ہو کر جھومتی مکھیوں کا۔ اس اندھیر کی سمجھ مجھے آج تک نہیں آئی کہ دیوی دیوتاؤں سے کھیلو تو پاپ ہوتا ہے۔ پر اگر دیوی دیوتا ہم سے کھیلیں تو؟ ہم کیا کھلونے ہیں؟

مینامتی کے کھنڈروں میں سے نکلی مدھ بھگوان کی سیاہ پتھر کی مورتی کو میں پہروں دیکھا کرتی تھی۔ جب گائے کو لے کر چرانے نکلتی تو چھوٹی چھوٹی ندیوں پر سے پھلانگتی میں اس چپ

کے شہر میں چلی جاتی۔ دیواروں پر بنی مورتیوں کو دیکھتی۔ اجڑے ہوئے پوجا گھر وہیں جاکر مورتی کے آسن پر بیٹھ جاتی۔ سانس روک کر اپنے آپ کو مورتی کی طرح سمجھتی جس کو دیکھنے کا حکم ملا ہے کچھ کہنے کا نہیں۔ بالوں میں پھول سجائے بچے کی جگہ کسی اینٹ پتھر کو گود میں اٹھائے میں ہارتی دیوی بن جاتی۔ رُکما کبھی ہنستے ہنستے دوہری ہو کر مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔

ارے میری میّا۔ گائے تو جانے کہاں گم ہوگئی ہے اور میں بھی پتھر کو پھینک پھانک اُن دیواروں پر سے پھلانگتی ہوئی گلئے کی بچھیا کو پکارنے لگتی۔

گاؤں کی عورتیں میری ماں سے کہتیں۔" اری تیری بیٹیاں کھنڈروں میں گھومتی پھرتی ہیں۔ تجھے ڈر نہیں لگتا جانے کیسی کیسی بُری آتمائیں ان میں پھرتی ہوں گی،،

اور میری ماں ہنس کر کہتی۔" ہر کسی کو مرنے کے بعد دھرتی میں ملنا ہے۔ شمشان کی راکھ دھول اور ہوائیں تمہیں اور مجھے سب کو ایک ہی راہ سے لے جائیں گی۔ جب یہ گاؤں بستا ہوگا تو کیسی کیسی ستونتیاں کیسی کیسی صورتیں یہاں نہ ہوں گی۔ مورتیوں پر روز پھول چڑھتے ہوں گے تالابوں میں چاندی کے سے جسم والی ناریاں تیرتی ہوں گی۔ مندروں کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر کیسے کیسے لوگ اندر گئے ہوں گے جن کی کوئی نشانی بھی اب باقی نہیں بچی۔ ارے انت تو سب کا ایک سا ہے۔ جو کچھ نصیب میں بدا ہے۔ ہو کر رہتا ہے۔

ساری بُری آتماؤں نے مجھے تاک لیا۔ لوگ سچ ہی تو کہتے تھے۔

راہ کے کنارے گھنے جنگل سے باہر بوڑھے برگدوں کے نیچے سرداروں کے پتھر کے تخت تھے جن پر بیٹھ کر وہ فیصلے کرتے تھے۔ پر کاش کی پوجا کرنے والے وہ لوگ کیا کیا نہ سوچتے ہوں گے اور پھر ہوتے ہوتے پتھر جیت گئے اور ہار آدمی کی ہوئی کہ ہار سدا آدمی کی ہوتی ہے۔

گھنے درختوں اور بیلوں سے پرے ایک تالاب تھا۔ جہاں صدیوں پہلے رانیاں اشنان

کرتی تھیں۔ سنگ مرمر کی پچاس ساٹھ سیڑھیاں اور نیچے پانی بھرا ہو کُنڈ جس میں پانی ابلتا ہوا اور صاف تھا۔ میں اور رکما کسی کو نہ بتاتیں جیسے وہ ہمارا خزانہ ہو۔ کنڈ سے پرے ایک ٹوٹی دیوار کی اوٹ میں ایک کمرہ تھا۔ بڑی سہانی باس اس جگہ سے آتی ہوا نہ بھی چلتی ہوئی تو دوپہروں کے سناٹے میں تیز بُوسی میرے نتھنوں میں گھس آتی۔ ہم دونوں ڈرتے ڈرتے وہاں جاتیں۔ ہمارے دل اچھلتے ہوئے منہ کو آتے ہوئے گلے کے قریب سانس اٹکتی ہوئی اور پھر ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں رکما سے کہتی۔

"دیکھتی ہو میں رانی مینا متی ہوں۔ یہ تالاب یہ سنگار وہار یہ سب کچھ میرے لئے بنا تھا۔ اور رکمنی میری طرف ہنس کر دیکھتی اور کہتی جانتی ہو رانیاں بڑے بڑے محلوں میں اکیلی رہتی ہیں۔ تم نے ماں سے کہانی نہیں سنی کہ راجکمار رانیوں کو بھول جاتے ہیں اور وہ بس پڑی رہتی ہیں۔ وہ کہیں جا نہیں سکتیں۔ کہیں گھوم نہیں سکتیں اور تم تو گائے چراتی ہو تم رانی کیسے ہوئیں۔ میں نہیں مانتی۔ اچھا تم رانی بنو میں تو تمہیں ان لوں گی۔ میں ہار کر رکما سے کہتی۔ رانی بننے کا یہ کھیل مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

رانیاں نہا کر سنگار کرتی ہوں گی رکمؔا۔

"ہاں یہ دیکھتی نہیں ہو کتنی اونچی دیواریں ہیں یہ وہ جگہ ہے جہاں رانیاں اور کُنڈ اور سنگار وہار ہے۔ یہ جھروکے ہیں،، رکما ٹوٹی دیوار میں کہیں نہ کہیں انگلی لگا کر کہتی۔

آج سوچتی ہوں سچ مچ وہ جھروکوں کے نشان ہوں گے جن میں بیٹھ کر رانیاں باہر جھانکتی ہوں گی اور پھر سہمے سہمے آگے پیچھے دیکھتی ڈرتے ڈرتے قدم دھرتی دالانوں میں سے گزرتی دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنی یادوں اور سپنوں کو آنکھوں میں چھپائے اوندھی لیٹ کر سوچتی ہوں گی کہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے جہاں کسی بھٹکتی آتما کو کبھی شانتی ملتی ہے۔ جہاں کنڈوں کے ٹھنڈے پانی میں نرملتا ہے، جہاں بن میں منوہر مرلی بجتی ہے اور گوپیاں اس تان کو سن کر بھاگی آتی ہیں۔

میں ہاری او گر دھاری

اور پھر اس خزانے کے ساتھ ساتھ وہ سارا کچھ مجھ سے چھن گیا۔ رکمنا جس کو رانی بننے سے چڑ تھی قید ہونے سے چڑ تھی، مجھ سے بچھڑ گئی اور میں نند لال کے ساتھ اس پرائے دیس میں لوائی گئی۔

مورتیوں کے ساتھ کھیلنے سے جو پاپ ہوتا ہے، اس کا پرائشچت آج تک نہ ہو سکا۔ دھان اور دھنگا ہوا۔ اور جانے کسی جادو کے زور سے ہاٹ بازار سُونا ہو گیا۔ جب پانی اترا ہے تو لوگوں نے پھر ٹھکانے بنانے کی بجائے شہروں کی طرف آنا شروع کر دیا۔ گاؤں میں کوئی شے نہ تھی۔ بھائیں بھائیں کرتے راستوں پر بھوکے لوگوں کے مرے ہوئے بچوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور مینا متی کی طرف جانے والی راہ پر کچھ نہ تھا۔ کئی دنوں سے میں نے کچھ نہ کھایا تھا اور ماں کی اندر کو دھنستی آنکھوں میں ایک سوچ تھی۔ بابا اور وہ ہولے ہولے جانے کیا صلاحیں کر رہے تھے۔

ہمارے پڑوسی اپنی لڑکیاں بیچ رہے تھے۔

میرے بابا نے بھی اپنے پڑوسیوں کی نقل کی۔ میری مانگ میں جس کا سیندور تھا میرا ناطہ جس سے بندھنے والا تھا وہ تو کئی دن ہوئے مر چکا تھا اور ماں نے میری مانگ کو دھو کر مجھے بہت سے پھول پہنائے۔ میرے بالوں کو کانپتے ہاتھوں سے سنوارا اور پھر کہنے لگی۔

"پدمنی میرا اس بات پر پکا وشواس ہے کہ جو کچھ بھگوان نے تمہیں دیا ہے جو تم سے ہو رہا ہے جو ہو گا وہ سب پہلے سے لکھا جا چکا ہے اس میں سے نہ تم کچھ مٹا سکو گی اور نہ میں۔ تم نے سدا رانی بننا چاہا تھا ایسے ہی سپنے دیکھے تھے۔ بھگوان تمہیں شاید بنا دیں۔ جیون کا کوئی ٹھکانہ نہیں جانے آدمی آدمی سے کب بچھڑ جائے اور پھر بیٹی کو تو یوں بھی پرائے دیس جانا ہوتا ہے۔ یوں جانوروں کی طرح بھوکے مرنے سے تو اچھا ہے

کہ تم لوگ ایسی جگہ جاؤ جہاں تم کو پیٹ بھرنے کو روٹی تو ملے۔ ہمارا کیا ہے ہمیں تو تم سے بچھڑنا ہی تھا،،

اس وقت پھولوں کے گہنوں سے لدی خالی پیٹ سے ماں کے سامنے بیٹھی روٹی کی بات سن کر میں خوش ہو گئی۔ میں نے ملنے بچھڑنے کی ساری باتیں سنی ان سنی کر دیں، اور زور سے ماں کے ساتھ لگ گئی۔ میں نے رکما کی طرف دیکھا جو اسی طرح پھولوں سے لدی تھی پر جیسے رانی بننے کا ذرا خیال بھی نہیں تھا۔ ناچنے والی سولہ سترہ برس کی شوخ لڑکی تھی اس کی نتھ کے موتی پاؤں کی تھاپ کے ساتھ جگ جگ کرتے تھے۔ اندھیارا کھل کر پورے مندر میں پھیل گیا تھا بانسری پر مست کرنے والی دُھن چھڑی ہوئی تھی سازندوں کے من جیسے راگ کی لے اور گھنگروؤں کی جھنکار میں گھلتے چلے گئے کنچنی کی مدھر مسکان سب کے دل گرماتی تھی۔ وہ ہاتھوں کی لزت اور سر کے اشاروں سے جادو جگاتی گئی۔ بھگوان کا بھجن سننے والوں کے سر ہل رہے تھے۔ میں اور نند لال ٹھاکر سادھ بیلا آئے تھے اور پوجا کرنے والوں کی بھیڑ میں گم تھے۔ میرے ساتھ ٹھاکر کے بیٹے تھے اور باندیوں کی بیٹی تھی جانے کتنے زمانوں کے بعد میں نے قدم باہر نکالا تھا۔ لوگ بھگتی رس سے متوالے بھگوان کا نام جپتے مندر میں آ رہے تھے۔ بچوں کو درشن کراتے اور مورتی کے سامنے ناچنے والی کے قدم قدم پر اپنی جان لٹا رہے تھے۔ اندر سانسوں کی گھٹن تھی، اور سمت ٹھنڈ ہونے پر بھی جی گھبرا رہا تھا۔ میرا دل ان ہاتھوں کی ست کو مانو جانتا ہو۔ مجھے رکمنی یاد آ رہی تھی۔ لوگ ہولے ہولے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ناچنے والی کون ہے کہاں سے آئی ہے سوالوں کے جواب کوئی نہیں دیتا تھا ٹھاکر بچوں کے ساتھ باہر جانا چاہتا تھا پر میں ایک کونے میں جمی بیٹھی تھی اور پھر بھیڑ میں سے نکلنے کا راستہ بھی کہاں تھا۔

نند لال پر نئی عورت کے دیکھنے سے وہی حالت ہوتی تھی جیسے روشنی کو دیکھ کر

پننگے کی، مجھے معلوم تھا وہ بہت بے چین ہو رہا تھا اور باہر جا کر ادھر ادھر سے پتہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی جو دیوی کے سامنے ناچ رہی تھی کون تھی؟

مجھے اور رکمنی دونوں کو پھولوں سے سنوار کر جب ماں نے نصیب کے لکھے کے ساتھ جدا کر دیا تو ہم ریل پر سوار ہو کر ڈھیروں مٹھائیوں کے ساتھ ایک ایسے پرائے کے ساتھ جو نہ ہمارے گاؤں کا تھا اور نہ ہمارا ناطے دار مینامتی کے دیس سے یہاں لائی گئیں۔ رکما چھوٹی تھی رونے لگی اور ماں کے لئے اداس ہو جاتی پر میں جس نے سدا رانی بننے کے سپنے دیکھے تھے سانس روک کر چپ رہتی، مجھے ماں کے کہے پر پورا وشواس تھا جو میرے نصیب میں بدا تھا وہی مجھے ملنے والا تھا۔ ماں نے کبھی جھوٹ بات مجھ سے نہیں کہی تھی۔

میں رکمنی کا سر تھپکتی اور اسے وہ ساری باتیں سنانے کی کوشش کرتی مگر وہ سدا کی چڑ یا ہنس کر کہتی "پدمنی جانے تم میرا اور اپنا کیا کرو گی۔ ارے ہم بک گئی ہیں، ماں کو میں نے آپ ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہاس آدمی سے جسے ہم لوگ چاچا کہتی ہیں، پیسے لے رہی تھی جس دن اس نے ہمیں پھول پہنائے تھے کیا اس نے نہیں کہا تھا کہ تم یہاں بھوکوں مرنے سے تو اچھا ہے کہ کہیں ایسی جگہ چلی جاؤ جہاں تمہیں روٹی ملے"۔

تم جھوٹ کہتی ہو ماں کو یونہی دوش دیتی ہو، ماں نے کوئی ہمیں بیچا ہے؟ جب دھان سستا ہو جائے گا اور بابا گاؤں میں گھر بنا لیں گے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔

نہیں پدمنی اب کبھی ہم ماں کو نہیں دیکھ سکیں گی، کبھی ہم اور تم اس دیس کی باس بھی سونگھ نہیں سکیں گے، وہ کنڈ اور وہ سنگار ڈہار، وہ سب چیزیں وہیں رہ گئیں، مینامتی کے بدھ بھگوان کی مورتیاں، دیوی ہارتی اور نیچکا دیوتا تالاب اور درختوں سے بھرے راستے۔

پھر چاچا مجھے مٹھا کر کے پاس لے آئے، ذرا سی اگنی جو ہون کنڈ میں نہیں خالی دھرتی پر تھی میرے بیاہ کے بندھن پر مہر لگانے کے لئے کافی تھی اور یوں پدمنی جو

گھر سے پھولوں کے سنگھار میں ڈوبی نکلی تھی۔ سونے میں پیلی ہوگئی، گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نند ٹھاکر پیا بن کر ملے، سر کو پلو سے ڈھانپے تان پورے کے تاروں پر انگلیاں چلاتی آنکھیں بند کئے بیٹھی ناچنے والی اب بھجن گا رہی ہے اور لوگ دم سادھے سن رہے ہیں اور میرے سامنے رکھا ہے، سینے میں دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا ہے۔

ٹھاکر نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا اور کہا "چلو اب چلتے ہیں۔ بھیڑ میں سے آخر راستہ بنانا ہی پڑے گا، پھر شام گہری ہو جائے گی تو کھلی ناؤ میں بچوں کو ٹھنڈ لگے گی"

میں دیوانوں کی طرح اسے دیکھ رہی ہوں مجھے اس کی بات سنائی تو دی ہے پر مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں۔ ٹھاکر پھر بھیڑ میں غائب ہو گیا، شاید اُسے گانے والی کی ٹولی کے اٹھنے پر مورتی کے پچھلے دروازے سے باہر جانے کی خبر ہو گئی تھی۔

مندر کی روشنیاں مدھم ہو گئیں، ساز بجانے والوں اور بھجن گاتے والوں نے تھک کر اپنی آوازیں نیچی کر لیں۔

سندرتا بھگوان کی لیلا ہے، نرت بھی اس کی لیلا ہے۔

اور اپنے آسن پر بیٹھی مورتی کے ہونٹ مانو کچھ کہنا چاہتے ہیں، پر مورتی کو سب کچھ دیکھنے کا حکم ہے، کچھ کہنے کا نہیں۔

جب میں لڑکوں کے ساتھ باہر نکلی تو سورج دریا کے پانی میں ڈوب رہا تھا۔ لال پانی میں دھارے کے ساتھ کشتیاں گھاٹ سے کنارے کی طرف جا رہی تھیں اور ٹھاکر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

پھر گھاٹ کے پاس ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر میں نے اپنی سوچ کے ڈانڈے اپنے دیس سے ملائے۔ رکمنی کو کہاں کہاں ڈھونڈوں، کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک سی ہوں۔ میں اور وہ بہت پہلے بچھڑ گئے تھے، وہ چاچا جو ٹھاکر کے پاس مجھے لائے تھے، انہی سے پوچھوں؟ آج سے پہلے مجھے کیوں یہ بات نہیں سوجھی؟

ٹھاکر ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آئے تو میں نے کہا۔

"کبھی چاچا تمہارے پاس نہیں آئے؟"

"کون چاچا؟" اس نے ناؤ والے کو پکارنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے بہت کم یوں تیزی سے بات کرتے دیکھا تھا سدا سے اس کے اور میرے درمیان رکھ رکھاؤ کی ایک اوٹ سی ہو گئی تھی۔ وہ لوگوں سے تیز آواز میں بات کرتا ہو تا تب بھی مجھ سے بہت دھیرج اور سہج سے بولتا اس کا اور میرا آمنا سامنا ہی کونسا زیادہ ہوتا تھا، اونچی دیواروں سے گھری گڑھی میں میں باندیوں کی پلٹن کے ساتھ رہتی تھی اور وہ باہر اپنی دنیا میں مگن تھا۔

پھر آپ ہی آپ سمجھ کر جب ہم سب ناؤ میں بیٹھ چکے تو بولا، تمہیں اتنے سالوں وہ بھولے رہے، آج کیا بات ایسی ہوئی کہ تم نے انہیں یاد کیا؟"

"یونہی بس یاد آ گئے"، میں نے بہت دھیرے سے کہا۔

ٹھاکر نے شام کے تھمتے شور اور لہروں کے اوپر سے آتی نیلی دھندلی ہوا میں سے کنارے کی طرف جھانکتے ہوئے کہا، وہ تو میرے پاس اس دن کے بعد سے کبھی نہیں آئے۔

مگر مجھے معلوم تھا وہ جھوٹ کہہ رہا ہے، اسے سدا سے معلوم رہا ہے کہ وہ کہاں تھے۔ اسے یہ بھی پتہ ہوگا کہ رکمنی کہاں ہے۔ مگر جب وہ ایک بار کسی شے سے انکار کر دے، پھر وہ کبھی نہیں مانتا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس سے آگے کچھ پوچھنا بیکار ہوگا مجھے اپنے طور پر کھوج لگانا ہوگی۔ میں نے اپنے جی میں ٹھاکر کے لئے بہت نفرت محسوس کی۔ بہت دنوں بعد میں نے اپنے آپ کو قیدی محسوس کیا، ایسا قیدی جس کو پنجرے سے نکلنے کی اجازت نہ ہو۔ مجھے ماں کی سنائی ہوئی وہ ساری کہانیاں یاد آ گئیں جن میں راجکماریاں راجاؤں کے محلوں میں قید ہوتی تھیں، راجہ کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور انہیں دن رات بھگوان

کے چرنوں میں پڑے رہنے کے بنا کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور پھر جب آنکھیں روتے روتے بہہ جاتیں اور بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی ڈیرے ڈال لیتی تو راجہ کو بھی بڑھاپے میں سیر و شکار سے فرصت ملتی اور وہ اس کے پاؤں پہ گر کر معافی مانگ لیتا۔

کہانیوں میں رانیاں بہت دکھی ہوتی تھیں، پر سونے میں پیلی اماں جب ان کے زیوروں کے نام لیتی تو مجھے ہنسی آیا کرتی۔ بھلا ایک لڑکی اتنے بہت سے زیور پہن سکتی ہے؟ بوجھ سے گردن نہ دکھ جاتی ہوگی۔

اور ماں اندھیری کالی راتوں میں چٹائی پر لیٹی ہمارے چاروں طرف رضائی لپیٹتی ہماری ہنسی سے بے پرواہ کہے جاتی۔ ہمارے دیس میں رانیوں کے قصوں میں جو دکھ ہے وہی شاید راگوں اور گیتوں، بولوں اور لے میں ہے۔ راتوں کو مانجھی ناؤ کھیتے دریا کے دھارے کے ساتھ بہتے جو گیت سنتے ہیں اندھیرے پانیوں پر سنگیتوں کو محسوس کرتے، بے نام دیوتاؤں کے سامنے جھکتے وہ جیسے دکھ سے تھکے پر صبر کر کے آگے ہی آگے بڑھتے ہیں اس کو کون سمجھ سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے مینامتی کے کھنڈروں میں گھومتے ہوئے میں نے جنگل کے کنارے کنارے ایک تان سنی تھی۔ بول نہ تب میری سمجھ میں آئے تھے اور نہ اب، پر اس لے میں کچھ تھا کہ جیسے آکاش اور دھرتی سارے دم سادھے سن رہے ہوں، بانسری کی وہ دھن پھر ہوا کے ساتھ دور چلی جاتی۔ اگر رکمنی میرے ساتھ ہوتی اور میں چپ ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ دھرے وہ راگ سننے کی کوشش کرتی تو وہ میرا ہاتھ جھٹک دیتی اور کہتی "پدمنی یہ تمہیں کبھی کبھار کیا ہو جاتا ہے؟" میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتی تو وہ اور بھی چیخ کر کہتی۔

"تم تو پاگل ہوتی جا رہی ہو پدما۔ کیا سنتی ہو مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا"، پھر ہوا کے رخ بھاگتی ہوئی وہ کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ جاتی۔ وہ ٹیلے مینامتی رانی کے محل کے ہوں گے یا کسی بھکشو کی کوٹھری کے جس میں بیٹھ کر رانی نے اپنے پریم

کے نام پر بہت کچھ سوچا ہوگا اور بھکشو نے جیون اور بھگوان اور مورتیوں اور پرم آتما کے لئے سمادھی لگائی ہوگی۔

بیتا سمے ایک گھڑی کیوں لگتا ہے؟

طاق میں چاندی کا دیولا مدھم مدھم جل رہا ہے۔ بھگوان یہ سہاگ جو میں نے اپنا سارا کچھ تج کر پایا ہے، اس کو تو سدا بنائے رکھنا۔ یہ سہاگ، مجھے ہنسی آتی ہے اور میری اس ہنسی میں اپنے گھنگروؤں کی جھنکار ملاتی چاندنی کے ساتھ پرانے باغوں پر سے ہوتی ہوا بھی اندر آگئی ہے۔ چاند اب اتنا نیچا ہوگیا ہے کہ برگد کے تنے میں گم ہوتا لگتا ہے۔ ممولے کی چہکو چہکو دن کے آنے کا پتہ دیتی ہے۔ یہ باغ جس میں میں جھانک رہی ہوں اس کے سارے ڈال اور پات اب جاگیں گے، گھٹاؤں کو ساتھ لے جانے والی آندھی تھم گئی ہے اور اب سویرے کے ملائم دھیرج سے چلنے والے جھونکے میرے سفید بالوں کو یوں چھو رہے ہیں جیسے کسی ان جانے ان دیکھے پریتم نے اپنا ہاتھ ان پر پھیرا ہو۔

ان جانا پریتم جس کے پریم کا سہاگ یہ دیا ہے۔

وہ پریتم جس کو میں نے ایک بار جھانکا تھا ایسے ہی جیسے چاروں طرف چھائے اندھیکار کی چادر ہٹا کر کوئی چہرہ ایک پل کو نظر آئے

وہ ایک پل بھی کہاں تھا۔

سمے کو کون ناپ سکتا ہے۔ سمے کا نہ کوئی انت ہے اور نہ کوئی ناپ، سمے جو ہے بھی اور نہیں بھی، آج سر پر پھیلے آکاش سے پوچھتی ہوں کہ میں نے اس ایک جنم میں تمہارے نیچے رہتے رہتے کتنی برساتیں گزاری ہیں، اور تم نے میری جھولی میں کیا ڈالا ہے؟ سبھی کے ساتھ تو ایک جیسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ کھڑکی میں کھڑی میں یونہی سوال کرتی رہوں گی۔ پتھر کے دیوتاؤ، مورتیو، آدمی کتنا بے بس ہے کتنا چھوٹا۔ ہر شے اسے شکست

دیتی ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر گزر نے والی ہوا بھی اسے دھوکہ دیتی ہے اور پھر بھی یہ کیسا دھوکہ ہے کہ آدمی ان ساری چیزوں کے لئے سمے گنواتا ہے، روتا ہے، بلکتا ہے اور اندھیکار کی نیکیتو کچھ تو جواب دو۔ میں اکیلی عورت ہوں جس نے مینامتی کے کھنڈروں میں مورتی کے آسن پر بیٹھے آنکھیں بند کر کے ایک سپنا دیکھا تھا۔ میرے اس سپنے کے ٹکڑے ہو کر میری راہوں میں بکھر گئے۔ اس چھوٹے سے ناریل کے جھنڈوں سے گھرے اور تالابوں سے بھرے گاؤں سے لے کر گڑھی کی اونچی دیواروں تک سپنے کی ان ٹوٹی کڑیاں پھیلی ہیں۔ باغوں سے گھرے اور کوئلوں کی کوک سے بھرے اس گھر میں میرا سارا جیون بیت گیا۔ میں یوں کھڑی رہی جیسے ایک ایک کو میرے سپنے کا سچ میرے سامنے آنے والا ہے اور جیون بیت گیا۔ سمے نے نہیں سپنے بنانے والے نے مجھے ہار دی ہے۔

تم جو بھگوان ہو، اپنے آپ کو بھگوان کہتے ہو یہ ہار تم نے مجھے دی ہے۔

میری جھولی خالی ہے،

میرا دل خالی ہے۔

اور طاق میں جلتا یہ دیا ہے جس کو میں اپنا دل بہلانے کے لئے سارے لوگوں سے چوری جلاتی رہی ہوں۔ اور اب جب انت اتنا قریب ہے میں جانتی ہوں سارا جیون ایک بیکار کی ہار میں ایک خالی سپنے کو دیکھنے میں چلا گیا ہے۔ سمے، او سمے۔

جب نند لال کے ساتھ میں نے اگنی کے گرد پھیرے کئے تو مجھے لگتا تھا یہ بھی کھیل ہے چاچا نے مجھے کہا تھا، "پدمنی تم آنکھیں بند رکھو، چپ رہو، بس اب کچھ دیر میں تم رانی بننے والی ہو۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور من ہی من رکمنی پر ہنستی رہی۔ بھلا رانی بننے میں کوئی دکھ ہوتا ہے، جب میری آنکھیں کھلی ہیں تو گڑھی کی اونچی دیواریں تھیں اور باندیوں کی پلٹنیں تھیں، باغوں سے گھرا ہوا یہ اونچا اور بڑا گھر تھا اور نند لال جو دور سے دیکھنے پر پایا

کے سمان اونچا تھا، جب رات بھیگ جاتی تو باندیاں مجھے سنگار کرواتیں، پھولوں کے گہنوں اور اچھے اچھے کپڑوں سے مجھے چھپا دیتیں، کمرے میں بڑی بھینی باس کے تیل کا دیا جلا جاتیں، اور مجھے چھوڑ دیتیں، پھر ٹھاکر آتا، جیسے ماں کی کہانیوں میں دیو آتا تھا اپنی کانی آنکھ کو چھپائے اپنے بالوں اور اوپر کو چڑھی ہوئی مونچھوں کے ساتھ وہ مجھے اتنا عجیب لگتا. پھر پھولوں کے گہنوں اور کپڑوں اور سنگار کو بکھیر کر سو جاتا اور رانی اندھیری کوٹھڑی میں قید ہو جاتی، جہاں اس بڑی مسہری کے کونے پر سانپ کے ڈسے کا زہر انگ انگ میں رچائے اور جی میں دکھن لئے ساری رات آنکھ میں پڑے کنکر کی طرح نکالے نہ نکلتی. ویران دن ہوے ہوے گزرتے گئے سنسان راتیں بیتتی رہیں۔

کبھی اندھیرے کے پار سے اس کی آواز آتی تمہارے انگ انگ میں تمہارے دیس کی باس ہے تمہارے بال کتنے لمبے اور کالے ہیں، پدمنی میں تم سے پریم کرتا ہوں ۔

اور مجھے اپنے قریب سانپ کی پھنکار سنائی دیتی جو کہتا ہو" پدمنی میرا زہر تمہارے انگ انگ میں رس بن کر رہے گا، ایسا رس جس سے پیڑ سوکھ جائے گا۔

اور ان پھولوں کے گہنوں سے بھری راتوں اور سوگندھ کا انت یہ ہوا میں ایسا پیڑ ہوں جس پر کبھی ایک کونپل بھی نہ پھوٹی ۔

ٹھاکر کہتا" پدمنی میں نے تمہیں اتنے بڑے گھر کی رانی بنایا ہے تمہیں دنیا کے سارے عیش ملتے ہیں، باندیوں کی قطاریں ہیں، ریشمی کپڑوں کے ڈھیر ہیں، تم کتنی بھاگوان ہو اور پھر بھی تم اداس رہتی ہو میری بات کا جواب ہوں ہاں سے دیتی ہو. مجھ سے ذرا پریم نہیں کرتی میں تمہارا پتی ہوں ۔

اور میں دھیرے سے کہتی میں پتی ورتا استری ہوں، تم میرے لئے دیوتا کے سمان ہو، تم میرے بھگوان ہو جب میں پرانی ہوگئی اور میرے بھگوان کو میرے ٹھنڈے ہوتے جسم میں وہ چنگاری نہ مل سکی جس کو وہ اپنے طور پر پریم کہتا ہے تو اس نے گڑھی کے اندر آنا

کم کر دیا۔ اب باندیاں رات کو طرح طرح کی خوشبوئیں مل کر مجھے نہ نہلاتیں، میرا سنگار نہ کرتیں۔

بوڑھی ریکھا کو مرے بھی کتنے سال بیت گئے ہیں۔

ریکھا نے ایک دن آن کر مجھ سے کہا تھا۔ بیٹی میں تم سے ایک بات کہوں۔

میں نے کہا کیوں نہیں، تم کو اس گھر میں رہتے کتنا سمے ہو گیا ہے۔ تمہارا حق ہے" بیٹی تم کو اب اس گھر سے کہیں جانا نہیں۔ تم جوان ہو میں تو کہتی ہوں ابھی وہ جوانی جس میں لڑکیوں کا اپنا آپ سنبھالے نہیں سنبھلتا، نہیں آئی تم تو کچی کونپل کی طرح ہو۔ سورگ کی اپسرا کی طرح سندر ہو پھر کیا بات ہے کہ تم ٹھاکر کو بہلا نہیں سکیں۔ وہ اب کبھی کبھار ہی گڑھی میں آتا ہے کیا تم نے اس سے جھگڑا کیا ہے؟

میں سنگار کے پٹارے میں سے آنکھوں میں لگانے کا کاجل ڈھونڈتے ڈھونڈتے رک گئی اور ریکھا کی طرف دیکھنے لگی۔ میں اسے کیا جواب دیتی۔

"ہاں بولو"، ریکھا نے اپنا جھریاں پڑا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پہ رکھ دیا جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر میں اس کے کندھے سے لگی رونے لگی۔ میری سسکیاں ہچکیوں میں اور ہچکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ مجھے ماں یاد آ رہی تھی، مجھے بابا یاد آ رہے تھے، میں اتنے بہت دنوں سے اکیلی تھی۔ میں رکمنی سے گلے ملنا چاہتی تھی اتنی اپنائیت سے بہت سالوں کے بعد کسی کے مجھے اپنے گلے سے لگایا تھا۔ میری آتما ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میری آنکھوں کے راستے باہر نکل رہی تھی۔

ریکھا کہہ رہی تھی "بیٹی، بیٹی"، وہ آپ بھی رو رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا میں ایک پرندے کی طرح اتنے سالوں سے اس پنجرے میں قید ہوں اور چاہتی ہوں کہ یہاں سے نکل بھاگوں میرا جی چاہتا تھا کہ میرے پاؤں میں پر لگ جائیں اور میں اڑ کر تاڑی کی بو پہ مدہوش جھومتی مکھیوں اور اونچے پوربی ہوا کے ساتھ سرسراتے پیڑوں کے ٹھنڈے جھنڈوں میں چھپے

گاؤں کے تالابوں میں جل پری کی طرح ڈبکی لگاؤں اور پھر ابھروں تو یہ دکھن یہ جلن یہ دوری یہ سب کچھ ایک برے سپنے کی طرح مجھ سے پرے ہو چکا ہو۔

پر اُسی سمے سیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی چاپ سن کر میں ریکھا سے الگ ہو گئی۔

دروازے میں کھڑی رادھا نے وہیں سے کہہ دیا۔

"ٹھاکر تھوڑی دیر میں اندر آئیں گے۔"

اس دن میں نے ہونٹوں کو لالی سے نہیں رنگا، آنکھوں میں کاجل نہیں لگایا جُوڑے میں پھول نہیں سجائے تھے، اور جب ٹھاکر نے اس اونچے تخت پر میرے قریب بیٹھ کر کہا "میں تمہارے لئے ایک داسی لایا ہوں پدم رانی۔"

میں نے نگاہ اوپر اٹھا کر نندا کی طرف دیکھا وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

وہ عام داسیوں کی طرح آنکھیں جھکائے ہوئے نہیں تھی اس کے ہونٹ بہت سرخ تھے پر اُن پر مانگے کی لالی نہ تھی اس کے سارے چہرے پر یہ ہونٹ بس الگ جان پڑتے تھے جیسے بھُولے سے یہاں لگا دیئے گئے ہوں، سیاہ چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھیں بڑی تیز تھیں اور وہ نگاہیں چبھ رہی تھیں، وہ بہت معمولی کپڑے پہنے تھی جو تقریباً پھٹے ہوئے تھے اور گھنگریالے بالوں کا ایک جنگل سا اس کے چھوٹے سے سر کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ہاتھ بہت چھوٹے تھے اور ایک ہاتھ سے دوسرے کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ جیسے سخت تکلیف میں ہو۔

اپنے تخت پر قریب بیٹھا ٹھاکر مجھے بڑا ہی بیگانہ لگا۔ جیسے اسے یہاں بیٹھنے کا حق نہ ہو جانے وہ اس داسی کو میرے پاس کیوں لایا تھا۔

باہر روز نئی داسیاں آتی تھیں۔ نئی گانے والیاں، جادو جگاتی ہوئی کنچنیاں، اس کے گاؤں سے بھاگی ہوئی بھولی بھالی لڑکیاں۔ بڑے ٹھسے کی ادھیڑ عمر کی عورتیں، یہ الگ سی دنیا جس میں ٹھاکر زندہ تھا، اس کے بیٹے زندہ تھے اس کے پُرکھ زندہ تھے۔ میری

اس دنیا سے بہت دور تھی۔ پر آج کیا بات تھی کہ وہ نندا کو گھر لایا تھا اور مجھے سونپ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے،" میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے رومال پر رنگین دھاگے سے پھول بناتے ہوئے کہا کہنے کو اور کوئی بات نہ تھی اور ہم تینوں وہاں تھے۔ جیسے پار اترنے والی ناؤ میں دو گھڑی کو بیگانے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ مٹھا کر اپنی ایک آنکھ کو آدھا کھولے نندا کو دیکھ رہا تھا۔

"نندا کو رہنے کے لئے وہ سرے والی کوٹھری دے دینا پدم رانی" اس نے ٹھیک اپنا مطلب بتاتے ہوئے کہا۔

"اچھا،" میں نے سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے جواب دیا۔

اور وہ پھر بھی وہاں بیٹھا رہا جانے ابھی نندا کے لئے اسے اور کیا کچھ چاہیئے تھا آپ ہی آپ وہاں بیٹھا وہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس کے انتر میں روشنی ہو رہی ہو اور خوشی کی بے چینی اس کے اندر کھول رہی ہو۔

"تم جاؤ،" اس نے نندا سے کہا" اور اپنے لئے سرے والی کوٹھری ٹھیک کر لو،" میں نے کہاری کو بلا کر اس کے ساتھ کر دیا اور سوچا اب ٹھاکر اٹھ کر باہر چلا جائے گا مگر وہ اسی طرح تخت کے ایک کونے پر بیٹھا رہا۔ جیسے سونچ رہا ہو کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

اور جب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ پدم رانی تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا تو مجھے لگا کسی پرائے مرد نے مجھے چھو لیا ہو اور مجھے بھرشٹ کر دیا ہو۔ مگر میں نے اسی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا" پدم میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں تم گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو اگر تمہیں کوئی انکار نہ ہو تو نندا میری خدمت کیا کرے گی۔

میں من ہی من میں ہنس دی۔ بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے میرے دل کے سارے دوار بند ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی جلن کسی تکلیف کسی دکھن کے گزرنے کا راستہ کہاں تھا۔

میں اپنی انگلیوں پر ٹھاکر کے ہاتھ کی نمی محسوس کر رہی تھی۔ وہ جانے کیوں نندا کے معاملے میں مجھ سے جھینپ رہا تھا۔ اور پھر میں تو ان سب باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اپنی پوتر تا، اپنا اکیلا پن، اتنے بڑے گھر کے کام، اور باہر ٹھاکر کا آسرا اس کی دولت کا غرور، میلوں تک پھیلی ٹھاکر اور اس کے بیٹوں کی زمینیں، اور جینے کے لئے سو طرح کے گھمنڈ۔

پہلے پہل ٹھاکر آنگن میں سے گزرتا تو میرے کمرے کی طرف دیکھتا، تیزی سے چل کر میری نگاہوں سے چھپنے کی کوشش کرتا۔ نندا کی کوٹھری میں سے دبی دبی ہنسی کی آوازیں آتیں۔ جیسے وہ دم سادھے بیٹھے ہوں۔ اور میرے ادھر ادھر جانے کا انتظار کر رہے ہوں پھر میں نے چھت پر بنے کمرے کی کھڑکیوں میں دھوپ سے بچنے کے لئے بھاری پردے لگوا لئے اور پچھلے آنگن میں کھلنے والا سالوں سے بند کواڑ کھلوا کر چابی نندا کو دے دی۔

نندا کی جھلک کبھی دکھائی دے جاتی، اس کی رنگین ساڑھیوں کے پلو آنگن میں لہراتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے گلاب مہکے ہوئے، اس کے سیاہ چہرے پر کی نئی بہار کا قصہ کئی بار مجھے داسیوں نے سنانا چاہا مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی

ٹھاکر کو اس کے بعد میں نے مہینوں نہیں دیکھا۔

پھر نندا بھی پرانی ہوتی گئی، پچھلے آنگن کا کواڑ رات رات بھر ٹھاکر کے انتظار میں کھلا رہتا پھول مرجھا جاتے، سنگار باسی ہو جاتا۔ آنکھیں تھک جاتیں، جسم چور چور ہو جاتا اور سونی سیج پر دلہن کی طرح سجی سجائی نندا آخری رات میں اکیلی لڑھک جاتی۔

میں نے ٹھاکر کو پیغام بھیجا

نندا میری داسی ہے تب ہی اسے بھلا بیٹھے ہو۔

اور ٹھاکر نے جواب میں کہلوایا، "تمہاری ساری چیزیں مجھے بہت اپنی لگتی ہیں کہ

میں انہیں بالکل نہیں توڑنا چاہتا۔

نندا نے پچھلے کواڑ میں تالا لگا کر چابی مجھے لوٹا دی، پھولوں والی کے سارے پھول آنگن میں بکھیر دیئے اور پھر یوں ہنسی مانو پاگل ہو گئی ہو۔ اپنی کوٹھری کو اتنا دھویا کہ اس میں میل نہ رہی۔ پھر جانے کیا کچھ جلا کر اسے پوتر کیا۔ اور جب اس کے اپنے اشنان کرنے کی باری آئی تو وہ ریکھا کے قریب زمین پر بیٹھی کہہ رہی تھی "کیا کوئی ایسا اشلوک نہیں دداجس کے پڑھنے سے من کا میل دُور ہو سکے" دونوں وہ دیوانوں کی طرح بال بکھرائے پڑی رہی۔

پوترتا کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کی سوچ اُس پوترتا کو مان لے۔

وہ اس چھوٹی سی عمر میں دیس دیس گھوم لی تھی۔ اس کی باتوں میں بڑا رس تھا۔ اس کی آنکھیں بولنے لگتیں اور پھر اس کے اور میرے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ ہو گیا۔

وہ گھر میں چلتے پھرتے یونہی گنگناتی رہتی۔ اس کی آواز میں ایسا درد تھا جیسے کوئل کی کوک میں۔ کبھی کبھی میرے پاس آن بیٹھتی اور کہتی۔

" پدم رانی ہمارے ایک گرو ہیں اگر وہ مل جائیں تو میں ان سے ہردے کی اس آگ کے بجھانے کا پوچھ لوں۔ اور وہ اپنے ان مہاراج کا ذکر کرنے لگی جن کی اشیرباد سے بگڑے کام سنور سکتے ہیں۔

ہولے ہولے مجھے گرو مہاراج اور ان کے ذکر میں دلچسپی ہو گئی۔

کہاں براجتے ہیں وہ؟

میں یونہی پوچھ لیتی۔

" ہمارے گرو مہاراج تو ایک نظر سے نصیب بدل دیتے ہیں۔ پر میں ان کی طرف دیکھنے کی، ان کے سامنے جانے کی ہمت کس طرح کر سکتی ہوں، وہ تو دیوتا کے سمان اونچے ہیں ان کے درشن کرنے سے سورگ مل جاتی ہے سارے کشٹ دور ہو جاتے ہیں۔

اور گرہی کے اس قید خانے میں جہاں پاپ کرنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ پُن کرنے کا

کوئی طریقہ نہ تھا۔ جہاں زندگی کی بس، لگن صرف ٹھاکر کے سامنے ناچنے والی عورتوں کے پاؤں کی جھنکار تھی، یہ بول مجھے بہت اچھے لگتے۔ مجھے لگنے لگا جیسے میں آپ گرو مہاراج کی داسی ہوں، باس کی طرح زہر بھی ہولے ہولے رگوں میں اتر کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آتما تک میں زہر مل جاتا ہے۔

رات کالی تھی اور ان جانی آوازوں سے بھری تھی، رہ رہ کر اندھیارے میں کوئی شے یوں لوٹتی پلٹتی اور کروٹیں لیتی تھی جیسے ماں کے گربھ میں بالک۔ جب ہوا آموں کے بور کی باس سے لدی اندر آتی تو بوجھ سے ہاری ہوئی سی دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹ پر ہی سے لوٹ جانا چاہتی تھی۔ لیمپ پر چینی کا شیڈ روشنی کی وجہ سے گہرا نیلا لگ رہا تھا جیسے سمندر کا رنگ ہو جیسے آکاش سیاہ بادلوں والے دن کسی ٹکڑے میں سے دکھائی دیتا ہو۔ ایسی نیلاہٹ جیسے میرے سامنے لگی تصویر میں بھگوان کرشن کے رنگ میں تھی۔ جب وہ ناگ کے پھن پر بیٹھ کر پاتال سے آئے تھے۔

ٹھاکر نے کہا تھا اگر تم گرو مہاراج کی اشیرباد لینا ہی چاہتی ہو تو میں تمہارے لیے پدم رانی یہ رواج بھی توڑتا ہوں۔ آج تک ہمارے مندر میں اپنے پجاریوں اور پرکھوں کے وقت سے آنے والے مہنتوں کے خاندان کے علاوہ کسی نے اندر گرھی میں قدم نہیں دھرا۔ تم لوگ رات کے وقت سب یوں ملو کہ پتہ نہ چلے باندی کون ہے اور رانی کون"

اور اسی لئے ہم سب اس ایک کمرے میں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ نندا روز کی طرح ہم سب سے الگ کالی چادر لپیٹے چوکھٹ کے باہر بیٹھی تھی۔

چندا گرو مہاراج کو لینے پچھلے آنگن کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔

پھر کئی طرح کی باس سامگری کی خوشبو اور جانے کہاں سے خوشی، پائل کی جھنکار دیوی کی مسکان کی سی روشنی کمرے کے اندر آگئی، میں نئی دلہن کی طرح رہ رہ کر کانپ رہی تھی اور مرنالنی کا ہاتھ پکڑے تھی، وہ کہتی تھی بہو جی آپ نراش کیوں ہوتی ہیں کون جانے مہاراج

کی اشیرواد سے آپ کا کلیان ہو۔"

میں مرنالنی سے کیا کہتی میں نراش کہاں تھی بھلا ایسے میں جب میں اپنی آتما تک کو ایک پھول کی طرح تھامے اس راہ کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر سے چل کر اپنی اشیرباد سے میرا کلیان کرنے والے مہاراج آرہے تھے میں نراش کیوں ہوتی، میرے دل میں پہلی بار آس کی کونپل نے اپنا ذرا سا سر باہر نکالا تھا اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ لہرائی تھی۔

وہ دونوں اندر آئے میں نے گھونگھٹ کی اوٹ سے انہیں دیکھا، اتنی لپٹی لپٹائی چادروں سے منہ چھپائے ہوئے عورتوں کو دیکھ کر وہ گھبرا سے گئے ہوں گے، وہ تو کسی طرح گرو مہاراج نہیں لگ رہے تھے۔

چوکی پر بیٹھ کر اس بے حد سفید اور بھولے بالک کی طرح کے جوان نے کہا۔

"میں اشیرواد دینے نہیں لینے آیا ہوں، مجھے تو دان چاہیئے، میں تو آپ بھکاری..

اور میں نے اسی گھڑی اسے دان میں اپنا آپ دے دیا، بھکشا کے ناتے۔

پھر وہ دونوں ہولے ہولے ہنسنے لگے۔

چندا نے کہا آپ اشیرباد دیں رانی بیمار رہتی ہیں۔ نندا نراش ہے، اس گھر کی بہو کا دل اپنے پتی سے زیادہ پوجا پاٹ میں لگتا ہے اور باندیوں میں سے کسی کو کام کے وقت دورہ پڑ جاتا ہے، کوئی چلنے میں گر جاتی ہے کسی کا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت لیٹی رہے اور سپنے دیکھتی رہے، کوئی سنگار کر کے پہروں اپنے آپ کو دیکھتی ہے سارے کا سارا گھر کسی نہ کسی کارن دکھی ہے آپ اشیرباد دیں کہ ہمارے کشٹ دور ہوں۔

چندا لیمپ کی روشنی میں چوکی کے پاس مہاراج کے چرنوں میں بیٹھی یوں لگ رہی تھی جیسے گھر کے حساب کتاب کی بات کر رہی ہو۔ اپنے چوغے کو سمیٹتے ہوئے جو ہاتھوں سے نیچے لٹک رہا تھا چوکی پر بیٹھے گرو مہاراج کے جوان بالک نے کہا۔

"میں اتنے بہت سے سروں پر ہاتھ نہیں دھر سکتا تم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ سپھل

ہو جائے تمہارے کشٹ دور ہوں بھگوان تمہارا کلیان کریں،،

ریکھا نے آگے آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا " میں تمہیں اشیر واد دیتی ہوں کہ تمہارے دشمن کو کبھی نیچا نہ دکھا سکیں تم کو کبھی کوئی دکھ نہ ہو۔ تم بڑے مہاراج کے سائے تلے رہو،،

اور پھر دوسرے نے آنکھیں اٹھا کر ریکھا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور چوکی کے سرے سے اٹھ کر کہنے لگا۔" ارجن چلو، اب تو تم کو دکشنا بھی مل گئی اور اشیرواد بھی۔

مجھے لگا ایک ناٹک سا کھیلا جا رہا ہے۔

ریکھا نے کہا " بیٹا میں بوڑھی ہوں مرنے کے قریب۔ تم لوگ جوان ہو، میرے لئے پرارتھنا کرو کہ میری موت آسان ہو، یم کے دوت مجھے زیادہ نہ ستائیں مرنا بہت مشکل ہے ایسا ہی مشکل جیسے پریم کرنا،،

ارجن نے چوکی پر سے اٹھتے ہوئے کہا " تم تو ماں کے سمان ہو، تمہاری ابھی اس گھر میں ضرورت ہے۔ تم ناکیوں چاہتی ہو؟"

اور ریکھا نے دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا " مہاراج ابھی تو پرانوں میں سست ہے نہیں ہے یہ جس کا گھر ہے وہ تو اس گھر کی کچھ نہیں رہیں بہتر جن کا گھر ہونا اچھا نہیں تھوڑا چل پھر لیتی ہوں، اور میں اپنے سامنے جو کچھ دیکھتی ہوں، اسے اور زیادہ دیکھنے کی خواہش وہ گھر میں پھیریں۔ اگر اور وقت ہوتا تو میں کچھ کہتی مگر اب ٹھاکر اور اس کے بیٹے میرے بڑھاپے کا لحاظ نہیں کرتے۔ میں کس کے لئے جیوں؟" وہ وہیں بیٹھ گئی اور منہ پر کپڑا ڈھانپ کر زور زور سے بین کرنے لگی۔

چندا نے اپنی ہنسی روکنے کے لئے چادر کا پلو منہ میں ٹھونس لیا، اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ گھبرائے ہوئے سے چوکی کے قریب کھڑے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی تو ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا، باہر اندھیکار اور تاروں کے دل دھڑکتے رہے۔ روشنی اور اندھیرا اکیلے ملتے رہے جیسے دو پریمی چوری چھپے ملتے ہیں۔ مجھے لگا جیسے یہ ملن کی گھڑی ہو خوشی کا بھرپور لمحہ جیسے

دینے والا اور لینے والا دونوں دکشنا اور سویکار کرنے کا مطلب سمجھتے ہوں۔

نندا نے چوکھٹ کے باہر سے جھک کر ان کے پاؤں چھو لئے اور بولی آیئے مہاراج میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

اور ارجن مہاراج نے کہا "رانیوں اور باندیوں سبھوں کی آشائیں پوری ہونگی،، یہ کہہ کر وہ نندا کے آگے اپنے راہ پر چلے گئے۔

اور اس کے بعد آج تک میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

گیتا میں لکھا ہے۔

آدمی کا جینا امرت سمان ہے۔

اور پھر ایک جگہ ایسا ہے۔ جس کا آتما پوتر ہو اس کو پریم اور بھگتی اُپجے ہے۔

جس کو میری پریم اور بھگتی اُپجے اس کے میں بارم بار اور روم روم میں آکر نواس کرتا ہوں اور سُن جس پرکار کوئی میرا سمرن اور بھجن کرتا ہے۔

میں اسی پرکار اس کا سمرن اور بھجن کرتا ہوں،،

مرنالنی پاٹھ کر کے میرے پاس بیٹھتی تو کہتی بہو جی مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی بھلا بھگوان کو کیا پڑی ہے کہ بھگت کا سمرن اور بھجن کرتا پھرے۔ اتنے بہت لوگ تو اس کی اُپاسنا کرتے ہیں اور میں کہتی۔

" دیکھ مرنالنی اب تو مجھ کو چاہتی ہے۔ میں تجھ سے پریم کرتی ہوں، اس طرح سے بھگوان کا اور آدمی کا رشتہ جب پورے پریم کا ہو جائے تو بھگوان بھی تو آکاش کو چھوڑ کر نیچے آتا ہے کہ آدمی کو درشن دے اور اس کا کلیان ہو۔"

ان راتوں میں مجھے درختوں کی ٹہنیوں پر اندھیرے میں چھپے اور گاتے ہوئے پرندوں سے لے کر کمرے میں لکڑی کی درزوں میں رہنے والے کیڑوں تک کے بول سنائی دیتے تھے گڑھی سے تھوڑی دُور بہتی ہوئی ندی کے دھارے پر سے آتی پانی سے بھری ہوا میرے انگوں سے

چھُوتی مجھے الگ جان پڑتی تھی، ایک دم سے ساری دنیا جاگ گئی تھی، اونچی دیواروں کے پار سے کوئی بانسری بجاتا نکل جاتا تو میرے رُوم رُوم میں مستی بھر جاتی، جیسے میں آپ رادھا ہوں اور وہ انجانا کرشن کنہیا ہو سارے رنگ سارے روپ، اندھیرا اجالا ایک دھڑکنے والے دل کی طرح زندہ ہوگیا تھا، گڑھی کے اندر بسنے والی ساری باندیاں اور داسیاں جو پہلے کھلونوں کی طرح مجھے بے رنگ دکھائی دیتی تھیں اب زندہ اور الگ سی لگنے لگیں، یہ گرودیو مہاراج کی اشیرباد تھی۔

نندا نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ ان کی ایک نظر سے نصیب بدل جاتے ہیں۔

ہوتے ہوتے جیسے میں ایک نئی نگری میں جاگی تھی۔ سپنے سے آنکھ کھول کر میں نے دیکھا تو دنیا بدل گئی تھی۔ ٹھاکر کی جیت ہوئی تھی۔ اور وہ اب گڑھی سے باہر رہنے لگا تھا۔ اس کا زیادہ وقت بڑے شہروں تک آنے جانے میں لگتا۔ اس کے شکاری کتوں اور نوکروں کی پلٹنیں آنے والے بڑے افسروں کو شکار کھلانے کے لیے شکارگاہوں تک جاتی رہتیں، وہ واپس آتا تو شور اور ہنگامہ ہوتا، مگر ہمارے اندر کی دنیا بھی تو بدل چکی تھی۔

مرنالنی نے پوجا پاٹ کم کر دی تھی، وہ اب اپنے پتی دیو کے پاس رہتی، اس کے چہرے پر نیا نکھار آگیا تھا، سندر لال باپ کے بعد کاروبار سنبھالتا تھا، چندا بجھتی ہوئی بتی کی طرح ہوتے ہوتے گھلتی گئی، وہ کم ہی کم ہمارے پاس آتی، سندر لال نے جیسے ایک دم اپنی ذمہ داری محسوس کی ہو، مرنالنی کی سیاہ آنکھوں میں جوت دیکھی ہو اور اس لَو پر پتنگے کی طرح گر گیا ہو۔

نندا اسی طرح اپنا سیاہ چادرہ پہنے بیراگن بنی مندر کی چوکھٹ کے باہر لگی رہتی میلے من کے ساتھ مورتی کے آگے جھکنے سے بھلا کہیں پوجا سویکار ہوتی ہے۔

یہ نئی جاگ میرے اندر ایک نئی جان کی طرح بڑھ رہی تھی، اور میں یہ راز اپنے اندر چھپائے ہوئے سب پر ہنستی رہتی، میرا گیان دھیان میرے اندر تھا، راتوں کو جاگ کر میں سوچتی رہتی ایسی ہی اندھیاری رات میں اسی کھلے دروازے سے وہ اندر آئے گا تب ہرف

اس کی آنکھوں کی روشنی ہو گی جو اس اندھیرے میں جوت بن کر جلے گی پھر ہم دونوں ہوں گے اور پریم کا نیلا گہرا ہٹھا ٹھیں مارتا ساگر ہوگا۔ ہم دونوں مل کر ایک گیت بن جائیں گے کیونکہ شاستروں میں بھی لکھا ہے کہ پریم کرنا چتر کاری کی طرح ہے رنگوں کو ملانا کہ ان کا کوئی مطلب بن سکے۔ اُن دنوں میں پوچھتی پریم کرنا کیسا لگتا ہے مرنالنی۔

مرنالنی کی آنکھوں میں شرم لال ڈوروں کی طرح اُبھر آتی۔ اس کے گال سرخ ہو جاتے وہ کہتی "بھوجی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں"

واقعی میں کیسی باتیں کرنے لگی تھی، پر مجھے کیا پتہ پریم کرنا کیسا لگتا ہے۔ ٹھاکر مجھے پدم رانی کہتا تھا، طاق میں سجائی ہوئی پرانے کھنڈروں سے نکلی مورتی کی طرح اس کو میری بڑی بڑی آنکھوں اور لمبے بالوں پر مان سا تھا۔ ویسے ہی جیسے بچپن میں ہم نے ہارتی دیوی اور پنچکا دیوتا کی مورتیاں اپنے طاق میں سجائی تھیں۔ ٹھاکر کے لیے عورت بھی ایک اچھے کھانے کی طرح تھی۔ جس طرح روز روز ایک ہی شئے نہیں کھائی جا سکتی اسی طرح اس کے لیے منہ کا سواد بدلنے کے لئے نت نئی عورتیں چاہیئے تھیں۔ پھر مجھے کیا پتہ چلتا کہ پریم کرنا کیسا لگتا ہے جب میں اس کی گڑھی میں آئی ہوں تو اس نے مجھے بھی ایک کھلونا سمجھ کر چاچا سے خریدا ہوگا اگنی کے گرد پھیرے شاید اس نے مجھ پر بہت ہی ترس کھا کر لئے ہوں گے، جانے کیوں اس نے مجھے سب سے الگ کیوں سمجھا تھا۔

جب باندیاں بیٹھتیں اور چھت پر بنے کمرے سے کھڑکی کے سامنے والے گول تالاب میں جھانکتے ہوئے میں ان سے کہتی گاؤ تو میرا جی چاہتا وہ سب مجھے بتائیں کہ پریم کرنا کیسا لگتا ہے۔

مجھے روشنی سے ڈر آنے لگا تھا۔ اندھیرے میں مجھے عجیب بول سنائی دیتے۔ انوکھے قدموں کی چاپ اپنی طرف آتی ہوئی جان پڑتی اور پھر جیسے کوئی جادو سے میرے انگ انگ کو چھو دیتا میرا گھونگھٹ ہٹاتا ہوا میں کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر اندھیرا کر کے اپنے دل میں

لاکھوں ارمان لئے لیٹی رہتی۔

نندا کہتی "پدم رانی تمہارا منہ کیوں پیلا ہوتا جاتا ہے، مانو تمہیں کسی سے پریم ہو گیا ہے۔"

پریم مجھے کسی سے پریم کیوں ہونے لگا۔ اور اس گھڑی مجھے لگا میں کتنی دکھی ہوں ایک پاگل عورت کی طرح اجاڑ خیالوں کے پیچھے، ایسے قدموں کی چاپ کے لئے جو اصل میں کبھی ان راہوں پر نہ گونجیں گے۔ ایک ایسی خوشی کی دیوانی جلانے میں اپنا آپ تباہ کر رہی تھی، جو کبھی میرے نصیب نہ ہوگی۔ اب میرا دل پوجا پاٹ میں بھی نہ لگتا۔

اور مجھے پتہ تھا گرو مہاراج کے آنے اور اندھیرے میں چلے جانے کے بعد سے گڑھی میں ان کی اشیرباد نے ایک نیا یگ پیدا کر دیا ہے۔ ظاہر تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

پریم میں کچھ نہیں ہوتا۔ صرف پریمی کو خیالوں میں ایک سکھ ملتا ہے۔

اور میں نے اپنے آپ کو سنوارنا سجانا شروع کر دیا۔

میں ایک گھڑی بھی ایک جگہ نہ ٹک سکی، میرے بچھوؤں کے گیت باغ کے راستوں، پھولوں کی کیاریوں اور گھر کے کونوں میں گونجتے رہے۔ جب کوئی نئی آس بندھتی ہے تو آدمی پھول کی پتی کی طرح ہلکا ہو کر اسی ہوا کے رُخ اڑنے لگتا ہے۔ چاندنی راتوں میں ساری آوازیں میرے دل کی طرح دھڑکتیں، کنول کے چوڑے پتوں پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے، کنجوں میں سے لتائیں اوپر درختوں کو لگی مجھے پریم کرنے والی عورتوں کی طرح لگتیں۔ مجھے پتہ تھا وہ سکھ جو اندھیرے اور انجانے اور سوئے رہتے اور گیتا اور گیان دھیان اور مرے ہوؤں کی طرح بے آس ہو کر جینے میں تھا وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

یہ نیا پریم تھا۔ پریم نے ہوتے ہوتے میرا سب کچھ ہر لیا تھا۔ میں پریم کے بس میں تھی پنجرے میں بند پرندے کی طرح میں پھڑپھڑاتی بھی تو مجھے رہائی کہاں مل سکتی تھی۔

سبھی پریمیوں کی طرح میں نے چندا کا سہارا لیا۔ پریمی کو ملنے کی آس کیوں لگی رہتی ہے

اور یہ آس آج تک ویسے ہی ہے میں نے اس راہ پر اپنا آپ سویکار کر دیا ہے۔ میں نے ٹھاکر کی سختیاں برداشت کی ہیں۔ آج تک اس پریم کی دیوالی جلاتی ہوں پر جانے کیوں یہ آس نہیں ہوئی ہوں۔ پریم آس کا نام ہے کیا؟

ٹھاکر نے کہا تھا کہ تم اس کا نام کیوں جپتی ہو جیسے وہ تمہارا بھگوان ہو۔ ارجن، ارجن ارجن اگر میں اُسے جان سے مار دوں، تمہارے سامنے لاکر اس کی بوٹیاں اڑا دوں تو کیا تب بھی تم اسی طرح ارجن، ارجن پکارتی رہو گی۔

"ہاں ہاں میں نے اسے کہا تھا۔ میں کیا تم سے ڈرتی ہوں۔ میں اب بھی اسے پکاروں گی میں اس سے پریم کرتی ہوں، میں پچھلے جنم سے ہی اس سے پریم کرتی ہوں میں نے اسی رات اپنی آتما اسے دے دی تھی جس رات اس نے مجھے اشیرباد دی تھی۔

اور ٹھاکر نے بندوق کا کندا اس زور سے میرے سر پر مارا تھا کہ مجھے اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا۔

چندا کا باپو جب پہلی بار پچھواڑے کے آنگن میں آیا اور میں نے اس سے کہا کہ وہ میرا سندیس گرو مہاراج تک لے جائے تو اس نے بہت ہولے سے کہا تھا۔

"رانی یہ راہ بہت کٹھن ہے اس پر نہ ہی چلو تو اچھا ہے اس کا انت کیا ہوگا بھلا؟ تم اس گھر کی عزت ہو۔ ٹھاکر کی گردن کو نیچا نہ کرو۔ اگر کبھی یہ پتہ چل گیا کہ تم نے ایسا کیا ہے اور میں بھی اس میں شریک ہوں تو میں مار دیا جاؤں گا تم اندر بیٹھنے والی عورت ہو تم نے دنیا نہیں دیکھی۔

تب میں نے کہا تھا "میں نے آج تک آسان راہوں پر چل کر کچھ نہیں لیا تھوڑے دنوں کٹھن راہوں پر چل کر بھی دیکھ لوں۔ تمہیں تمہارے کئے کا انعام ملتا رہے گا میں اپنا آپ بیچ کر بھی تم پر کوئی بات نہ آنے دوں گی

اس رات چندا میرے پاس ہی سوئی۔ اس نے مجھے ارجن کی کتنی باتیں بتائی تھیں، ارجن

جو دیوتا کے سمان اونچا اور اچھا ہے۔ ارجن جس کے لئے لوگ یونہی دیوانے تھے۔ ارجن جس کو پریم کرنے کے لئے پرماتما نے آپ اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔

وہ رات مانو میرے سہاگ کی پہلی رات تھی۔

اس رات میں نے سنگار کیا تھا، میں نے مانگ میں سیندور بھرا، سارے گہنوں سے اپنے کو سجایا، مدتوں سے صندوقوں میں بند ساڑھیوں کی تہیں کھول کر سرخ ساڑھی نکالی، بندیا لگائی اور سوئے ہوئے بھولے بسرے گیت بے آواز میرے دل کے اندر اترتے گئے۔ کھڑکی سے باہر رات تاروں بھری اور سہانی تھی۔ جیسے گہنوں سے سجی کوئی دلہن چوکھٹ سے باہر کھڑی من ہی من میں مسکرا رہی ہو۔ اور اس کا پریتم آنے والا ہو۔ لجاتی شرماتی۔

دوج کا چاند کھجور کے اونچے درختوں میں نکاشیوں میں سے تیرتا ذرا سی دیر میں آکاش کے نیلے پن میں سما گیا۔ میں چوکھٹ پر دونوں کہنیاں ٹکائے کتنی دیر باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ کسی چلنے والے قافلے سے پیچھے۔ پھر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لیمپ کی روشنی میں دیوار پر لگی تصویر میں سے کنہیا مجھے دیکھ کر ہنس پڑے۔ وہ درختوں کی اوٹ میں چھپے تھے اور گوپیاں پانی کی لہروں کے اوپر ہاتھ جوڑے اپنے انگ انگ کو پانی اور اداؤں سے چھپانے کی کوشش میں تھیں۔ یہ من موہن جو جھوٹا تھا اور جو ان ساری گوپیوں کے ساتھ راس رچاتا تھا۔ میں بھی کرشن کنہیا کو دیکھ کر ہنس دی اور اسی گھڑی دور آم کے کنج میں کوئل نے وہ دل کو بے چین کرنے والا سر چھیڑا۔ ایک بھونرا کہیں سے اڑتا کھڑکی کی راہ اندر آگیا اور روشنی سے ٹکرا کر گر گیا۔ میری نظروں میں پریتم کے نام اپنے پہلے خط کے لفظ گھوم گئے۔ میں نے جانے کتنے کاغذ کے ٹکڑے پھاڑے تھے اور پھر ارجن سے کہا تھا۔

میں جنم جنم سے اکیلی ہوں اور زندگی کے دریا کے کنارے پیاسی ہوں۔

سوچتی ہوں تم سے ایک بوند چاہوں جو یہ صدیوں کی پیاس بجھا دے۔

مجھے پھیرنا نہیں۔
لال بہادر نے کہا تھا کہ وہ دو چار دن میں کوئی جواب لے کر لوٹے گا پر اس خط کی طرح میرے سارے خطوں کے جواب کبھی نہیں ملے کیونکہ جب پتہ چلا کہ چندا کے باپو نے وہ خط کبھی دیئے ہی نہیں کبھی وہ خط ارجن تک پہنچے ہی نہیں تو مجھے دکھ نہیں ہوا تھا۔ میں دکھی ہونے اور نراشی کی منزل سے بہت دور نکل چکی تھی۔ کیا ہوا اگر ارجن تک میرے دل کی پکار نہیں پہنچی تو!

میں نے اسے تو پکارا تھا۔

کیا ہوا جو اس کو میرے پریم کی خبر نہیں ہوئی۔

میں نے تو پریم کیا تھا۔

اور آج بھی جب سہاگ کا دیا جلاتے اپنے سوکھے اور کانپتے ہاتھوں سے سنگار کر کے آئینے کے سامنے بیٹھی ہوں تو مجھے اس میں پرچھائیں بھی اس پہلی سہاگ رات کی دکھائی دیتی ہے جب میں نے اپنا دل آباد کیا تھا، جب سہاگ کا جوڑا پہنے پہنے جانے کتنی آنے والی ملن کی راتوں کا خیال میں نے اپنے جی میں باندھا تھا۔

ٹھاکر نے کتنی بار کہا ہے "تم کتنی ڈھیٹ ہو پدمنی تم ایک ایسے شخص کا خیال جی میں بسائے ہوئے ہو جسے تم نے ایک بار بھی اچھی طرح سے نہیں دیکھا، مگر میں اسے کیسے بتاؤں کہ وہ روز میرے قریب ہوتا ہے، وہ تو میرے انتر میں بستا ہے وہ تو میری جان کا ایک حصّہ ہے کوئی اپنا انگوں کو اپنے شریر کو اس کے کسی حصے کو کہیں چھوڑ سکتا ہے۔

اس رات تو چندا تھی اور میں اس سے بار بار پوچھتی تھی "کیوں چندا ارجن کو کون سا رنگ پسند ہے آج چندا کو یہاں سے گئے ایک زمانہ گزر گیا ہے آج مجھے پتہ ہے کہ ارجن کو وہی رنگ پسند آتا ہے جو میں پہنوں گی۔ اتنے بہت سالوں میں میں آپ اس کی ایسی دلہن بن گئی ہوں جس کا گھونگھٹ اٹھانے کی آشا اُسے ہر گھڑی بے چین رکھتی ہو۔

آدمی کیا کچھ کرتا ہے کتنے گھور پاپ اور کتنے بڑے کام۔ آج بھی کانپ جاتی ہوں جب سوچتی ہوں مرنالنی کو برباد کرنے والی چندا تھی یا میں؟

چندا نے تو مجھ سے صرف پوچھا تھا "بہو میری بات سنو ہے تو یہ بڑا کام پر اس کے بنا تمہاری نیا پار نہ اتر سکے گی۔ سمجھو میں کھو یا ہوں اور اگر چاہوں کہ نیا کو پار اتارنے کے لئے گھاٹ سے کوئی ایسا بوجھ بھی لدے گا، جسے تم نہ چاہو تو تمہیں ماننا پڑے گا

میرا دل کانپ سا گیا پر میں نے کہا تھا، چندا مجھے تم پر وشواس ہے پر ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے گھر کی عزت پر کوئی بات بنے۔

چندا نے ہنس کر کہا تھا، پدم رانی جب تم ایسی راہ پر نکلی ہو تو تم کو گھر اور عزت کے خیال کو سب سے پہلے بھولنا پڑے گا، یہ راہیں بڑی کٹھن ہیں، ان پر چلنے والے بھٹکتے ہیں تم کانٹوں کی سیج پر چلو گی اور پھر کہتی ہو تمہارے پاؤں زخمی نہ ہوں، ایک خط کی کوئی بات نہیں اب بھی سوچ لو پدم رانی ابھی واپس جانے کا وقت ہے۔

میں نے ہنس کر کہا تھا "چندا میں پریم کرنا چاہتی ہوں اور پریم کرنا کس نے کہا ہے کہ بُرا ہے "ایسی شبھ گھڑی میں تم سے الجھنا نہیں چاہتی۔ جو تمہارا جی چاہے کرو۔

اور چندا نے ہنس کر کہا "مرنالنی کو بھی اپنے ساتھ لگانا پڑے گا؟

دیکھے میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، چندا میرے پیچھے کھڑی تھی اور میں آئینہ لیے لیمپ کی روشنی میں اپنے گالوں پر لالی کی تہہ ٹھیک کر رہی تھی تیزی سے گھومنے میں آئینہ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور تیز روشنی میں ہر ٹکڑے میں میرا عکس کانپتا اور لالی کی تہوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

یہ اچھا شگون نہیں ہے پدم رانی، جانے اس راہ میں کیا کچھ ہو جائے۔

اور میں چندا کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی، کالی رات میں سے ایک چڑیا پہلے کھڑکی کے کھلے پٹ کے ساتھ زور سے آکر ٹکرائی اور پھر اندر آن گری۔ وہ کانپ رہی تھی اور اپنی

نیلی چونچ سے اپنے پروں کو اپنے گرد پھیلا رہی تھی۔

میں نے اُسے اٹھا لیا تو اس نے اپنا آپ چھڑانے کی ذرا کوشش نہیں کی اور آنکھیں بند کر کے میرے سینے سے لگ گئی۔

چندا نے کہا جانے اس چڑیا کو کیا ہوا ہے کہ آدھی رات کو ڈرتی کانپتی آن گری ہے پھر ہنس کر کہنے لگی "کیا پتہ ہے اس نے بھی پریتم کیا ہو اور پریتم کو ملنے نکلی ہو اور راہ بھول بیٹھی ہو۔

مرنالنی سیدھی اور بھولی تو نہیں تھی مگر اس کی طبیعت میں دوسروں پر جلد اعتبار کر لینے کی خرابی تھی اور یہی خرابی اسے لے ڈوبی گھر کی باتوں میں اگر کوئی اسے یونہی کہہ دیتا کہ سندر لال نے تمہارے لئے یہ کہا ہے تو وہ اس سے روٹھ جاتی، یوں مجھے معلوم تھا کہ وہ پتی ورتا استری ہے، بھگوان کی آڑ بھی اس نے اس لئے لی ہے کہ لال نے اسے نہ محبت دی تھی اور نہ اس کی پرواہ کی تھی گرو مہاراج کی اشیر باد کے بعد سے اس نے اپنے پتی کی طبیعت میں تبدیلی دیکھی تو وہ پھر اس کے پاؤں میں جا گری، ایسی عورت سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی الجھی راہ پر چل پڑے غلط تھا مگر اس کو جو دوسروں پر اعتبار کرنے کی عادت تھی، اس سے چندا کو جیت کی امید تھی۔

دنوں میں نے چندا کو نہیں دیکھا، مرنالنی اور وہ مجھے کبھی دکھائی دے جاتیں کونوں میں کھڑی باتیں کرتی ہوئیں۔ میں چھت کے کمرے کے پردے گرائے اپنے میں آپ قید تھی، ان دنوں مجھے ٹھاکر کا نام تک بھول گیا تھا، میں نویلی دلہن بنی سنگار کئے کوئلوں کی کوک سنتی رہتی، بانسری بجاتا کوئی باغوں سے پرے نکل جاتا تو میں جاگ سی جاتی، ان دنوں ساری آوازیں خوشبوئیں اور ہواؤں میں گھلے رنگ میرے پریم کے تانے میں نئے بوٹوں کی طرح کا بانا بنے ہوئے تھے۔ رات کو مجھے لگتا کوئی ہولے ہولے دوار کھٹکھٹاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو پدمنی ہمیں اندر آنے دو، پدمنی ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔ وہ راتیں گزر گئیں، سال

بیت گئے زمانے جاکر ایک گھڑی بن گئے۔

چندا نے مرنالنی کو کیسے اپنے ڈھب پر لگایا ہوگا۔ یہ میں نے اس سے آج تک نہیں پوچھا آج جب وہ مجھ سے اشیرباد لینے آئی ہے اور اپنے سہاگ اور گھر کو آباد سمجھتی ہے اس کے میرے درمیان بہت دیواریں ہیں میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتی، بیتا زمانہ اس کے لئے ایک بڑا سپنا بن گیا ہے اور میرے لئے سارا جیون۔

انسان کی سوچ اور حالات کتنے فرق پیدا کر دیتے ہیں۔

بچوں میں گھری وہ یہ بھول گئی ہے کہ چندا کے ساتھ جس دن اس نے میرے کمرے میں قدم دھرا تھا وہ ایک نشے میں مست تھی، گھڑی گھڑی اپنا پلو آنکھوں تک لے جاتی، ہاتھوں سے منہ کو چھپا لیتی اور کہتی "چندا مجھے شرم لاگے ہے وہ گرو دیو مہاراج ہیں مجھے تو اپنے چاچا کے سمان لگتے ہیں بھلا میں ان سے کہوں گی جب وہ ملے تو ان سے کیونکر بتاؤں گی کہ وہ بھی مجھے اسی طرح اچھے لگتے ہیں جیسے میں انہیں۔"

میں حیران سی چندا کے اس سارے کھیل کا مطلب سمجھتی ہوئی چپ تھی۔

مرنالنی نے پلٹ کر مجھ سے کہا "بہو جی یہ کیسا ہے، مجھے تو پتہ نہیں چلتا یقین نہیں آتا۔ بھلا چادروں میں لپٹی اتنی باندیوں میں سے ان دونوں نے مجھے اور آپ کو پہچان لیا ہو، کیوں بہو جی کیا ہم میں دوسروں سے فرق بات تھی؟"

میرا دل بھر آیا، میں مرنالنی کو سچ بتا سکتی تھی پر آدمی کی سدا کی اپنے لئے دوسروں کو تباہ کرنے کی عادت نے مجھے کچھ کہنے سے باز رکھا، میں یونہی چپ رہی اور اس رومال پر سوئی سے پھول بناتی رہی جو میں اگلی بار اور تحفوں کے ساتھ ارجن کو بھیجنے والی تھی۔

میں اور چندا اب لوٹ نہیں سکتے تھے مرنالنی کو جس راہ پر ہم نے گھسیٹا تھا اس پر کے سارے دروازے واپس جانے والے راہ پر بند ہو چکے تھے۔

لال بہادر کوئی پندرہ دنوں بعد لوٹا، میرے خط کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

زبانی انہوں نے کہلوایا تھا کہ وہ بہت اداس رہتے ہیں۔ تم بہت یاد آتی ہو۔ تمہاری صورت آنکھوں میں پھرتی ہے تمہارا جسم جو کنول کے پھول کی طرح ہے۔ یہ سوگند جو کسی دور دیس کی ہے اس سے وہ مست ہیں۔

میں چپ چاپ چندا کی طرف دیکھتی رہی۔ بھلا انہوں نے کہاں میرے جسم کی خوشبو سونگھی ہے کیسی غلط باتیں تھیں جو یہ لال بہادر کہہ رہا تھا ایک پل کے لئے مجھے لگا یہ سب جھوٹ ہے مگر اور کوئی راہ بھی تو نہیں تھی کہ میں اس پر چلتی۔ میرا دل مدتوں بعد جاگا تھا مجھے سنگھار کرتے ہوئے خوشی ہوتی تھی۔ اتنی دوری سے ہی سہی کسی نے یہ تو کہا تھا کہ وہ مجھے دیکھنا چاہتا ہے۔

جیون کے آخر میں جب موت قریب ہے میں دل سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے ان جھوٹے سہاروں پر یقین کیوں کیا؟

دل کہتا ہے پدمنی تیرا کیا جاتا ہے اگر یہ یوں ہوا۔ جب تیرے وشواش کو مدتوں پہلے ٹھیس لگ چکی تھی تو تو نے یہ دیوالی آج تک کیوں جلائی ہے؟ آج کوئی ایک نظر تک نہیں، ایک محبت بھری نگاہ تک نہیں، چاہت کا ایک بول نہیں جو کسی نے مجھ سے کہا ہوتا۔

میں نے اس رات چوکی پر بیٹھے بھکاری کے کشکول میں سارا کچھ ڈال دیا تھا بھکشا کے ناطے میں نے اپنا آپ دان دیا تھا۔ پر آج بھی وہ لفظ میرے جی میں اسی طرح دیوانی ہواؤں کی طرح چکر لگاتے ہیں وہ سارے بول جو کہے نہ جا سکے۔ کیونکہ ہمارا سندیش کبھی ارجن تک پہنچ نہ سکا۔ لال بہادر نے دل کو دھڑکنے کے لئے گرمی دی تھی۔ لال بہادر نے اپنی بیٹی چندا کی بے عزتی اور موت کا سامان کیا تھا اور پھر بھی لال بہادر نے وہ سب کچھ کیا تھا جو ایک چھوٹا آدمی کرتا ہے۔

مرنالنی اور میں سر جوڑے بیٹھی رہتیں، اور وہ ساری باتیں بار بار دہراتیں جو اس ایک گھڑی ارجن نے کی تھیں۔ وہ رنجن کو یاد کرتی اور پھر شرم سے دوہری ہو جاتی۔ میں دل ہی

دل میں اپنے اس جھوٹ پر ہنستی مجھے کیا پتہ تھا کہ ہم دونوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔

باندیاں اگر کبھی راتوں کے اندھیارے میں اپنے چاہنے والوں سے مل کر آتیں تو میرا دل تیزی سے میرے سینے میں پھڑ پھڑانے لگتا، دن پر لگا کر اُڑتے تھے اور راتیں کتنی میٹھی لوریاں سناتی تھیں بہاریں، برساتیں یوں گزرنے لگتیں جیسے دنوں کی لمبائی کبھی پوری نہ ہوئی۔ ہو مرنالنی کو سوائے نرنجن کے دنیا کی ہر شے بھول گئی۔

اکیلے میں چندا سے میں نے اکثر پوچھا تھا "چندا یہ تُو نے کیا کیا ہے۔ ارے میری بات تو دوسری تھی، میں نے سچ سمجھ کر یہ سب سویکار کیا تھا، پر مرنالنی جو اس گھر کی بہو ہے۔ ارے تو نے اسے ایک جھوٹ کے بدلے میں باندھا۔"

چندا ہنس کر کہتی۔ "پدم رانی اس کے بنا چارہ نہیں تھا اور پھر تم نے بھی ارجن کو کہاں جی بھر کر دیکھا ہے۔ رات کا اندھیرا تو دھوکہ دیتا ہے۔ تم بھی اس بے یقینی میں ہو۔"

پر میں نے ارجن کو آپ پسند کیا ہے۔ یہ راہ میں نے اپنے لئے آپ چنی ہے۔

تو مرنالنی کو اس کے جلد وشواس کر لینے کی عادت کی سزا ملنی چاہیئے، اب بھگتے جھوٹی آسوں میٹھے سپنوں اور دیوانگی کے وہ دن۔

وہ سارا سمے جو بیت گیا ہے اور سمے کے پیچھے کی ہاس ہار کا دکھ، اس دکھ کا دشواس جو مجھے پہلی گھڑی سے ہی تھا پر پھر بھی میں چندا سے لگی رہی۔ کوئی دل میں ہولے ہولے کہتا یہ سب جھوٹ ہے یہ سب جھوٹ ہے۔

میں نے کہنے والے کی بات سنی ان سنی کر دی۔

اور دل میں کہنے والے نے اپنے ہونٹ سی لئے بھلا ان دنوں اگر کوئی مجھے آن کر کہتا بھی تو میں سنتی!

لال اور چندا مجھے اپنے پیارے اور قریبی لگتے تھے۔

پہلی بار جب میں نے کانپتے ہاتھوں سے چندا کو خط دیا تو میرا دل یوں پھڑ پھڑایا، مانو سینے سے

باہر نکل جائے گا. گرہی کی دیواریں ٹھاکر کی لاج اس بڑے گھر کا مان سارے بندھن میرے پاؤں پڑتے رہے ہاتھ جوڑتے رہے اور میں نے آنکھیں بند کرلیں، مجھے چندا کی وہ مسکراہٹ آج بھی یاد آتی ہے جیسے میری ہنسی اُڑا رہی ہو۔

خط ہاتھ میں لئے وہ واپس آگئی اور کہنے لگی بابا تو بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔

کیوں کیسی مصیبت ؟ مجھے لگا خوشی کے چہرے پر سے ایک سیاہ سایہ گزر رہا ہو۔ چندا نے کہا "بابا کو یہیں پر ٹھاکر کے کسی کارندے کے پچاس روپے دینے ہیں وہ راہ روکے بیٹھا ہے"

"بس اتنی سی بات ہے" میں نے پٹاری کھول کر پچاس روپے دیتے ہوئے کہا۔

وہ سب دن جولال کے لوٹ کر آنے میں لگے میرے لئے سپنوں کے دن تھے۔

میں اپنے خط کی سطریں بار بار دہراتی، ارجن کو خط پکڑتے پڑھتے خوش ہو کر جواب لکھتے دیکھتی، ایک تصویر دن کے قافلے کا سفر ہر گھڑی میری آنکھوں کے سامنے سے شروع ہو کر ختم ہوتا۔

باغ میں کھلنے والی کھڑکیوں کے پردے ہٹائے میں پونم کے چاند کو گندھروتی کی شاخوں میں الجھا دیکھتی پھر وہ تیرتا اور میری چوکھٹ پر آن رکتا چاندنی اندر آتی اور میرے پاؤں پڑتی کرنوں کی سیڑھی پر اپنے سفید پاؤں دھرتا ارجن آتا اور میری سانسیں گڑبڑا جاتیں، میری آنکھیں اُٹھ نہ پاتیں لاج سے بوجھل سر جھک جاتا، ارجن کے ہاتھ چپکے سے میرا گھونگھٹ اُلٹ دیتے۔

اس کے سانس کی سوگندھ میرے گرد لپٹ جاتی اور میں لہروں میں بہتی اُن باہوں میں ٹکی جانے کتنے زمانوں کے پار چلی جاتی، وہ سارے زمانے جو ارجن کے میرے درمیان تھے۔

بہت دنوں میں لال آیا۔

اس رات ٹھاکر جانے کیسے بھول کر میرے کمرے میں آیا تھا، میں سردی کی پرواہ

کئے بنا کھڑکی کا پٹ پکڑے باہر اندھیرے میں دیکھتی، پچھلی راتوں کے ابھرنے والے چاند کا انتظار کرتی گنگناتی جاتی تھی۔

پدم رانی تم تو بہت بدل گئی ہو۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا تم بھی تو بہت بدل گئے ہو آج راہ کیسے بھول پڑے ہو۔

ٹھاکر نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تم نے کبھی مجھے بلایا بھی تو نہیں ،،

میں نے ہاتھ چھڑا کر انہیں اپنی چادر سے پونچھ لیا اور پٹ کو اسی طرح پکڑتے ہوئے کہا تمہیں اور مجھے ایک دوسرے کی کبھی ضرورت نہیں ہو گی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو پدم" اُس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ میں جہاں بھی ہوتا ہوں جس طرح بھی، تم میرے دل میں رہتی ہو۔ جب کنچنی ناچتی ہے تو اس کے سر جھٹکنے کے انداز سے لے کر اس کی ہنسی تک میں مجھے تم دکھائی دیتی ہو"

" ایک کنچنی میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں نا، میں نے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

" مجھے جوتے بھی بھاتی ہے تمہاری وجہ سے۔" ٹھاکر نے اسی طرح اپنی کانی آنکھ جھپکاتے ہوئے کہا۔

پھر سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور جنیدا نے زور سے پُکارا " بہو رانی ،،

ٹھاکر نے کہا۔" اچھا پدم رانی میں چلتا ہوں، تم اپنی سکھیوں سہیلیوں میں خوش رہو ،،

کوئی اور دن ہوتا تو اپنی تنہائی سے گھبرا کر میرا دل ٹھاکر کو پکارتا مگر آج !

لاؤ میں نے ہاتھ جنیدا کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پلنگ کی پائینتی بیٹھتے ہوئے کہا" بابا لوٹ آیا ہے مہاراج نے جواب میں

کہلوایا ہے۔"

"کہلوایا ہے"، میرے ہاتھ بڑی نراشا سے میرے پہلو میں گر گئے۔

"ہاں بہورانی" چندا نے سر جھکا کر کہا" انہوں نے کہلوایا ہے کہ میں بھی پریشان ہوں تڑپتا ہوں۔ جی چاہتا ہے پر لگا کر آؤں، پر تھوڑے کام ہیں میں جلد ہی آؤں گا۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا میں نے تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ طوفان کی سی تیزی سے میرے خیالوں نے مجھے چکرا یا گھمایا اور ہوا کے ساتھ ساتھ میں اوپر اڑی یہاں تک کہ دنیا اور اس کے باسی ڈولتی ہوئی بتی کی روشنی میں بڑے دیوانے پتنگے لگنے لگے۔ تڑپنے گھبرانے کے وہ دن،

آس اور انتظار کے وہ دن۔

خوشیوں اور سپنوں کے دن۔

سردی میں نکھار آ گیا تھا۔ درختوں کے سایوں میں سندرتا تھی میں اکیلی ہی راتوں کو باغ کے راستوں پر گھومتی رہتی۔ ارجن کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس کے سینے سے لگی مجھے لگتا میرے اندر جانے کتنے جنموں کا اکیلا پن تھا جو میں نے اس خوشی کے ہاتھوں بیچ دیا ہے ایک گھڑی میں یہ خوشی ہزار جنموں کے بدلے مہنگی نہ تھی۔

چندا ارجن کب آئیں گے؟" میری آس بھی دوار پکڑے راہ دیکھتے دیکھتے گھبرا چلی تھی۔ مہینہ مجھے سارے پچھلے زمانوں کے برابر لگا۔

چندا نے کہا" جانے مہاراج کیوں نہیں آئے بہورانی"،

میں نے سوچا کیوں نہ لال کو پھر بھیجا جائے اور پھر لال کے ہاتھ میں نے اپنا راتوں کو جاگ کر سوچ میں ترتیب دیا ہوا خط دیا میں نے لکھا تھا۔

ارجن!

تم پریم کے ناطے میرے بھگوان ہو گئے ہو۔ بھگوان ہو کر بھی اپنے

داس کے دل کا حال نہیں جانتے، کہہ کر نہیں آئے، اچھا نہ آؤ گے تو بھی میں تو تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی۔ تم میرا سہاگ ہو اور میں تمہارے راہ میں اپنا دیا جلائے بیٹھی ہوں، دیکھو میری بھینٹ تو سویکار کرلو۔

چندا نے کہا باباکو زمین کا پیسہ دینا ہے دو ہزار چاہئیں، اگر روپے کا بندوبست ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے چند دن اور رکنا پڑے گا۔

میں نے اس بار بھی ہنس کر دو ہزار روپے اور خط چندا کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرا دل کہتا تھا جواب اب بھی نہیں آئے گا ناتھ اب کے بھی بھینٹ سویکار نہیں کریں گے۔

نند لال اب کے بھی جواب نہیں لایا۔ چندا نے چپکے سے میرے ہاتھ میں ایک تصویر پکڑا دی۔

ارے یہ دیوتا

میرے خالی دنوں میں دیوتا کی مورتی نے رنگ بھر دیا۔ اپنا کمرہ بند کئے میں پہروں بیٹھی رہتی میں نے کاغذ کے کر پنسل سے آڑی ترچھی تصویریں بنائیں مگر دیوتا کی کوئی شبیہ نہ بن سکی۔

میرا دل کاغذ پر اتر نہ سکا۔ میں نے پھولوں کے رنگوں سے آنکھوں کی روشنی میں گھول کر چمکتی ہوئی بولتی تصویر بنانے کا کام شروع کیا۔ ان دنوں ٹھاکر اور چندا گڑھی اور ساری دنیا کہیں اندھیرے میں گم ہو گئی میرے دل کے اندر کوئی شے تھی جو پہلے بند اور گھٹی ہوئی تھی، اب کھل کر خوشی بن کر میرے خون میں مل کر میرے رگوں میں جادو بنی بسنے لگی تھی۔

مہینوں بعد کاغذ کے ڈھیروں اور رنگ کے اندھیرے میں سے روشنی کی ایک کرن چمکی ارجن کی ایک تصویر نے مجھے چتر کار بنا دیا۔

جس دن میں نے چندا کو ارجن کی تصویر دکھائی، اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا وہ میری

طرح خوش نہیں ہوئی چپ چاپ دیکھتی رہی ۔

میں نے کہا "ارے دیکھو چندا میں نے کیا بنالیا ہے ۔

چندا نے کہا بابا تمہارا ج کو لینے جانے والے ہیں مجھے بہت فکر ہے جانے کہہ کر کیوں نہیں آئے ۔

"اچھا" میں نے یوں کہا جیسے اس بات سے میرا کوئی واسطہ ہی نہ ہو ۔

"بہورانی پھر میں بابا کو کہوں کہ جائیں"

ہاں میں نے کہا کیوں نہ جائے مگر کتنے روپے کی ضرورت ہوگی ۔

"پانچ ہزار" چندا نے بنا پلک جھپکے کہہ دیا ۔ اس کے میرے درمیان اب یہ ایک سودے کی بات تھی، ہر بار لال کے جانے کے دام پچھلی بار سے دوگنے ہو رہے تھے ۔

"کرواچوتھ کا برت رکھو گی" چندا نے چلتے چلتے پوچھا ۔

ارے ہاں کیوں نہ رکھوں گی ۔

ارجن !

میں نے تمہیں اپنا بھگوان دیوتا پتی سب کچھ مان لیا ہے، سہاگن ہوں اور یہ برت میں نے تمہارے لئے رکھا ہے مجھ پر وشواس رکھو جب تک زندہ ہوں یہ برت رکھوں گی پر اس کے پتی تم ہو کے میں نے اپنی آتما تمہیں دی ہے رہ گیا یہ شریر تو یہ اگر تمہارے کام آسکے تو میری بھینٹ سویکار ہوگی اگر نہیں تو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ جانے تم کٹھور کیوں ہو ۔ تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے درشن دو، میں تن من سے تمہاری پوجا میں لگی ہوں ۔ ایک گھڑی کے لئے کبھی آؤ تو پجارن تمہارے چرنوں میں سکھ پالے ۔ تمہاری اشیرباد لے کر میں نے تمہیں دکشنا دی تھی ۔ اب مجھے بھکشا کے ناطے درشن تو دو !!

خط کو دوبارہ پڑھ کر میرا جی چاہا میں کچھ بھی نہ لکھوں بھلا وہ تو کچھ لکھتے نہیں آخر کیوں نہیں ؟ پھر دل نے کہا سوال کرنا تمہارا کام نہیں ۔

ہاں میں نے کہا بھلا میں اور دیوتا سے ضد کروں اور لال اب کے بھی خط لے کر اپنے

سفر پر روانہ ہو گیا۔

مرنالنی نے کہا "جانے کیا بات ہے نہ ہمارے لکھے کا جواب ہی آتا ہے اور نہ ہی کوئی

اور طرح کی نشانی۔"

تصویر کے راز کو چھپائے چھپائے میں نے کہا "نرنجن شاید ان باتوں میں یقین نہ

کرتے ہوں۔"

مرنالنی نے کہا یہ بات جنم جنم تک چھپی نہیں رہ سکتی، پدم رانی، مٹھاکر تو اندر آتے

ہی نہیں ہیں اس لئے تمہیں تو اس نرک میں سے نہیں نکلنا پڑتا جس سے میں روز ہی ٹکراتی

ہوں، میں اب نرنجن کے بنا نہیں رہ سکتی، میں آکاش پر نہیں اڑ سکتی ہوا میں نہیں رہ سکتی

سپنوں کی پرچھائیں میں جان نہیں ہے میں تو اس ٹھہرنے سے مرجانا اچھا سمجھتی ہوں اب کے بھی

لال بہادر اگر خالی ہاتھ آیا تو میں کسی اور کو بھیجوں گی۔

مرنالنی میں نے سپنے سے جاگتے ہوئے کہا "کیا کہہ رہی ہو"

"ہاں پدم مجھ میں اب اور راہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔ میرا پتی روز مجھ سے پوچھتا ہے کہ

مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے، میں اسے کہہ نہیں سکتی کہ اس کا چھونا بھی مجھے برا لگتا ہے وہ بات کرتا ہے تو

میں جواب نہیں دیتی، کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے اُسے کہہ دوں، اُسے سب کچھ بتا دوں۔ ہنس کر

اسے کہوں کہ تم کس مرنالنی کی کھوج میں ہو میں تو کسی اور کی ہوں۔"

"مرنالنی میں نے وہیں پلنگ پر گرتے ہوئے کہا میں تو ارجن کی ایسے ایسے کئی جنم راہ

دیکھ سکتی ہوں۔"

"تم میں ہمت ہے پدم تم کسی اور دنیا سے آئی ہو۔ اصل میں تمہیں ایک خیال کی کھوج

ہے جس پر اپنا سب کچھ بلیدان کر سکو۔ میں اسی دنیا کی باسی ہوں۔ مجھے اسی سنسار میں نرنجن کو

ملنا ہے اس میں چاہے مجھے مات ہو اور چاہے جیت۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے مرنالنی تم اس گھر کی بہو ہو ان دیواروں سے باہر نکل نہیں سکتیں پھر اگر ایسی بات ہو گئی تمہیں مات ہو گئی تو کہاں جاؤ گی؟

"میں کوئی پدم نہیں ہوں جس کو ٹھاکر نے سوداگر سے خریدا ہو" وہ تیزی میں بات کہہ گئی اور پھر مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی "دیکھو بہو رانی مجھے معاف کر دو نا. آج کل میں پاگل ہو رہی ہوں ایک سال ہونے کو آیا ہے لال بہادر کتنی بار گیا ہے اور ہر بار خالی ہاتھ پھر آیا ہے. مجھے تو لگتا ہے یہ وہاں تک جاتا ہی نہیں۔

"نہیں مرنالنی ایسا نہیں ہو سکتا" میں نے من ہی من میں ارجن کی تصویر دیکھ کر کہا۔

"پنجرے میں بند چوہوں کی طرح مرنے کی بجائے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ہمت کریں اور اپنے نصیب کا لکھا پڑھیں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا، انگلیوں میں لگا رنگ اس کے ہاتھوں پر بھی چڑھ گیا۔

یہ تم کواڑ بند کئے کیا کرتی رہتی ہو بہو رانی. اس نے رنگ کو چادر پر چھڑانے کی کوشش کی۔

اچھا تو پھر آخری بار لال بہادر کو اور بھیج دیں گے. اگر اب کے بھی انہوں نے آنے کا وعدہ نہ کیا تو میں کوئی راستہ سوچوں گی مجھے چندا پر اور لال بہادر پر وشواس نہیں جانے سے پہلے ہی یہ تم سے ہزاروں روپے لیتے ہیں ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہم کو لوٹ رہے ہیں، میں نے تو اپنے زیور بیچ دیئے ہیں پر یم مجھے مہنگا پڑا ہے.

مرنالنی جانے کیا کچھ اور کہتی.

چندا نے کہا "بابا لوٹ آیا ہے۔"

"خالی ہاتھ ہو گا" مرنالنی نے ہنس کر کہا ارے چندا تم نے تو ہمیں یونہی برباد کر دیا ہے۔

چندا نے برا سا منہ بنا کر کہا "چھوٹی بہو بھلا کسی کو کوئی برباد کر سکتا ہے۔ بربادی تو ہر آدمی کے اپنے

اختیار ہے آپ ابھی سے گھبرا گئیں، جس راہ پر آپ چلی ہیں یہ راہ بہت کٹھن ہے اور رات میں کیا ملے یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا۔"

"ارے چندا تم تو بُرا مان گئیں"، میں نے گھبرا کر کہا۔ چندا کا خوش رہنا ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری تھا۔ باہر کی دنیا ار جن من کی خوشی سبھی تو اس کے ایک بول کے دم سے تھی۔

چندا نے اسی طرح کہا "بہو رانی بھلا اس میں میرا کیا دوش ہے۔ میں ان لوگوں کے دل کی بات کیا جانوں۔ کوئی میں تے جان بوجھ کر تو آپ کو کہا نہیں۔"

مرنالنی نے کہا، "ایک سال ہونے کو آیا ہے وہاں سے بھی کوئی جواب ہی نہیں آ پاتا۔ آخر اندھیروں میں کب تک بھٹکا جائے۔"

چندا نے پھر کہا "چھوٹی بہو یہ کوئی کھیتی تو نہیں ہے کہ سال کے بعد ضرور کچھ اُگے پھل والا درخت تو نہیں کہ اس میں پھل لگیں گے۔ یہ دل کا روگ ہے اس میں کبھی کبھار سوائے بدنامی کے کچھ بھی نہیں ملا کرتا"

مرنالنی نے کہا، "چندا یہ سب باتیں تم نے مجھے پہلے کہی ہوتیں، اگر تم نہ کہتیں کہ وہ سچ مجھے یاد کرتے ہیں تو میں کیوں اس راہ پر چلتی۔

چندا نے اُسی ڈھٹائی سے کہا، "چھوٹی بہو ہر کوئی جو آپ کو یاد کرے گا، آپ اس کے پیچھے دوڑ پڑیں گی کیا؟

میں نے دیکھا مرنالنی کا چہرہ پہلے سرخ ہو گیا پھر ایک دم اتنا زرد جیسے کسی نے سارا خون اس پر سے نچوڑ لیا ہو اس نے منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپانے کے لئے کھڑکی کے باہر جھانکا جہاں ہوا سردی کے آخری دنوں میں سوکھے پتوں پر دبے پاؤں چلتی اپنے بسنتی دامن جھٹکتی پھرتی تھی اور سنکھ بکھیر و ڈال ڈال کو دہے تھے اور یہی شام تھی جب ہماری بربادی نہیں صرف میری بربادی کا بیج بو گیا ہم نے ایک آخری کوشش کرنے کی صلاح کی۔

میں تو کئی جنموں انتظار کر سکتی تھی، مگر مرنالنی کا کیا تھا جانے کیا گزرے، اصل میں اس کے لئے مجھے بھی اندھیرے میں کودنا پڑا اور آج تک میرے قدم پاتال میں کسی شے پر نہیں ٹک سکے۔ مرنالنی نے نرنجن کے لئے تحفوں کا ایک صندوق بھر ڈالا تھا، چاندی اور سونے کے تصویریں رکھنے کے چوکھٹے، ہیرے کی انگوٹھیاں کپڑے اور جانے کیا کیا تیاری کرتے ہوئے جب اسے کچھ دیتی تو بھاگی ہوئی آتی اور کہتی پدم رانی میں تو تشکنلا ہوں اور اپنے راجہ کو یہ ساری چیزیں بھیج رہی ہوں شاید اسے کسی شے سے میری یاد آجائے۔

اوہ! مرنالنی تو پاگل ہو گئی تھی۔

میں چاہتی تھی اسے روک دوں، اس آخری گھڑی اُسے سب بتادوں، مگر میری زبان سے لفظ نکل نہ سکتے تھے۔ اس ایک پل کی غلطی نے مجھے اور مرنالنی کو کیا دیا اتنا کچھ کہ اسے بھوگنے کے لیے جنموں بھی ہم جی سکتی تھیں، چندا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

وہ آخری خط تھا جو میں نے ارجن کے نام لکھا۔

ارجن

تم بھگوان بن کر دیوتا بن کر مہربان نہیں ہوئے میں پجارن تو ضرور ہوں پر درشن کی بھی آس لگائے بیٹھی ہوں اگر آسکو تو مجھے چلنے کے لیے راہ کے نشان دکھائی دے جائیں، آؤ تو دیکھو کہ میں نے مندر کی سیڑھیاں دھو کر مورتی کے خالی آسن پر پھول رکھے ہیں جب تم مندر میں آؤ گے تو پھر پھولوں کے لئے جگہ کہاں رہے گی رایک سال تو کیا میں ایک جنم تمہاری راہ دیکھ سکتی ہوں، صرف تم کبھی آنے کا کہہ تو دو تمہارے قدموں کی چاپ سننے کے لیے راکھ بھی راہ دیکھتی رہے گی، مجھے معلوم ہے، یہ ایک جگ کا نہیں سارے جنموں کا بیوپار ہے، تمہیں پاکر بھلا کسی نقصان کا خیال آسکتا ہے۔

لکھنے میں قلم رک کر چل ہی نہیں پاتا تھا دماغ خالی تھا اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں جو اپنے من کو پھول کی طرح کھلتا پاتی ہوں آخر آج کیوں ارجن کے نام خط لکھتے ڈر رہی ہوں

اس سے پہلے بھی لال بہادر ہمارے خط لے کر گیا تھا گو اس نے جواب کبھی لاکر نہیں دیا مگر ارجن کی ایک تصویر تو تھی اور جہاں تک مجھے خیال تھا، ارجن کا نام بھی اس کے پیچھے لکھا تھا۔

کالی رات اندھیارے کی چادر اوڑھے جاتی تھی کہ چاند نے اس کو پکڑ لیا آس پاس کے تارے نکلے اور چادر کو الٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں گزاری۔ بھگوان جانے اگر اب بھی ارجن نے جواب نہ دیا تو کیا ہوگا۔

آخری بازی اور آس کی ٹوٹی ڈوری کو گرادھی کے دالانوں میں کہاں تک گھسیٹا جائے مگر بنا آس کے بنا جھنکار کے یہ چپ چاپ مجھے نگل نہ لے گی۔ بھلا کیا ہوگا اسے پدم رانی کیا ہوگا؟ میں ماں کے کہنے کے مطابق رانی تو بن گئی پر کسی دل کے سنگھاسن پر راج نہ کر سکی کوئی میرے دل کے مندر میں کھلے دروازے سے اندر نہ آیا۔

جب بھی کبھی میری آنکھ لگی دل کی دھک دھک نے اس رات مجھے جگا دیا، اور ہر دفعہ مجھے لگا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو سدا کی طرح اب کے میں دل کی آنکھوں سے ارجن کو یہ خط پڑھتے بھی نہیں دیکھ جا نے اندھیرے میں میرا دم کیوں گھونٹ رہا تھا۔

ابھی سویرا بہت دور تھا جب چندا نے کواڑ دھڑ دھڑا کر کہا، "بہو رانی ذرا کواڑ تو کھولئے"،

میری زبان منہ میں لکڑی کی ہو گئی۔ میں نے پانی کے لئے پکارا بھی تو کسی نے نہیں سنا۔ کواڑ کھولنے میں میرے ہاتھ مانو شریر کا حصہ ہی نہ ہوں، ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔

اوہ بھگوان!

چندا نے پھر کہا "بہو رانی ذرا جلدی!"

"ارے کیا ہو گیا ہے؟" کسی نے میرے دل میں کہا، میں نہ بول سکتی تھی اور نہ ہی مجھ میں اٹھنے کی طاقت رہی۔

جب میں اٹھ ہی نہ پائی تو اس نے کواڑ کے ساتھ منہ لگا کر کہا بابا کہتے ہیں، صندوقی جانے

کہاں گم ہو گیا ہے جانے کون اٹھا لے گیا ہے وہ باہر کمرے میں سوئے تھے۔ پچھلی رات نہانے کے لیے کنوئیں پر گئے ہیں کہ پوجا پاٹ شروع کریں آئے ہیں تو صندوق نہیں تھا۔

میں نے کہا چندا پیسوں کی ضرورت ہے کیا "

ارے نہیں بہورانی یہ بات نہیں" اس کی آواز میں منت تھی۔

میں نے دوار کھولا ہے تو دیکھ کر حیران رہ گئی وہ ننگے پاؤں تھی اس کے سر پر کچھ نہ تھا اور رات کے کپڑوں میں کھڑی کانپ رہی تھی۔

میں نے کہا "صندوق کہاں جا سکتا ہے ؟"

"یہی تو مجھے بھی معلوم نہیں، میں باہر کے کمرے میں ٹھاکر کے لئے پانی لینے آئی ہوں تو بابا نے مجھے بلایا اور کہا کہ صندوق کا پتہ نہیں۔

وہیں زمین پر بیٹھ کر میں نے کہا" ارے اب کیا ہوگا ہمارا سندیس تو ارجن تک پہنچ ہی نہیں سکے گا؟ سائیں سائیں کر کے ویران ہوا میرے دل کے اجاڑ میں چلنے لگی۔

چندا نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا اور کہا۔

"آپ کو پتہ نہیں بہورانی صندوق کے گم ہونے کا مطلب ہے کسی اور آدمی کو بھی گڑھی میں اس بات کی خبر تھی کہ صندوق میں کیا تھا"

"نہیں یوں نہیں ہو سکتا، چندا تم کو پتہ تھا یا چندا کو اور کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔"

"بہورانی عورت کے دل میں کچھ نہیں سماتا، پریم بھی نہیں۔

"میں نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ریکھا تک سے نہیں کیا پتہ کس نے کی ہو گی۔"

مرنالنی کی باتیں اس کی آنسو بھری آنکھیں اور زرد چہرہ یاد آگیا۔

اب کیا ہو گا بھگوان، نندا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا " ٹھاکر مجھے اور چندا کو گڑھی سے نکال دے گا کیا پتہ باپو کو مروا دے، ارے ہم تو تم لوگوں کی وجہ سے لٹ گئے بہورانی" وہ

ٹھاکر اُس ویران گھر میں ہر صبح اٹھتا اور شاخ سے ایک حصّہ توڑ کر لاتا کھڑا ہو کر پہلے مجھے پوچھتا۔

"پدم کیا مجھے بتاؤ گی کہ ارجن سے تمہارا کیا ناطہ ہے"۔

جانے کتنے درختوں کی شاخیں اس نے مجھ پر توڑی ہیں رستے زخموں پر ناسوروں میں گہرے گھاؤ پر جہاں ٹھاکر کا ہاتھ پڑا ہے کھال ادھڑتی چلی گئی ہے مگر مجھے بھی تو اس کے ساتھ اپنے ناطے کا پتہ نہیں تھا میں نے تو اسے ڈھنگ سے دیکھا تک نہ تھا میں اسے کیا کہتی، کیا جواب دیتی۔

ہوتے ہوتے وہ تھک گیا، میرے سامنے زمین پر بیٹھ کر وہ اپنے سفید سر میں راکھ ڈالتا اور کہتا۔ "پدم تم نے یہ مٹی میرے سر میں ڈال دی ہوتی پر جو کچھ کیا ہے وہ تو نہ کیا ہوتا۔

میں نے اتنے سالوں نہ کبھی انکار کیا اور نہ ہی اقرار میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں تھا، ایک نام تھا جس سے میرا ناطہ تھا پر شریر سے تو میرا کوئی ناطہ نہیں رہا اور ٹھاکر کو کسی اور رشتہ کی بات کہاں پتہ چل سکتی تھی، آتما اور انتریہ ساری باتیں تو اس کے لئے بیکار تھیں، ایسے نام جن کا مطلب زمانوں پہلے بیکار ہو چکا ہو میرے کمرے میں اس نے الماری کے نچلے حصّے میں کپڑوں کی تہوں سے ارجن کی تصویریں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔

ان سب کو میرے سامنے اگر آگ لگا دو تو میں اب بھی تمہیں معاف کر دوں۔

دل نے کہا، بس معافی کے لئے اپنے آپ کو سکھی کرنے کے لئے تمہاری سہار کیا یہاں تک ہی تھی؟

میں نے دل کو اپنی سہار کا پتہ نے کے لئے تصویروں کو آگ لگانے سے انکار کر دیا کیوں یہ تصویریں میں نے آنکھوں کی روشنی اور پھولوں کے رنگوں سے ملا کر بنائی ہیں، میں نے ان پر اپنے دل کا خون لگایا ہے۔ بھلا میں انہیں کیوں جلاؤں، میرے انکار نے ٹھاکر کو دیوانہ کر دیا۔

اس کے غم کی سختی اور ہاتھ کی سختی نے مجھے بھی پاگل بنا دیا، میں نے جن حواسوں سے

سسکیاں لیتی ہوئی روتی جاتی تھی اور کانپتی جاتی تھی۔

ٹھاکر تمہیں پوچھے گا نندا تم جاؤ'' میں نے اسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

ارے اب کیا ہوگا پدم رانی کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم درختوں کے جھنڈ میں چھپے کنڈ میں ڈوب مرو یہ تمہارا سنگار وہار یہ باندیاں اور یہ آتما کا روگ۔

مرنے والے کی طرح میں نے اُس ایک گھڑی موت کا چہرہ اپنے سامنے دیکھ لیا۔ دل نے ہنس کر کہا اسی ہمت پر اتنا شور تھا بس ذرا سے شبے پر جی چھوڑ کر مرنے کو تیار ہو گئیں تو پریم کے نام پر آگ میں کود گئے ہیں، بن باس لے کر بھی خوش رہے ہیں تم اس بات پر ہی پریشان ہو گئیں کہ وہ صندوق گم ہو گیا۔ جس میں تمہارے پریتم کے نام تمہارا خط تھا۔ چھی۔

دل کی ہنسی کا جواب میں نے آج تک جی کر دیا ہے، وہ میرے سینے میں ایک بیگانے کی طرح دھڑکتا رہتا ہے پر مجھ سے بات نہیں کرتا، وہ اور میں دو دشمنوں کی طرح ایک ہی نگری میں رہتے ضرور ہیں۔

پھر بادلوں کے پیچھے چھُپے سورج کا پرکاش جو کچھ لایا ہے وہ آج تک میرے پاس ہے ٹھاکر کی زندہ آنکھ خون کے رنگ کی ہو رہی تھی، اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور گھسیٹتا ہوا اندر کوٹھری میں لے گیا۔

بتاؤ ارجن سے تمہارا کیا ناطہ ہے۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی بھگوان کے اور منش کے بیچ کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔

مرنالتی کو کھلے سر اس کے مائکے گھر بھجوا دیا گیا۔ نندا پر اتنی مار پڑی کہ اس کی چیخوں سے ساری گڑھی گونج اٹھی، چندا نے زہر کھا کر اپنی جان دے دی، لال بہادر کو ٹھاکر نے نکال دیا۔

مجھے اپنے لئے سہے ہوئے دکھوں کا کوئی غم نہیں، ارجن کے نام پر میں اپنی بھینٹ چڑھائی ہے مجھے کسی بات کا غم نہیں۔

زبان کو اب تک قابو میں رکھا تھا وہ میرے قابو میں نہ رہے اور زبان کے بندھن جب کھل گئے تو وہ ارجن کو پکارنے میں ہر شے کو بھول گئی۔

میں نے مٹی پر انگلیوں سے ارجن کی تصویر بنا ڈالی۔ میں نے اپنے انگ انگ پر اس لئے اس کا نام لکھا کہ میں تو بس اس ہی کی تھی وہی میرا من موہن تھا وہی میرا بھگوان تھا وہی میرا پرماتما تھا۔

ٹھاکر نے سختی بند کر دی، مجھے ارجن کا نام جپتے دیکھا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا پدم اگر تم کہو تو ارجن آسکتا ہے۔ کیا تم ارجن سے ملنا چاہتی ہو؟"

نہیں میں ارجن کو نہیں جانتی، کون ارجن؟"

ایسے میں ٹھاکر بہت نرمی سے مجھے سمجھاتا ارجن اپنے گرو مہاراج کا بالک وہی ارجن جس کا نام تم جپتی ہو کیا میں اسے بلوا دوں؟

جب سختی اور نرمی کسی سے بھی کام نہ چلا تو ٹھاکر نے مجھے باندیوں کی کوٹھڑیوں میں سے ایک میں قید کر دیا۔ ساری باندیوں کو الگ کر دیا اور نندا کی جوان صورت کو پھر اپنے من میں بسالیا۔

رونق سے بھرا اور دالانوں میں گونجتے گیتوں والا گھر کھنڈر بن گیا۔

پہلے تو کسی کو میرے پاس آنے کی اجازت نہیں تھی، پھر کبھی کبھار کھانا دینے نندا آنے لگی۔ نندا کی ان آنکھوں نے ارجن کو دیکھا تھا۔ اس کی ان آنکھوں نے میرے ارجن کو دیکھا تھا۔

میں نندا کو اپنے دل کے ساتھ لگا لیتی اور اس کی ان آنکھوں کو چوم لیتی۔

ٹھاکر کبھی دکھائی دیتا تو مجھے لگتا اس کے بالوں کی سفیدی اس کے جسم میں گھل گئی ہے اس کی روح میں اتر رہی ہے، تھکے قدموں سے وہ آتا اور کوٹھڑی کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ چپ کھڑا رہتا اور میں زمین پر مٹی میں انگلیوں سے ارجن بناتی۔

جانے کتنے سال بیت گئے۔

مرتے سمے ٹھاکر نے کہا" پدم تم نے کبھی اس بات کو سچ نہیں جانا مگر میں نے صرف تمہیں چاہا تھا، تم بھوک سے تنگ ہو کر دور دیس سے آئی تھی اور میں نے اپنی پیاسی آتما کو تمہارے دم سے رونق دی تھی، تم نے میری لاج اور میرا مان توڑ دیا۔ پدم تمہیں ارجن سے پریم ہو گیا۔

میں نے اس سمے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھے ارجن سے پریم نہیں ہے۔

میرا دل لوٹ رہا تھا۔ ٹھاکر نے پھر کہا" پدم یہ ہمارے دیس کی ہوا ہے ہم عورت سے پریم کرتے ہیں اس کی آتما سے ہمارا کوئی ناطہ نہیں ہوتا مگر میں نے تمہیں کتنے دکھ دیئے ہیں صرف اس لئے کہ میں نے تمہیں خریدا تھا، تمہارا اس دیس سے کوئی تعلق نہ تھا، تم نے ارجن سے ناطہ کیسے جوڑ لیا۔

میں نے نہیں کہا کہ میرا ارجن سے وہ ناطہ نہیں رہا جس کو تم سمجھتے ہو میں نے ٹھاکر کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پدم ارجن میرا بہت پیارا دوست تھا وہ مجھے سارے نگر میں سے اپنا لگتا تھا، اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے اس بات کو میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں، میرا وشواس تم دونوں نے اس میں چوری کی۔

آج سوچتی ہوں مرتے سمے اگر میں ٹھاکر کو بتا دیتی کہ میں نے ارجن کو ایک بار گھونگھٹ کی اوٹ سے بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھا تو اس کا مرنا آسان ہو جاتا مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا، اپنے لمبے سیاہ بالوں کی بجائے ننگے سر اور ابھری رگوں والے ہاتھ کو میں نے نہ جھکایا ہے اور نہ بڑھایا ہے، میں اس کی پدم رانی کا دل توڑ کر بھی زندہ رہی کہ کروا چوتھ کا برت رکھ سکوں جسے میں نے پتی جانا اور مانا تھا۔

ٹھاکر کو مرے ہوئے جب بہت دن ہو گئے تو مرنا لنی کیلئے بھی ٹھاکر کے بیٹے کے دل میں جگہ ہوئی اور وہ اسے وداع کرا لایا کہ نسل ختم نہ ہو جائے۔ بہو کے آنے سے گھر میں پھر چہل پہل

ہوگئی اور میں بڑے گھر سے اس چھوٹے گھر میں چلی آئی رنندا کو بھی چھٹکارا مل گیا میرے جی میں ساری آشائیں مر چکی تھیں، دل نے کہا کیا اب بھی ارجن کو دیکھنے کا بل ہے ؟ ارجن کو دیکھنے کی شکتی ؟

ایک برسات بہت دھوم سے لگی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ایسی بارش کبھی ہوئی ہو گی، آس پاس کا سب علاقہ ڈوب گیا اور لوگ گڑھی میں آسرا ڈھونڈتے ہوئے آئے، مرنالنی نے سب لوگوں کو ماں کی طرح جانا، اب وہی تو گڑھی کی مالکن تھی۔ پھر مجھے اس سارے بکھیڑے سے کوئی ایسا تعلق بھی تو نہ تھا۔

مالا جیتی مورتی پر پھول چڑھاتی میں کسی بھگوان کو ملنے کے لئے کسی بھگوان کے درشنوں کے لئے کسی سورگ کے لئے پوجا نہیں کرتی تھی آخر جینے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بھی تو ضروری ہے نا۔

ایک بڑھیا بڑے گھر میں گلی کے راہ سے مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی

مالکن اس نے کہا" لال بہادر میرا بیٹا تھا میں اس کے لیے تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔

کون لال بہادر۔ اس سے میں نے پوچھا، دنیا میں میں ایک ہی لال بہادر کو جانتی تھی اور اس کا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اب کوئی نہ تھا۔

مالکن میں کہانی کو لمبا نہیں کروں گی، چار لفظوں میں کہوں گی۔ لال بہادر کو معاف کر دیں تو آپ کی مرضی۔

"کہو،، میں مندر کی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

نچلی سیڑھی پر بیٹھ کر بڑھیا نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی، مالکن لال بہادر آپ کا کوئی خط کبھی لے کر ارجن مہاراج تک لے کر نہیں گیا۔ وہ سارے خط میرے پاس رکھے ہیں

مالا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے قدموں میں جا پڑی۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟،، میں نے اس کے ہاتھ کو اتنے زور سے پکڑ کر دبایا کہ وہ

چیخ پڑی۔

ہاں مالکن ہو کیوں نہیں سکتا؟ ایسا ہوا ہے اگر آپ کہیں تو میں وہ صندوق آپ کو لادوں۔"

"کہتی جاؤ۔ اب چپ نہیں ہونا" میں سر پکڑے بیٹھی رہی۔

لال بہادر اور چندا نے گڑھی کو لوٹنے اور ٹھاکر کے سر کو نیچا کرنے کی یہ ایک تجویز کی تھی۔ چندا کا انت آپ سے چھپا نہیں ہے۔ بس اس کا ذہن ایسی ہی باتیں سوچا کرتا تھا۔ لوگوں کو تباہ کرنے کا دونوں باپ بیٹی سوچا کرتے تھے۔ جب ارجن مہاراج یہاں آئے ہیں تو چندا نے آپ کے دل میں ایک خیال سا پیدا کر دیا اور شعلے کو ہوا دینے کا کام وہ دونوں کرتی رہی۔ جب آپ لوگوں نے وہ خط لکھنے شروع کئے تو لال بہادر نے دولت بٹورنے کا طریقہ سمجھ کر اس دھوکے کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ اس کی کیا مجال تھی کہ وہ مہاراج تک سارے خط پہنچا پاتا

"پر وہ تصویر؟" میں نے گھور اندھیارے میں سہارے کی خاطر کہا۔

وہ تصویر لال بہادر اپنے لیے مہاراج سے مانگ کر لایا تھا۔

"او پرماتما"

چھوٹی بہو نے اپنی کسی باندی سے ذکر کر دیا ہوگا اور بات نکل گئی، ٹھاکر کو کسی نے بتا دیا کہ تمہاری لاج یوں بک رہی ہے وہ صندوق جس میں خط اور تحفے تھے وہ صندوق ٹھاکر نے چوری کروا لیا۔ بعد کی باتیں تو آپ کو معلوم ہی ہیں۔

مہاراج ٹھاکر کے مرنے پر   نہیں آئے۔ انہیں تو پتہ چل ہی گیا ہوگا! میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں انہیں تو بہت بعد میں پتہ چلا ہے اور وہ بھی جب ٹھاکر ان کی جان کا لاگو ہو رہا تھا تو لال بہادر نے کسی نہ کسی طرح بنا کچھ بتائے ہی کہا تھا کہ وہ گڑھی نہ آئیں۔

"اب تم جاؤ" میں نے اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔

تو آخر میں پتہ چلا ہے پدم رانی کہ تم تو سدا سے کہیں بھی نہ تھیں، ایک دھرتی سے جب

ذرے کی طرح اڑی ہو تو تمہیں کسی دھرتی نے کبھی سویکار نہیں کیا. جب انت آ گیا ہے تو جان پڑا ہے کہ تم کو کسی نے سویکار ہی نہیں کیا۔

چاند جو میری کھڑکی کے پاس آن کر رکا ہے تو کہتا ہے ستی ساوتری سمے بیت گیا ہے ستونتی سمے بیت گیا ہے۔

میں خالی جیون کے ڈھنڈار گھر میں اب بھی کانپتے ہاتھوں سے دیا جلاتی سنگار کرتی اب ایسا پیڑ ہوں جس میں پھول آئے نہ پھل۔

"اندھیرے میں جھانک کر میں اسے بلاتی ہوں سمے او سمے"

شب انتظار

جس رات کی میں بات کہتے جارہی تھی اس کی صبح مجھ پر زیادہ اور بھائی پر کم مار پڑی تھی ، ماں آتی سردیوں کی گرم دھوپ میں آنگن میں لحاف پھیلائے اس میں ڈورے ڈال رہی تھی ۔ لڑکیاں سیپاروں پر جھکی نانی کا پڑھایا سبق دُہرا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر ایک دوسری سے زیادہ کرخت آوازیں نکال رہی تھیں ، میں تاگے الجھا رہی تھی حالانکہ میں ماں کو سوئی میں لمبا دھاگہ پرو کر دینا چاہتی تھی ۔ پھر تھک کر میں نے جھاڑو کی سینک پر دھاگے باندھے اور بوتل کے ڈھکنوں سے میں اور بھائی ترازو بنانے لگے ، نانی نے بلی ہوں کی تو ہم خوفزدہ ہو گئے ماں نے ڈانٹا کہ ہم جھاڑو برباد کر رہے تھے ۔ ڈر کر ہم سیڑھی پر چڑھ گئے جہاں دیوار کے پار سے ماسے دلادر کا صحن نظر آتا تھا جس میں چڑیاں گوبر کے ڈھیروں سے دانے چن کر اُڑ اُڑ جاتی تھیں اور کتے گھڑی گھڑی بھونکتے تھے ۔ پھر بطخیں ماں برکتے کی طرف سے بڑی محراب والی نالی کے راستے قائیں قائیں کرتی ، چونچیں پانی میں مارتی دھوپ کو دھنکتی سر کو بار بار

ڈبکی دیتیں چھوٹی کشتیوں کی طرح تیرتی ہوئی ادھر آتیں۔ کوے خالی گھر کے دالان میں گھس کر کائیں کائیں شور مچا رہے تھے۔ کیونکہ مامی خورشید اور ماسی شادو کھیتوں پر گئی ہوئی تھیں یہ کپاس کی چنائی کے دن تھے۔

ہم دیوار پر سنبھل سنبھل کر چلتے دوسری سیڑھیوں سے خالی صحن میں اتر گئے۔ کتا زور سے بھونکا بطخیں کراں کراں کرتی ہمارے پیچھے بھاگیں۔ ہم دوڑ کر دالان کے ساتھ بنے ہوئے چھپر تلے چولھوں کی قطار پر چڑھ گئے اور چھپ کر بیٹھ گئے جھانک کر دیکھا تو بطخیں زرد پانی میں کھلی آسمان کی نیلاہٹ اور دھوپ سے پار جا چکی تھیں کوے دالان کو بھول کر منڈیر پر بیٹھے چونچوں سے پروں کو صاف کر رہے تھے اور چپ تھے۔ ہم دونوں بھی اپنے ترازو سے کھیلنے لگے ہم چولھوں میں پڑی راکھ کو تولنے لگے۔

اب کچھ اور رہتے ہیں مجھے یاد آیا شہر میں دکاندار اجلے دہی کو کیسے کھٹا کھٹ برتنوں میں ڈالتے ہیں۔ دیکھنے سے ہی کتنا مزہ آتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے سلگتے اپلوں کا دھواں ذرا ذرا باہر آ رہا تھا کاڑھنی میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ چلو دودھ تولتے ہیں میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ چولہے پر تڑ جھکے ہوئے گلاس سے ہم نے دودھ نکالا۔ میں دکاندار تھی۔ اور آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی بھائی گاہک تھا اور ایک ایک پیسے کا سودا گھڑی گھڑی لے رہا تھا۔ گرم دودھ اس کے حساب میں میں زمین پر ڈال رہی تھی ہم بہت ہی مگن تھے بہت ہی خوش۔ چھوٹی چھوٹی دودھیا ندیاں سی ہمارے چاروں طرف بہہ رہی تھیں۔

"ہائے میں مرگئی"، ماسی شادو کی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا اور ترازو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ شادو نے ماں کو آوازیں دیں۔

"بہن نشانی۔ بہن نشار دیکھ اپنے لاڈلوں کا کام"

ماں کی خوفزدہ آواز سیڑھیوں پر سے آئی۔ نی شادو میرے بچے تو خیریت سے ہیں اور وہ بھاگتی ہوئی دیوار پر سے ڈولتی ہوئی گرنے سے بچتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی پھولے ہوئے سانس سے جیسے اُڑتی ہوئی آئی ہو ماسے دلادر کی طرف آئی۔

یہ دیکھ شادو نے چیختے ہوئے کہا سارا دودھ غارت کر دیا ہے۔

ماں کا دھواں دھواں چہرہ ایک دم چمکا اور وہ چمک اس کے ہاتھوں میں اتری۔ اس نے مجھے گھسیٹا اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ بھائی کو بھی دو چار طمانچے پڑے وہ چیخنے اور زمین پر لوٹنے لگا۔

ماں برکتے ننگے پاؤں دھوتی سنبھالتی اپنے دالان سے آئی اور مجھے پکڑ کر ایک طرف کیا۔

ہوش کر نشا بچے ہی تو ہیں پھر دودھ کو دیکھ کر کہنے لگی اگر سمجھ دار ہوتے تو نقصان کیوں کرتے۔

ماں نے ہانپتے ہوئے کہا شادو کو چیختے سنا تو میں نے سوچا خدانخواستہ بچوں کو کچھ ہو گیا ہو ، مگر اب ان کو نصیحت ہو گئی کبھی پھر ایسا نہیں کریں گے، ماسی تم ہٹ جاؤ آج مجھے اس کی ہڈیاں سینک لینے دو یہ سمجھ والے ہے بڑی ہے دودھ کا حشر کر دیا ہے شادو ٹھیک ہی کہتی ہے اور ماں میری طرف یم لپکی، نانی کی سیڑھیوں پر۔ ہائے ہائے ہمسائے میں ماں فضلاں کی بہو کر ماں کا جھانکتا چہرہ سب آنسوؤں کی جھن اور کانوں کی سائیں سائیں میں گڈمڈ ہو گئے۔

ماں برکتے مجھے اپنے گھر لے آئی، دالان میں بچھی کھاٹ پر بٹھا کر زبردستی گرم دودھ پلایا پھر جب آنسو اور شرمندگی کا زور ذرا کم ہوا تو میرا تپتا ہوا چہرہ ٹھنڈے پانی سے دُھلایا۔ اس کی پوتی مودی نے اپنی گڑیاں اور ان کے پوتے لاکر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ تھوڑی دیر تو میں روٹھی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی پھر رنگ برنگ کپڑوں ننھے منے پوتوں

اور موتیوں کی نتھ پہنے گڑیا نے مجھ پر جادو کر دیا۔ ہم نے لکڑی کے ستونوں کے پیچھے اپنے اپنے گھر سجائے اور جہیز سینے لگے اور پوتے بنانا بہت آسان تھا ذرا سی کتر نوں کو ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر زور سے پھیلاؤ تو ذرا سی بٹ جاتی تھی اور ٹانگوں کے سرے پر ایسے ہی بازو لگا کر ایک گولی سی بنا کر سر لگا دیا جاتا۔ مودی ان کی آنکھیں اور منہ توے کی سیاہی سے بناتی جاتی۔ ہم نے ایک بھیڑ بنا ڈالی حالانکہ مودی کہتی تھی زیادہ پوتے سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا، پھر یہ آپس میں لڑیں گے تو گڑیا مصیبت میں پڑ جائے گی۔ تھک کر ہم نے لق و دق آنگن کے دوسرے سرے تک بطخوں کو بھگایا کچے امرود کھائے، پینگ پر لمبے لمبے جھونٹے لیے۔ دیوار پر چڑھ کر پچھلی طرف سارنگی بجانے والے فقیروں کے گھر جھانکا۔ مودی نے مجھے اپنی گڑیا کے بیاہ کا قصہ سنایا۔ آئندہ وہ گڑیا کی شادی نوری کے گڈے سے کرنے والی تھی۔ کیونکہ شمو کا پہلا گڈا کانا تھا اور اس کا سر ہلتا تھا بارات جو آئی تھی تو باجا بجانے والے لڑکے نہیں تھے وہ گڑیا کے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ کیونکہ مودی نے اتنے میلے گڈے کے ساتھ اپنی گڑیا بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر شمو کی اور اس کی لڑائی ہو گئی تھی دونوں نے ایک دوسرے کے بال نوچے تھے اور بڑا ہنگامہ ہوا تھا دونوں کی ماؤں کو درمیان میں آنا پڑا تھا۔

شام ہو گئی تو گائیں بھینسیں گھر لوٹ آئیں وہ بے صبری سے چارے کی ناندوں میں سر دیئے تھیں اور ان کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹن ٹن بولتی تھیں اور تیز تیز اڑتی اپنے گھروں کو جاتی چڑیاں اور کوے اور تیز اڑتے تھے۔ مودی کی ماں اور ماسیاں کھیتوں سے واپس آ گئیں۔ گھر چمکتے چہروں باتوں اور جوان لڑکیوں سے بھر گیا مودی نے گڑیاں سمیت کر ایک ڈبے میں ڈالیں اور کوٹھڑی میں اناج اور گڑ کی بوریوں کی اوٹ میں چھپا کر رکھ دیں۔

آج نشا کی طرف جانا ہے چرخے تو ٹھیک ہیں نا۔ میرے چرخے کی مال پرانی ہے اور تکلے کو بھی کسی نے ٹیڑھا کر دیا ہے۔ اس نے پھر سر مودی کی طرف دیکھا۔ کیوں مودی تو

نے آج میرے چرخے کو چھیڑا تھا۔

"نہیں ہم دونوں تو آج گڑیا کھیلتی رہی ہیں۔ اس سے پوچھ لو۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

مودی کی ماں نے میرے سر پر پیار کیا۔

پھر وہ آٹا گوندھنے لگ گئی۔ ماں برکتے نے دال کو بگھار لگایا تو مہک سے آنگن بھر گیا ملائی ہٹا کر اس نے دودھ کو بڑی چاٹی میں پلٹا اس کا رنگ پک پک کر ہلکا سرخ ہو رہا تھا یا شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں سورج کی لالی منڈیر پر سے اس میں جھلک رہی تھی تنور میں شعلے اونچے اور روشن تھے۔

رات ہونے سے پہلے مودی اور میں ماں برکتے کے بستر میں گھس گئی۔ وہ کہتی میری ماں کو بڑی کہانیاں آتی ہیں، چڑیا اور کوے کی کہانی تو بہت ہی مزیدار ہے۔

کہانیاں تو میری ماں کو بھی بہت آتی تھیں مگر مجھے یاد آیا کہ صبح میری پٹائی ہو چکی ہے اور ماں مجھ سے سخت خفا تھی گھر سے مجھے لینے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے راج ہنس کی بہت عمدہ کہانی یاد تھی مگر میں نے کچھ نہ کہا اور چڑیا کی کہانی سنتی رہی، سنتی ہی رہی۔

آنکھ کھلی تو میں ماں کے کندھے سے لگی تھی اور میری ناک اس کی موٹی چوٹی سے رگڑ کھاتی تھی بالوں میں سے کھٹی لسی کی مہک اس کی خوشبو سے ملی بڑی میٹھی اور تلخ تھی پھلکاری میں سے ہوا میری ٹانگوں کو لگ رہی تھی، ماسے دلاور کے صحن میں کتے بھونک رہے تھے لڑکیاں بے پرواہ کچر کچر باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔

پھر اناج کی کوٹھیوں کے ساتھ بنے اوسارے پر جب ماں نے اور بچوں کے درمیان مجھے لٹایا تو میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس نے جھک کر میرے ماتھے کو چوما اور میرے گرد رضائی لپیٹ دی، کوٹھڑی آوازوں اور چرخوں

کی گھوں گھوں اور ہنسی کے شور سے دہکی ہوئی تھی۔ تیل کے دیئے جلنے کی بُو۔ مہندی لگے ہاتھوں کے پسینے میں ملی گیتوں کی تانوں میں اڑتی تھی قہقہے چھن چھن بولتے تھے آنکھیں کنگناتی اور چمکتی تھیں۔ ناک کے اکیل مجھے چاند لگ رہے تھے اور ان کی انگلیاں دھاگے پر یوں تیزی سے جمی ہاتھوں کے ساتھ اُٹھ اور گر رہی تھیں۔ جیسے مولے وال کے ٹیلے پر وہ ناچ رہی ہوں۔ عجیب جادو تھا ہلکا نیلا دھواں کوٹھڑی میں بھر گیا تھا اور پھر وہ غبار بن کر میری آنکھوں میں اُتر آیا۔

کسی بچے نے اوسارے پر خواب میں زور سے ٹانگ چلائی جو میرے سر پر لگی اور میری آنکھ کھل گئی۔

آج کرم نہیں آئی نا اس اس کا بہنوئی پچیس سال کے بعد واپس آیا ہے سارے خوش ہیں" کسی نے کہا۔

"جانے والے کبھی لوٹ کر تو نہیں آیا کرتے" ماں کی آواز آئی۔

"تیرا چاچا واپس نہیں آیا نا" مودی کی ماں نے کہا۔

"اب چاچا آ بھی جائے تو کیا فائدہ دادی تو رہی نہیں جسے اس کا انتظار تھا۔ میں کوٹھڑی میں دادی کے ساتھ ہی سویا کرتی تھی۔ سردی میں جب بھی آنکھ کھلتی میں جاگ جاتی تو اسے بیٹھے ہوئے ہی دیکھتی گھٹی گھٹی آواز میں جسے وہ خود ہی سن سکتی تھی کہتی امام علی آوے امام علی۔ ان دنوں میں سوچتی وہ زور سے کیوں نہیں پکارتی کسے بلاتی ہے۔ دم گھٹ کر کیوں روتی ہے کسی سے کچھ کہتی کیوں نہیں دن کے وقت چپ چاپ سائے کی طرح پھرتی رہتی ہے۔ رات کو کیوں جاگتی ہے۔ یہ امام علی کون ہے؟ اس کا کون ہے؟ کیونکہ گھر میں اور کسی کو میں نے یہ نام پکارتے کبھی نہیں سنا۔

بڑے ہو کر دادی کے مرنے کے بعد ہی مجھے پتہ چلا کہ وہ میرا چاچا تھا۔

گاؤں کے سرے پر ایک مسجد ہے دالان در دالان اور مغرب کی طرف حجروں کی

قطاریں، بڑا سا پختہ کنواں جو ڈھاب کے بڑھنے کی وجہ سے تقریباً منہ تک بھرا رہتا، اور مسجد کے باہر کھلی زمین پر سایہ کئے ایک تناور بڑ نے جس کے تنے کے گرد چبوترے پر مسافر آکر دم لیتے اور گرمیوں کی دوپہروں میں لوگ سوتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہیں اور رونق رہتی ہے مگر مسجد میں میرے نانا دو چار شاگردوں کے ساتھ درس دیتے ہیں، پتہ نہیں لوگ زیادہ درس میں شریک کیوں نہیں ہوتے تھے۔ نانا کو کھانا دینے کے بہانے میں اس بڑ کی چھاؤں میں خوب کھیلتی پھر جب چھٹیوں میں ہم شہر سے گاؤں آتے تو ان خالی حجروں گری ہوئی چھتوں تلے چمگادڑوں کے ڈر سے میں صرف جھانک لیتی یا ستونوں کے گرد بازو ڈال کر خوب چک پھیریاں لیتی کبھی محرابوں تلے بیٹھ کر منقش چھت کو تکتی اور لکیروں کو دور تک گنتی چلی جاتی یہاں تک کہ میری نظر گھبرا کر لوٹ آتی، نانا اکثر مراقبے میں ہوتے پھر شمو میں اور مودی کنوئیں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنے اپنے چہرے دیکھتے اور ڈھاب سے کنول نکال کر ان کے ہار پروتے، شام پرندوں کے شور میں ڈوبی ہوتی یہاں تک کہ اذان کی آواز بھی دب جاتی، اندھیرا بڑا ڈراؤنا ہوتا لوگ کہتے تھے یہاں ایک دیو رہتا ہے مگر مسجدوں میں رہنے والے اس سے کیوں ڈریں، لوگ گاؤں کی طرف جانے کے لیے شام کے بعد دوسرے راستے سے جاتے جو ٹھنڈے کنوئیں کی طرف سے ذرا لمبا تھا مگر آباد تھا۔

"امام علی تم کو موٹا پڑھے بنا اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ یہ رویت کا مسئلہ ہے اور اس کا سمجھنا بغیر فضل خداوندی کے محال ہے اور بغیر مطالعہ کے جنون ہے، تم لوگ اکتساب علم کے ساتھ اقتساب فیض کی بھی دعا کیا کرو۔

میرے ذہن میں ایک دم چھت سے ہوا، برسوں پہلے کی بھولی ہوئی وہ بات یاد آئی اپنی ماں کی آواز امام علی آو رے امام علی۔

''اچھا تو یہ ماں کے چاچا ہیں جو نانا کے پاس آ گئے ہیں'' میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی گلیوں میں سے دیوانہ وار دوڑتی ہوئی، لوگوں سے ٹکراتی گلی کے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی۔ کھیتوں سے پلٹتے ہوئے لوگوں کے ہلوں تلے روندے جانے سے بمشکل اپنے آپ کو بچاتی اُڑتی ہوئی، ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی، آس پاس سے گزرتی ماسیاں اور مامیاں مجھے پکارتی ہی رہ گئیں۔

"نشا کی بیٹی کیسے بھاگی جاتی ہے"، سانس میرے سینے میں سما نہیں رہا تھا، باہر کا دروازہ دھڑ سے کھول کر میں جا کر ماں سے لپٹ گئی۔

''ماں ۔ ماں'' اس کے سوا میرے منہ سے اور کچھ نکل نہیں رہا تھا۔

''ارے خیر تو ہے لڑکی کیا ہوا ہے'' ماں نے مجھے لپٹا لیا ''کسی نے مارا ہے کسی شے نے کاٹا ہے۔

''نہیں نہیں'' میں نے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ آئے ہیں''، میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

''ارے کون آئے ہیں بول تو سہی''، ماں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''امام علی تمہارے چاچا امام علی وہ ادھر مسجد میں نانا کے پاس بیٹھے ہیں''

ماں کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا، اس کے ہاتھ میرے بازوؤں سے پھسل کر بیجان سے اس کے پہلو میں گر گئے جیسے اس کے اندر خوشی کا سناٹا ہو گیا ہو، جیسے یہ سب سے بڑا بوجھ ہو جو میں نے اس کے کندھوں پر ایک دم الٹ دیا ہو۔

نانی نے زور سے ہنکارا بھرا ابھی کون آیا ہے، اس نے حقے کی نے منہ سے نکالی ماں ہولے ہولے قدم اٹھاتی نانی کی طرف چلی۔

اب میں سانس سنبھال چکی تھی۔

''وہ امام علی آئے ہیں ماں کے چاچا'' میں نے دور کھڑے ہو کہا۔

"تجھے کس نے کہا ہے کیا بکتی ہے،" نانی نے زور سے کہا۔

"نانا کے پاس مسجد میں بیٹھے ہیں، باتیں کر رہے ہیں امام علی،" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

نانی نے سر دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا" وہ امام علی ہو ہی نہیں سکتا پھر میری طرف مڑ کر کہا "تجھے کیا پتہ ہے امام علی تیری ماں کا چاچا ہے۔ کون یہ قصے کہتا ہے تجھ سے ؟"

ماں کی دادی راتوں کو روتی اور پکارتی نہیں تھی امام علی آ دے امام علی،" میں نے سر اٹھا کر بڑے حوصلے اور دلیری سے ماں کی طرف دیکھا، ماں نے سر جھکا لیا وہ اپلوں کو توڑ رہی تھی تاکہ ان پر دال کی ہنڈیا سج سج پکے۔

نانی نے کہا چل بھاگ یہاں سے جانے کہاں سے اتنی باتیں آ گئی ہیں اسے۔ نشا اسے بٹھا کر کریما یاد کروا یہ سارا دن ٹک کر نہیں بیٹھتی کھیتوں اور باغوں میں گھومتی ہے باتیں سننے اور لڑہ لینے کی عادت اب پڑ گئی تو جائے گی نہیں، چل جا تختی لے کر آ اور لکھ۔

میں مرے مرے قدموں سے اندر گئی کافی دیر کھڑی رہی پھر تختی کو ڈھونڈا اور باہر لا کر اسے ملتانی مٹی سے چمکایا پھر ہل ہل کر اسے سکھاتی رہی کلک سے اس پر الف بے لکھتی رہی مگر سارا وقت میرا جی اس بات میں پڑا تھا کہ آخر امام علی جو ماں کا چاچا تھا کیوں واپس نہیں آ سکتا، وہ آ گیا ہے مسجد میں نانا کے پاس ہے مگر نانی کیوں خفا ہو رہی ہے آخر؟

پھر شام کی نرم ہوائیں کھیتوں پر سے دھان کی خوشبو لائیں ستاروں کے دیے تیزی سے ایک کے بعد ایک جلنے لگے۔ کام سمیٹ کر ماں اور اس کی سہلیاں، ماں بر کتے کی بہوئیں شادو اور اس کی بہنیں ہوے دال کی طرف چلیں۔ جہاں ٹیلوں پر روز شام کو مٹیاروں کا ہجوم ہوتا تھا۔ بوڑھی عورتیں ایک دوسری سے ملتی تھیں اور بہوئیں

کے قصے کہتی تھیں۔

میں نے مودی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے کہا "میں تجھے ایک بات بتاتی ہوں بڑے راز کی، ماں کا چاچا امام علی آگیا ہے اور مسجد میں نانا کے پاس بیٹھا ہے مگر نانی کہتی ہے وہ آہی نہیں سکتا، اور وہ بھوت نہیں تھا نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، وہ باتیں کر رہا تھا اور نانا کے پاؤں چھو رہا تھا۔"

مودی نے کہا ہو سکتا ہے وہ بھوت ہی ہو تمہارے نانا کے پاس سنا ہے جن قابو ہیں۔

میں نے حیرت سے کہا بڑے مزے کی بات ہے نانا کے پاس بھوت آتے ہیں۔

اور کیا میری دادی کہتی ہے مامی خورشید کہتی ہے پھوپھی شادو کہتی ہے سب کو پتہ ہے مودی نے کانپ کر کہا۔

کیا مودی وہ سچ مچ کا امام علی تھا میرے دل میں عجیب پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔

یہاں ٹھہرو میں اپنی دادی سے پوچھ کر آتی ہوں وہ ٹیلے پر ناچتی ہوئی عورتوں کے گھیرے سے پرے دوسرے گھیرے کی طرف چلی گئی۔

تاروں کی مدھم روشنی میں گیت اور پاؤں کے لہریئے غبار کی طرح مولے وال کی پتی پر گھوم رہے تھے اور مودی کی چھوٹی سی ڈری ڈری دادی کو پکارتی آواز اسی میلے میں گم ہوتی لگتی تھی۔

میں نے تھوڑی دیر مودی کا انتظار کیا اور پھر دوسری پتی کی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹولی میں رل مل کر گیت گانے کی کوشش کرنے لگی۔ گانے کے بول مجھے نہیں آتے تھے مگر جو مجھے اپنی جھنکاروں کی وجہ سے اچھے لگتے تھے، میٹھے رسیلے جیسے گنے کا رس ہو، جو ہاتھوں میں اور منہ پر لگ جاتا ہے جس کی بو خواب کی طرح ہوتی ہے بھلائے نہیں بھولتی ساتھ ساتھ چلتی ہے یا پکتے گڑ کی مہک کی طرح دل میں اتر جاتی ہے اور

جان کو مٹھاس سے بھر دیتی ہے۔

واپس جاتے ہوئے عورتیں ماں سے پوچھ رہی تھیں "نشا تیرا چاچا امام علی سنا ہے آگیا ہے اور مسجد میں ہے۔"

اگر چاچا ہوتا تو گھر پیغام آتا" ماں نے ہولے سے کہا۔

میں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی جب امام علی گیا تھا" ماں بڑ کتے نے کہا تو تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی نشا۔"

اندھیرے اور بھیر اور غبار میں جو ستاروں کی روشنی میں گم دھندلا تھا میں نے ماں کی طرف دیکھا جو بہت دکھی لگ رہی تھی اس کے قدم آہستہ اُٹھ رہے تھے اور وہ باتوں کے شور میں گم سم ہوگئی تھی، ماں کو اپنی دادی کا گھٹی گھٹی آواز میں رونا اور پکارنا اور امام علی آوے امام علی کہنا یاد آرہا ہوگا۔ آدمی اکثر کسی قصور کے بنا بھی بہت دکھی ہو جاتا ہے بہت ہی دکھی۔

"ماں نانا کے پاس جن قابو ہیں" کریما کا سبق سنا کر میں نے پوچھا۔

تجھے کون یہ سب سناتا ہے تیری نانی ٹھیک ہی کہتی ہیں سارا دن کھیتوں اور باغوں میں گھومتی اور بڑ تلے اکیلی کھیلتی ہے۔ یہ کیا قصّے۔ تو نے بنا رکھے ہیں، ماں خفا نہ تھی مگر خفا لگتی تھی۔

پھر وہ امام علی جو نانا کے پاس آئے کون تھے کیا جن تھے تیرے چاچا نہ تھے جن کے لیے روتے روتے تیری دادی مرگئی۔"

"کس نے تجھ سے یہ سب کہا" ماں نے میرے کندھے پکڑ کر مجھے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اس رات جب تم سب چرخے کات رہی تھیں اور سارے میں بچے سو رہے تھے تو میں جاگ رہی تھی، میں نے تمہاری سب باتیں سن لی تھیں۔"

ماں نے ماتھے پہ ہاتھ مار کر کہا تو تم نے میری بات سن لی تھی پھر سوچ سوچ کر کہنے لگی پتہ تو مجھے بھی ٹھیک سے نہیں کہ کیا ہوا مگر سنا ہے کہ ہمارے نانا اپنے چھوٹے بھائی سے کسی بات پہ ناراض ہو گئے تھے اور انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ کہا تھا اس گھر میں اب کبھی نہ آنا۔ اور چاچا نہیں آئے

"کہیں تو ہوں گے وہ کبھی تو واپس آسکتے ہیں" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں منی کبھی نہیں جو ایک بار لکیر سے نکل گیا وہ بس گیا پھر وہ واپس نہیں آسکتا"

ماں مجھ سے زیادہ اپنے سے بات کر رہی تھی۔

"ہمارے نانا بہت غصے ور اور بات کے پکے ہیں اور یہ سب امام علی چاچا بھی جانتے ہوں گے ان کے واپس آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا" پھر وہ کہیں تو ہوں گے" میں نے پھر ہٹ دھرمی سے کہا۔

ماں نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ دادی انہیں پکارتی ہوئی مر گئی، روتی روتی چلی گئی، سانس بند کر کے وہ گھٹی ہوئی آوازیں دیتی جو اس کے سوا کوئی سن نہ سکتا، اب تو لوگ سب بھول گئے ہیں۔ اس گھر میں کوئی یہ نام نہیں لیتا کسی دن نانا کے سامنے یہ نام نہ لے دینا۔

تمہارے چچا نے کیا کیا تھا ماں جو انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ میں نے ماں کے گلے میں جھولتے ہوئے کہا،

اس کا نصیب ہی ایسا تھا کہ وہ گاؤں کا سب سے سجیلا آدمی سب سے جوان اور باہمت آدمی اس میں سما نہیں سکا۔ کبھی جگہیں سکڑ جاتی ہیں اور آدمی بڑا ہو جاتا ہے۔ پر تو اپنے سبق میں دھیان لگا بھولی گزری باتوں کی لوہ لگانے کا فائدہ۔ لوہ لگانے والے کو تیرے نانا اچھا نہیں سمجھتے"

عجیب تھے نانا بھی مگر میں نے ماں سے کچھ نہ کہا اور کریما یاد کرنے لگی۔

شہر کی اس بستی میں پانی بھرنے پر موہن سنگھ نوکر تھا پرانی بستیوں سے دور اور کارخانوں کے قریب دس بارہ گھر تھے اور درمیان میں بنے پکے کنوئیں کے ساتھ کوٹھڑی میں موہن سنگھ سارا وقت گنگناتا اور اپنی دکنی بولی میں کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ محنتی اور نرم خو مضبوط کندھوں پر بڑی بڑی بالٹیاں لٹکائے وہ ساری بہوؤں اور بوڑھیوں کے دکھ سکھ میں بھی شریک رہتا ہر ڈیوڑھی میں اس کے جوتے کی چرچر سنی جاتی۔

جن سردیوں کی یہ بات ہے اس سال موہن سنگھ کے کنوئیں کی جگت پر انوکھی سی رسیلی آواز چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔

"کون ہے وہ تیری"، بڑی بوڑھیوں نے اور یہاں تک کہ کسی بات کی بھی ٹوہ نہ لینے والی ماں نے موہن سنگھ سے پوچھا۔

"میری کون ہوتی جانے کہاں سے آئی ہے بس ایک دن آن کر بیٹھ گئی جگت پر ہی سوتی ہے اور سارا وقت بھجن گاتی ہے۔ کہتی ہے میرا اس جگ میں کوئی نہیں اور میرا جی نہیں پڑتا کہ اسے دھکا دوں۔

اسے کہیں کسی گھر میں نوکر رکھوا دو" جیوتی بہو نے کہا۔

نہیں بہو ماں میرا اس پر اب اتنا زور بھی نہیں کہ میں اسے نوکری کرنے کا کہوں اور وہ کرلے اپنا کھاتی ہے اور دھرتی تو بھگوان کی ہے کیا وہ پاگل ہے"، بھابی نے پھر پوچھا۔

کانوں کی لوئیں چھو کر موہن سنگھ نے کہا" وہ باتیں ہی کب کرتی ہے کہ اس سے کچھ پوچھوں ہاں آواز کوئل کی سی ہے وہ تو آپ نے سنی ہو گی جو کچھ کہتی ہے تو کہتی ہے میں اپنے مرلی منوہر کو کھوجتی ہوں کنہیا مجھے چھوڑ گئے جانے کہاں نکل گئے" اس کی بڑی بڑی آنکھیں جانے کیا کھوجتی ہیں کیا دیکھتی ہیں وہ پاگل نہیں ہے، پاگل نہیں ہے"

جب میں نے اسے دیکھا تو سفید بالوں کے باوجود وہ نہایت خوبصورت تھی مگر اس کے جسم میں سے لگتا تھا آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں، شعلوں سے بنی ہوئی لگتی تھی، نازک سے

ہاتھ رنگ میں ڈوبے سفید پاؤں وہ ایسی تصویر تھی جس پر سے وقت گزر گیا۔ پھر اس نے ہماری باہری چوکھٹ پر آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ رنگوں سے لکیریں کھینچتی ان کو مٹاتی اور بناتی رہتی مگر پاگل وہ نہیں تھی، کبھی گھر کے اندر چلی آتی ہر طرف دیکھتی آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہتی اور پھر آپ ہی آپ باہر نکل جاتی۔ ہم اس کے یوں آنے اور چلے جانے اور بیٹھے رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

برسات اُس سال بہت گھن گرج سے آئی تھی طوفان اور جھکی ہوئی سیاہ گھٹائیں جو گھروں کے اندر گھسی چلی آتیں گاؤں کی طرف جانے والے سارے راستے بند ہو گئے اور ماں بولائی بولائی پھرتی۔ اب کیا ہوگا، ارے ان دو بوڑھے آدمیوں کا کیا ہوگا جن کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ماں بادلوں کو دیکھ کر ہاتھ ملتی۔

"ماں اگر چاچا امام علی ہوتے تو نانا کا کوئی تو ہوتا انہوں نے یونہی انہیں گھر سے نکال دیا،" میں نے ایک دن بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

تجھے کیا پتہ لڑکی عزت کی خاطر اصولوں کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے یہ محبت کی ایک انتہا ہوتی ہے کہ آدمی بھول نہیں سکتا، معاف نہیں کر سکتا بھلا نہیں سکتا،" ماں بہت ہی دکھی ہو گئی تھی اور میں نے سوچا اب میں ہرگز چاچا امام علی کا نام نہیں لوں گی۔ مگر ایسی برسات میں کون مسجد تک ان کا کھانا لے کر جاتا ہوگا۔

کوئی ہو تو سہارا رہتا ہے یہ سوچتے ہوئے یونہی میں نے باہر کا دروازہ کھولا تو دروازے کے ساتھ لپٹی بیل کی طرح وہ کنہیا کی رادھا کواڑ کے ساتھ ساتھ اندر جھک گئی۔

آؤ رادھے آؤ کئی دنوں سے تم دکھائی نہیں پڑیں۔

برسات میں کون گیت گا سکتا ہے بی بی دم گھونٹنے والا وقت ہوتا ہے گاؤں کے راستے بند ہو جاتے ہیں کہیں کوئی آجا نہیں سکتا۔ سانس مشکل سے آتا جاتا ہے۔

"تمہارا کون سا گاؤں ہے؟" میں نے فرش پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تھا ایک جو میرا ہو سکتا تھا مگر نہیں ہوا" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکا تمہارا عجیب بات کہتی ہو گاؤں میں جا کر رہو تو گاؤں اپنا ہو ورنہ نہیں،، میں نے جوش سے کہا۔

میرا جی چاہتا تھا وہ مجھ سے باتیں کرے مجھے بتائے وہ کون تھی اور ایسی بہت باتیں جو کہانیوں کی طرح اس کے گرد پھیلی تھیں۔ نانی نے ٹھیک کہا تھا ٹوہ لینے کی میری عادت اب پکی ہو گئی تھی۔

گاؤں نے مجھے قبول ہی نہیں کیا، باہر پھینک دیا جیسے میں کوڑے کا ڈھیر تھی۔ اور اس میں کسی کا بھی کوئی قصور نہ تھا نہ اس کا اور نہ میرا،، اس نے اپنے رنگے ہوئے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"وہ دوسرا کون تھا" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"دوسرا وہی جو دوسرا نہیں تھا، جو کبھی دوسرا نہیں تھا" اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ سیندور کی دھار بالوں میں گہری تھی۔

ماں نے پوچھا "یہ یوں کیوں بیٹھی ہے"؟

کہتی ہے اس کا کوئی گاؤں تھا، پتہ نہیں کون گاؤں تھا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بی بی جب گاؤں نے مجھے پھیر ہی دیا تو اس کا کیا نام ہوگا دنیا کا کوئی کونا" اس نے سر اٹھایا تو آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں وہ جانے کے لیے اٹھی۔

"بیٹھو رادھا" ماں نے کہا "چلو اور باتیں کریں۔"

وہ ہنسی تو اس کے دانتوں کی لڑیاں چمکیں باریک گلابی ہونٹ ہنسے سارا چہرہ ایک دم کھلا جیسے چاندنی میں شبنم بھرا پھول۔

بھلا کیا باتیں کرو گی؟ کیا کوئی بات مجھے خوش کر سکتی ہے وہ زندگی لوٹا سکتی ہے؟ جب وہ دن پھیرے نہیں جا سکتے تو بے فکری کے اس کے ساتھ گزارے دن تو پہ ماتما بھی

نہیں لوٹا سکتا نہیں ہر ماتما نہیں سمجھیں، اور اس نے ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کے گرد گھیرا باندھ لیا جیسے سخت غصّے میں ہو اور لڑنے کی تیاری کر رہی ہو۔

"صرف تم ہی دکھیا نہیں ہو رادھا دُنیا میں اور لوگ بھی ہیں پریشان اور غموں میں ڈوبے" ماں نے کہا۔

پھر ہم تینوں نے طوفان کی گرج کو سنا، ہوا اپنی بھیگی اوڑھنی کو جھٹکاتی تیزی سے اندر آئی اور سب کو گیلا کر گئی۔

"میں چلوں گی"، رادھا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایسے میں تو کوئی کسی دشمن کو بھی گھر سے جانے کا نہیں کہتا، طوفان غصہ ور دیو کی طرح پھنکار رہا ہے۔ موہن سنگھ کے کنوئیں تک جاتے جاتے کہیں تم اُڑ ہی نہ جاؤ اتنی دھان پان ہو تم"

رادھا منہ کھولے آنکھیں کھولے حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی اور لگتا تھا سانس اس کے گلے میں اٹک جائے گی پھر وہ دھم سے فرش پر یوں بیٹھی جیسے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانا چاہتی ہو۔

"تم کون ہو" اس نے ماں سے پوچھا، اور موہن سنگھ کہتا تھا وہ پاگل نہ تھی، وہ کیا تھی کیوں اتنی بے چین تھی۔ پھر اس نے اپنے بالوں پر سے پلو کو کھینچ کر ہٹایا، یہ دیکھتی ہو یہ سہاگ رنگ میں اب بھی اس کی راہ دیکھتی ہوں پتہ نہیں اسے میں یاد ہوں کہ نہیں کر تیں مگر مجھے لمحہ لمحہ رتی رتی سب یاد ہے، اس کی نگاہوں کے لہریئے اس کی سجیلی آواز وردی میں اس کا دمکتا ہوا چہرہ چنچل سنسوڑ مدھ بھری آنکھوں والا۔ میں اس سے ملنے سے پہلے چھپا تھی بے فکر آزاد بابو کی پان کی دکان کو چلانے والی سگریٹ کی پنی میں لپیٹ کر جب پہلے پہل میں نے پان اسے دیا تو وہ ہنسا تھا اور مجھے اچھا لگا تھا۔

یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ماں نے کچھ کہنے کے لیے کہا۔

"ارے یہ بُری بات نہ تھی،" وہ بہت خفا ہوگئی، "کوئی کسی کے جی کو اچھا لگے تو بہت بُرا ہوتا ہے بی بی اچھا لگنا بہت برا ہوتا ہے۔ مگر اس میں اس کا کیا دوش تھا۔

میں نے اس سے کہا تھا تم روز آیا کرو تم مجھے اچھے لگتے ہو۔" پھر اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا میں پاگلوں کی طرح ہر آنے والے کی طرف دیکھتی میرا رنگ زرد ہوگیا ایک آگ تھی جس سے میرے دن اور رات جلتے تھے میں باتیں بھولنے لگی گاہکوں کی بات دھیان سے نہ سنتی۔ جیسے میرا سارا جسم چتا بن گیا ہو۔ نیند اور بھوک مجھ سے بھاگ گئیں میرے ماں نہیں تھی، گھر پر میرے اور باپو کے سوا کوئی نہ تھا، میرا سننے والا کوئی نہ تھا کس سے اپنا دکھ کہتی۔ ہائے میں تو کہیں کی نہ رہی تھی کچھ کر نہ سکتی تھی۔

پھر ایک دن میں نے اسے دیکھا میں نے کہا میں تمہارے ساتھ جاؤں گی، میرا من تمہارے بنا نہیں لگتا میرا من کہیں بھی نہیں لگتا، تم مجھے نہیں لے گئے تو میں جان دے دوں گی تمہیں نہیں دیکھتی تو جیوں گی کیسے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

اس نے کہا رادھا تمہارے اور میرے درمیان یہ سب اتنا آسان نہیں میرے بھائی ہیں ماں ہے اور بہت سی گھاٹیاں ہیں اڑچنیں ہیں تم میرا پیچھا مت کرو سکھی رہو گی وقت تمہاری مدد کرے گا مجھے بھول جاؤ گی کوئی کسی کو ایک سی شدت سے نہیں چاہا کرتا، تم میری زندگی میں مت آؤ، کوشش کرو اور بھول جاؤ اسی میں سُکھ ہے۔

مجھے سکھ نہیں چاہیئے تھا، مجھے سُکھ کی کب تلاش تھی میں تو بس اسے دیکھتے رہنا چاہتی تھی اس کے قدموں کی دھول بن کر جینا چاہتی تھی۔

"رادھا مجھے بھی تو جینے کا حق ہے اور تمہارے ساتھ زندگی ناممکن ہے بہت ہی ناممکن"، اس نے کہا تھا مگر میں اس کے پاؤں سے لپٹی رہی۔ میں سمجھنے اور سوچنے کی منزلوں سے آگے نکل گئی تھی۔ مجھے اس جلن سے بچنا تھا جو اس کے بنا میرے جی کو لپیٹ لیتی تھی میں اس کے پیچھے چلی آئی ہائے اب یاد آتا ہے وہ کتنا دکھی تھا مگر میں تو دیوانی تھی میں نے

اسے دیکھا ہی کب تھا میرا اپنا آپ ہی میرے لیے سب کچھ تھا۔

راستے میں اس نے مجھے ایک چادر خرید کر دی اور مسجد میں لے گیا۔ پھر ہم اسٹیشن آئے اور گاڑی میں بٹھا کر وہ بولا یا بولا یا بڑا گھبرایا ہوا سا جیسے ڈھے گیا ہو، پلیٹ فارم پر پھرتا رہا۔ اور اس گھڑی خوف سے کانپ رہی تھی ہائے میں نے اسے کتنا دکھی کر دیا ہے۔ گاؤں کا راستہ لمبا تھا وہ خیالوں میں گم تھا نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا نہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا، پتہ نہیں وہ کتنا خفا تھا جانے وہ کیوں اتنا خفا تھا۔

جب ہم نہر کے ساتھ سے گاؤں کی طرف اُترے ہیں تو پہلی بار اس نے کہا رادھا اب تم میری بیوی ہو، میری عزت ہو اس چادر کو اچھی طرح لپیٹ لو تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی سارے سوالوں کے جواب میں دوں گا تم چپ رہو گی مگر گھبرانا نہیں میں نمٹ لوں گا میں تمہارے ساتھ ہوں مصیبتیں آئیں گی تو خود ہی لوٹ جائیں گی۔"

میرے جی کو بہت ڈھارس ہوئی وہ کتنا نرم مزاج تھا اور اجنبی ہونے پر بھی مجھے تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا دل ٹھہرے ہوئے پانی پر تیرتے کنول کی طرح ہو گیا کھلا ہوا اور دھوپ میں ڈولتا ہوا پیار کے سمندروں پر بہتا ہوا۔

گاؤں کے جس آنگن میں مجھے لے جایا گیا وہ خوب بڑا تھا گھر میں ساس اور بہو کے سوا کوئی نہ تھا۔ ساس نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بٹھایا تو میرے بیٹے کے لیے آئی ہے نا مجھے سدا پیاری رہے گی، مگر دیکھ ابھی باہر مت نکلنا کسی سے کچھ مت کہنا جو بہوئیں اور بیٹیاں تم سے ملنے آئیں ان سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔ پھر اس نے مجھے گہنے لا کر پہنائے، ساڑھی اتروا کر گھاگرا پہنایا بالوں میں سونے کے پھول پروئے ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ میں چمپا سے رادھا اور رادھا سے دلہن بن گئی۔

وہ دس دن جو میں نے اس گھر میں کاٹے میری زندگی کے درخت پہ پھول ہیں ساس مجھے کتنا چاہتی تھی۔ اس گاؤں کی بہوئیں مجھے کتنا چاہتی تھیں اور وہ مجھ سے بندھا تھا

میں اس کی حفاظت میں تھی اپنا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھ کر میں کتنی سکھی ہوگئی تھی ہلکی اور خوشی میں مکمل۔ ہائے وہ چاہتوں سے بھرا گھر خواب میں بنے محل کی طرح آنکھ کھلنے پر مجھ سے چھن گیا، جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا وہ اسے اور مجھے سپاہیوں کے گھیرے میں شہر لے آئے، باپو نے میرے آگے ہاتھ جوڑے میرے پاؤں پر پگڑی رکھی انجانے لوگوں نے مجھے سمجھایا، مگر عدالت میں میں نے بیان دیا کہ وہ مجھے اچھا لگتا تھا میں اس کی بیوی تھی باپو سے میرا کوئی ناتہ نہ تھا میں اس گھر کی بہو تھی اور خوش تھی، میں خود اس کے پیچھے گئی تھی میں اس کے بنا جی نہیں سکتی تھی، مگر میرے اس بیان سے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست دنگا ہوا کئی لوگ مارے گئے کئی جگہ آگ لگی پوری زندگی الٹ پلٹ ہوگئی۔

میں جو ایک معمولی بنواڑن تھی کہانیوں کی راجکماری بن گئی۔

مقدمہ چلا اور اسے سزا ہوگئی۔ مجھے ایک دھرم شالہ میں رہنے کے لیے بھجوایا گیا مگر میں وہاں سے بھاگ آئی، جیل کے گرد اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں نے چکر لگائے، دروازوں کے ساتھ سر کو ٹکرایا، میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا ان دنوں میں پہ سچ مچ دیوانی ہوگئی اور پھر میں گاؤں گئی۔

ایسی ہی برسات تھی ایسے ہی دن تھے سارے راستے بند تھے۔ مجھے اس آنگن تک پہنچنا تھا جس میں اس کے پیچھے چاہت ہی چاہت ملی تھی اس کواڑ کو پکڑ کر میں بھکارن کی طرح کھڑی رہی کھڑی ہی رہی۔ اس کی ماں نے میری طرف دیکھا تک نہیں جیسے میں وہاں تھی ہی نہیں میرا اس گھر سے کیا ناطہ تھا؟

بارش میں بھیگتے دیکھ کر اس کی بھابی نے کہا جو تو نے کرنا تھا سو کر دیا یہ گھر برباد ہوگیا، وہ اب کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آسکتا بھلا تو کیوں اپنا وقت برباد کر رہی ہے جہاں سے آئی ہے وہیں لوٹ جا۔ اس گاؤں میں جب اس کے لیے جگہ نہیں تو تو

کہاں رہ سکتی ہے، وہ شام میری زندگی کی آخری شام تھی جب میں نے بادلوں کی سرخی میں اس آنگن سے اُٹھتا اپلوں کا نیلا دھواں دیکھا اور چڑیوں کو اولوں کی طرح برس کر بیٹھتے اور ہوا کے جھونکوں کی طرح اٹھتے دیکھا، وہی ایک آنگن جو میرا دل تھا وہ ایک آنگن بھرا اندھیرے میں ڈوب گیا اور میں گم ہو گئی گم ہی ہو گئی۔

جب وہ جیل سے چھٹا ہے تو جانے کہاں گیا، میں نے ساری عمر ایک ایک چہرے کو تکتے گزاری ہے غور سے دیکھتے اسے کھوجتے مگر وہ تو دنیا کی بھیڑ میں رل مل گیا مجھے کہیں دکھائی نہیں پڑا۔

اور میں پنوارٹن چمپا رہی نہ اس کی رادھا نہ ساس کی پیاری میں کون ہوں بھلا میں کون ہوں؟ اس نے چوڑیوں سے بھری اپنی باہنوں کو پھیلایا اور چاروں طرف دیکھا،

ماں نے اٹھ کر رادھا کے گلے میں باہنیں ڈال دیں اور دونوں چیخ چیخ کر رونے لگیں تھیں۔

گاؤں سے جو پہلی خبر آئی وہ ایسی برسات میں مکمل تباہی کی تھی، نانا کا مکان ڈھے گیا تھا نانی مامے دلاور کے گھر میں تھیں نانا مسجد میں بیمار تھے ماں تڑپ تڑپ کر روئی اور جب راہ ذرا خشک ہوئے پانی اُترا تو ہم گاؤں آئے

ہر طرف ویرانی اور اداسی تھی لوگ اپنے گھر بڑے ان منے دل سے اٹھا رہے تھے اور تھکے ہوئے ہارے ہوئے لگتے تھے، نانا کا گھر بنانے والا کوئی نہ تھا، ماں مٹی کے ڈھیروں کے پاس کھڑی آنسو بہاتی رہی، نانی نے کہا "نشا مقدر سے کون لڑ سکتا ہے مگر کوئی صورت نکل آئے گی پریشان نہ ہو۔ مامے دلاور کا گھر مجھے پرایا پرایا سا لگا گھٹا گھٹا سا میں سونے کے لیے مودی کی طرف چلی گئی جہاں رات میں نے انہیں چاچا امام علی کی بیوی کی باتیں بتائیں، ماں برکتے اور مودی کی ماں بھی ہمارے پاس بیٹھی رہیں۔

بڑی بد قسمت لڑکی تھی وہ ساری زندگی اس پرچھائیں کے لیے گزار دی۔ مانگ میں رنگ سجائے پھرتی ہے اور اُس کی راہ دیکھتی ہے۔ جو کبھی اس کی راہوں سے نہیں گزرے گا۔
مگر آخر وہ کیوں نہیں آسکتا میری ماں کا چاچا امام علی؟" میں نے بڑے دکھ سے پوچھا۔
تمہارے نانا کا مزاج بالکل دوسرا ہے وہ قرآن پاک تو سمجھ سکتے ہیں مگر دل کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ امام علیؔ بڑے دل گردے کا جوان تھا اس لڑکی کی بات پر اس نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ مقدمے کے بعد تمہارے نانا نے اسے گھر آنے سے منع کر دیا۔ جانے اب کہاں ہوگا۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں نہ کہیں تو ہوگا ہی" ماں بڑے بڑے افسوس سے یہ سب کہہ رہی تھی ہم چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ گلی میں ہل لے کر جاتے لوگوں کے قدموں کی چاپیں ابھریں پھر مرغ اذانیں دینے لگے چڑیاں چوں چوں کر کے درختوں پر جاگیں، کتے بھونکے اور سویرا ہونے لگا۔
پتہ نہیں دل کی بات کبھی کسی کی سمجھ میں آتی بھی ہے کہ نہیں اور مقدر بنانے والا جانے کیا بناتا اور کیوں بناتا ہے۔ دیوانگی اور فرزانگی میں کیا باریک فرق ہے۔ نانا ان باتوں کا جواب دے سکتے ہیں وہ مسائل کا حل جانتے ہیں مگر دل کی بات کیا سمجھیں گے کیا جانیں گے؟

ترموتی

وہ عجیب ٹھہری ہوئی سی شام تھی جب میں اور مونیک پچھواڑے باغ میں سے ٹوٹی ہوئی باڑ کے راستے اندر آئیں، ہنواری دادا پڑانے کنوئیں کی جگت پر بیٹھے تھے۔ جب بھی رجنی دادی برت رکھیں گھر میں کوئی پوجا ہو، کوئی تیوہار ہو وہ اسی جگہ الگ تھلگ آن بیٹھتے ہیں کہتے ہیں میرا جی الجھتا ہے مجھے بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگتی رنگ اور پکوان کی باس اور چمکتے کپڑے میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں، مگر مجھے معلوم ہے دادا کو کسی دیوی دیوتا پر وشواس نہیں بڑے پکے ناستک ہیں۔ رجنی دادی کی اور ان کی جھڑپ بس اس بات پر ہوتی ہے۔

"اے بھگوان تجھے اب ایشور سے کیا لینا ہے جو تو اتنے پریم سے اس کے لئے ہلکان ہوتی رہتی ہے۔" وہ اپنی پرانی گڑگڑی لے کر اونچے دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں "جب سنو برت جب دیکھو پوجا آرتی اُتاری جا رہی ہے پھول چڑھائے جا رہے کیا لینا ہے تجھے اس سے؟"

"رام رام" دادی کانوں کو ہاتھ لگاکر کہتی ہیں۔" کیسی باتیں کرتے ہو تم تو ناستک ہو
ناستک اس سے ڈرتے بھی نہیں۔"

"میں اور ناستک" وہ بے آواز سا قہقہہ لگاتے ہیں۔" اری بھاگوان میں اور ناستک
اری مجھ سے زیادہ کون اُس سے پریم کرسکتا ہے مگر میں اس سے ڈرتا نہیں مجھے اس پر
وشواس ہے۔ تم تو بس اس کی خوشامد درآمد میں لگی رہتی ہو۔ ڈرتی کانپتی پرچھائیں سے خوف
کھاتی ہو۔ پر تمہیں یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہونا ہے ہو کر رہتا ہے کیا تو ہوا سے لڑ
سکتی ہے کیا تو اپنی پوجا اور برت سے ہونی کو ٹال سکتی ہے۔

ایسی باتیں شاگرد پیشے کے دالانوں میں اکثر سنی جاتی ہیں اور اس لیے جب میں نے
داداکو وہاں بیٹھے دیکھا تو رک کر کہا۔" آج کون برت ہے بھلا؟"

دادا نے اپنی گڑگڑی پر سے چلم اتار کر ہاتھ میں لی اور انگاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"بیٹا ہونی ہوکر رہتی ہے تیری دادی بیکار پوجا میں لگی ہے۔

"کیا ہوا ہے آخر" میں نے اچک کر داداکے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے ساوتری پوجا ہونے والی ہے۔" اور پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگے" بیٹا
اب میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں ان بوڑھی چُندھی آنکھوں نے اتنا بہت کچھ دیکھا ہے کہ جینے
سے ڈر لگنے لگا ہے اب اور ہمت نہیں رہی۔"

"مگر دادا تمہارا کیا جاتا ہے۔" میں نے شرارت سے کہا۔

تم بھی یہ کہتی ہوا چلا مگر تم بھی یہ باتیں سمجھ نہ پاؤگی جاؤ اپنی سکھی کی خاطرداریاں
کرو۔" انہوں نے مونیک کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر چلم کو کریدا اس میں زور سے پھونک ماری
اسے گڑگڑی پر جمایا اور تمباکو کے دھوئیں میں گم ہوگئے۔

مونیک نے نالی پھلانگتے ہوئے کہا۔" یہ تمہارے دادا ہیں کیا؟"
ایک طرح سے تو ہیں جانے کون کون ان کی گودوں میں کھیلا ہے کس کس کو انہوں

نے کھلایا ہے سارے بڑے بوڑھے جن کی کمریں جھک گئی ہیں اور آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے ان کے سامنے کے بچے ہیں، سبھی ان کا بہت مان کرتے ہیں کسی کو ڈانٹ دیں کسی کو کچھ ہی کہہ دیں کوئی برا نہیں مانتا۔ کہتے ہیں کبھی ان کا بھرا پُرا کنبہ تھا۔ کھیت کھلیان بڑی گھر داری پھر جانے کیسے سب ختم ہو گیا کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔ اب دادا دادی یہاں رہتے ہیں۔ شاگرد چیلے کے برابر میں لڑکے بالے سب ان کے گرد جمع رہتے ہیں اور ایک طرح سے تو یہ سب طرف پھیلے ہیں۔

مونیک اور میں اب بہت دھیان سے چل رہے تھے اُس پگڈنڈی کو کھوجتے جو پرانی گھاس سے اٹی گہرے اندھیروں میں سانپ کی طرح لیٹی ہے اور چرمراتے پتوں تلے ہولے ہولے سانس لیتی ہے لوٹ پوٹ کر کبھی سر نکالتی ہے اور کبھی آنکھ مچولی کھیلتی چھُپ کر دم سادھ لیتی ہے۔

اس باغ کی دیکھ بھال کی اب کسی کو فرصت نہیں، پیڑ کبھی پھلوں سے لدے ہوئے ہوں گے مگر اب وہ اپنے پرانے دنوں کے گہرے سبز پتوں کے ساتھ بس ٹھہرے ہوئے ہیں اور برکھا کے دنوں میں بھولی بسری یاد کی طرح کبھی کوئل کو ہو کو ہو بولتی ہے اور پانی پڑتا ہے تو شاخیں ٹپکتی چرچراتی ہیں، کوّے بے وقت کائیں کائیں کرتے شور مچاتے ہیں اور بوندوں کے ایک ساز پتوں پر پڑنے سے جلترنگ سا بج اٹھتا ہے یہ یہ سب سننے کا کسی کے پاس وقت ہی نہیں گھٹا کی وجہ سے ڈراؤنا سیاہ اندھیرا ہی دِکھتا ہے جس سے جانے کیوں ہول آتا ہے؟

سنیاس پر وہ لیکچر بہت بور تھا اور مونیک کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ تیاگ اور جوگ، تپ اور مارگ اور دھرم کے لفظ بار بار سن کر میرا تو سر دکھنے لگا تھا میں شاید چند منٹوں کیلئے اُونگھ گئی تھی اس لیے کہ ہڑبڑا کر جب میں نے آنکھ کھولی ہے تو مونیک میرے کندھے پہ ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی چلوا چلا چلیں پھر بہت بھیڑ کی وجہ سے نکلنے میں

دیر لگے گی۔
دل ہی دل میں مَیں نے سوچا تھا مونیک میں ابھی وہ گمبھیرتا نہیں آئی جو آدمی کے تن اور من کو اُس کے گیان اور اس کی سوچ کو ایک سیدھی لکیر بنا دے۔ یہ تو اس طرح جلدی مچانے والی ہر شے پر موہت ہو جانے والی ہر رنگ پہ مر مٹنے والی لڑکی ہے یہ جس کے پاس ابھی کچھ ہے ہی نہیں کیا تجھے گی؟ کیا تجھے گی بھلا؟
گھر میں گھسے ہیں تو اونچے دالان میں بڑی گہما گہمی تھی۔ رجنی دادی کا سنگار ہو رہا تھا۔
رما اری اور ماکنتی بھابی نے پکارا کہیں سے تھوڑی سی لالی تو لا ہونٹوں کی لالی۔
"میرے پاس تو وہی بدیسی لپ اسٹک ہے" رما نے شرارت سے کہا۔
ارے نہیں بابا مجھ پر تو دیا ہی کرو جانے اس میں کیا رہتا ہے کھوٹ اور چربی اور جانے کیا کیا؟
کنتی بھابی نے کہا "دادی ذرا ہلو نہیں تو میں تمہارے بال باندھ لوں"۔ وہ نئے اسٹائل سے یہ سب کر رہی تھیں اور میں پکڑے پنوں کی وجہ سے ان کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دادی کا چہرہ جھُرمرایا ہوا، لکیروں اور تکونوں اور چوکوروں سے بنا تھا گردن ہلتی تھی سفید بھنویں آنکھوں پر ڈھکی تھیں اور سیندور کی لکیر بالوں کے اجلے پن کو اور بھی اجال رہی تھی جیسے برسے ہوئے بادلوں کے بیچ بجھتے سورج کی گلابی رنگ کرن کہیں سے پھوٹ پڑے۔
"دیکھو جو کرنا ہو جلدی کرو" دانتوں کے نہ ہونے سے دادی کے منہ سے بات بھک بھک آدھی آدھی نکل رہی تھی "برت کا سمے ہو گیا ہے اور وہ سب دوسرے آنگن میں برگد تلے میری راہ دیکھ رہی ہیں۔
رما نے پلو منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور ہنسی کے مارے دوہری ہوتی بڑھتے دھندلاتے شام کے سایوں تلے دادی کے ہونٹوں کو لالی سے لت پت کر رہی تھی۔

"بس اب رہنے دو دادی نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا یہ سب شگن کے لئے ہوتا ہے سوکھے لکڑی کے سے بازوؤں کو انہوں نے میری طرف پھیلایا ہے تو سہاگ کی چوڑیاں بج اٹھیں میں نے آگے بڑھ کر پکڑا۔

" اچلا چل بیٹیا ذرا سہارا دے۔ یہ رستا تو بڑی نٹ کھٹ ہے مجھے گرا ہی نہ دے"۔

سر پر پلوؤں کو ڈھکے پوجا کے تھال ہاتھوں پہ ٹکائے دیوں کی دیوالی لیے وہ اس گہری شام میں پچھم سے نکلتے والے اکیلے تارے کا انتظار کر رہی تھی۔ چڑھاوے کے پکوانوں اور پلوؤں میں بندھے پھل کی میٹھی باس سے لگتا تھا ستاروں کی جوت مہک اُٹھی اور اندر اتر رہی ہے بے چین ہو کر ڈول رہی ہے۔ پھر تارا ڈرتا کانپتا چھوٹے منے کی طرح چھپا چھپا شام کے نیلے پن پر جھانکنے لگا۔ گہری لہو رنگ لال اندھیرے میں گم ہونے لگی۔ شرماتی لجاتی بہو کی طرح اس نے ستاروں بھرا پلو دھیرے دھیرے اپنے چہرے پہ کھینچ لیا ہو۔ سب کے ساتھ مل کر گیت گانے لگی اور برگد کے پتے سہاگ گان پر تال دینے لگے۔ شاخیں جھکیں جیسے ساوتری کتھا سننے میں رچتی دادی کی آواز تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ اور دادی کا چہرہ لو دیتا تیز تیز چمک رہا تھا جیسے بس ساری ہمت کے ساتھ انتم بار پورے کا پورا جل جانے والا دیا ہو۔

"کیا ساوتری کتھا سچ ہے" لیٹنے سے پہلے مونیک نے مجھ سے پوچھا۔ نیچے آنگن میں سارے شور بیٹھ   روتے بچوں اور بھجن کیرتن گانے والوں کی ٹولیاں سہاگنوں کا ڈرسمیٹ کر جا چکیں اور برگد کے گرداگرد دیوں کی دیوالی جل کر سو یکار ہو چکی۔ یہ سوال مونیک کی طرف سے مجھے بڑا عجیب لگا۔ وہ تو سنیاس لینے جا رہی ہے دور دیس سے اپنا پہلا دھرم تیاگ کر یہاں آئی ہے اپنے پریم اور وشواس سے وہ مکتی کی کھوج میں نکلنے والی ہے۔ اگر وہ ابھی ایسے سوال اپنے دل میں لیے پھرتی ہے تو اس کا کرم دھرم تو ادھورا رہ جائے گا۔ اگر بہت شک کروسوچو ہر چیز کو جاننے کی کوشش کرو بھیدوں کو کھولنے

ان کی اتھاہ تک جانے میں وقت لگاؤ تو کرم دھرم ادھورا رہ جاتا ہے۔ آدمی اور بھگوان کا سمبندھ کمزور پڑ جاتا ہے۔" یہ سب ماں کہا کرتی ہے۔"

ماں کتنی سندر رہے یا ہو سکتا ہے وہ مجھے ہی ایسی دکھائی دیتی ہو۔ کبھی مکھ بھور کا سا رہا ہوگا اور وہ نگاہ جیسے شیتل جل کی دھندلائی ہوئی ندی میں شعلوں کا عکس لہراتا ہو جیسے دھارے میں آکاش دکھائی دے۔ ایک پیار کا سماں سا گر سا امنڈتا جان پڑتا ہے۔ دھیرج سے بات کرنے والی ہم سے بہت پریم کرنے والی۔ بچپنے میں ماں رامائن پڑھ رہی ہیں اور ہم پیچھے سے باہیں ڈال دیتے ان کے گلے میں جھول جاتے بال الجھا دیتے۔ پر ماں ہمیں گود میں اٹھا لیتیں غصے کی جگہ ہنس کر پیار کرتیں مانو ہم ہی بھگوان ہیں۔ تیوہاروں پر ماں کا چہرہ دیوں کے اوپر جگمگاتا اور بہت اچھا لگتا جیسے جوت کا بنا ہو۔ ماتھے پر بڑی سی بندیا سجائے، مانگ میں سیندور بھرے وہ لگتا آپ مورتی ہے اور آپ مندر جیسے بھگوان اس کے من میں اترا ہو۔

میں سوچا کرتی ماں کا اور بھگوان کا رشتہ بہت پکا ہے وہ سب کو سدا سکھی رکھے گا پھر یوں ہوا کہ بابا نہ رہے ماں کی لٹی پٹی صورت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا۔ ڈوبتا رہتا جیسے میرے انتر میں سمندر اترے ہوئے ہوں۔ بھگوان کا اور ماں کا سمبندھ کیسا رہا مگر میرا اور ایشور کا ناتہ دھندلا گیا اس کے اور میرے درمیان ایک اوٹ ہو گئی۔ زبان سے ہم اب بھی اس سے پرارتھنا کرتے۔ مورتی پر پھول چڑھاتے مندر کی سیڑھیاں دھوتے، ہر جگہ اس کا نام تھا مگر دل شام کے سونے پن میں خالی خالی لگتا ایک سانس اندر بنا لگا یا کرتی جیسے خالی گھروں میں اندھیرے میں ہوا دبے پاؤں گھومتی ہے بنا کسی باس کے بنا کسی سوگندھ کے اچلا ادبھئی اچلا میری بات کا جواب تو دو کہاں کھو گئیں۔"

لگا کسی نے مجھے اونٹے ہوئے سنڈولے کے پیندے تلے سے نکالا ہو۔

باغ میں کوئل کوہو کوہو بولی، جانے وہ اُن پرانے گھرے ہرے اور اُجاڑ درختوں

میں چھپی کیا چاہتی تھی۔ ماں نے یہ پکار سنی ہو گی۔ جانے اسے کیسا لگا ہو گا۔ ماں جو کم سونے، کم ہنسنے اور کم بولنے والی بیراگن تھی اس کے چہرے کی جوت جانے کہاں گم ہو گئی تھی آنسوؤں سے دھندلی آنکھیں جھکائے وہ ٹوٹے سپنوں کی رکھوالی کرتی تھی۔ ان کرچیوں کو چننا نہیں چاہتی وہ ایک آدمی جس کے ہونے سے سنسار کی سندرتا تھی سچ اور سکتی تھی اس ایک کے نہ ہونے سے کتنا اندھیار تھا ہمارے چاروں اور۔ میں چیزوں کا اصل روپ ان کا اجلا پن اُن کا نیا پن دیکھ نہ پاتی تھی۔ ہماری راہیں الجھ گئی تھیں جانے ماں کو کیسا لگتا ہو گا۔ ماں کسی سے کچھ کہتی بھی تو نہیں۔ کہنے کے لیے رہا ہی کیا تھا۔

"اجلا سو گئی ہو کیا؟ مجھے کتھا نہیں سناؤ گی"اس نے میرا کندھا ہلا کر کہا۔

"میرا کندھا اکھاڑے کیوں دے رہی ہو بھائی"! میں نے اٹھتے ہوئے کہا

"سوری"، مونیک نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"سنو کتھا تھوڑا سچ ہوتی ہے تھوڑا خیال"، میں نے کہانی کہنے والے کی طرح شروع کیا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ تو دھرم کی بات ہے اس میں سب ایسے ہی ہونا چاہیے جیسے ٹھیک ہوا تھا"! مونیک نے بحث کرنے والے کی طرح کہا۔

بھئی دیوی دیوتاؤں کا زندگی سے اپنا ایک ناطہ ہوتا ہے اور آدمی اس ناطے کے خیال کے گرد اگرد اپنی اپنی اوڈیں گھڑ کر کے اپنے دل کے رنگ اس میں بھر لیتے ہیں اور اس لیے ایک دیوتا کے کئی روپ ہوتے ہیں ذرا سا سوچو تو سارے دھرم ایک ہی طرح کی سوچ اور سپنوں کے تانے بانے سے ڈھکے ہیں،

"نہیں"، مونیک نے کہا "ہمارے دھرم میں میرا مطلب ہے پچھلے دھرم میں تو کوئی دیوتا نہیں ہوتے صرف خدا کے تین روپ ہیں تین خدا جیسے ایک مورتی کو تین طرف سے دیکھا جائے جیسے دکن میں غاروں میں بنی تر مورتی اور بس۔

"یہ تو صرف ایک کتھا ہے۔ بھئی سن کر اس کا سچ جھوٹ خود معلوم کر لینا ماں یہ کتھا یوں سنایا کرتی ہیں۔"

"ست یُگ کی بات ہے جب ابھی دنیا بھلے آدمیوں سے خالی نہیں ہوئی تھی کسی دیس میں ایک راجہ تھا اشوپتی نام اُس کی ایک بیٹی تھی ساوتری بہت ہی سندر اور بڑی گُن وتی جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اسے تیرتھ یاتراؤں پر جانے کا خیال آیا۔"

"مگر مشرق میں لڑکیوں کو اتنی آزادی کہاں ہوتی ہے انہیں گھومنے نہیں دیا جاتا جھٹ بیاہ ہو جاتا ہے"۔ مونیک کے سوالوں کا پہلا راؤنڈ شروع ہو گیا تھا جی میں تو میں نے سوچا وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے پر اسے کتھا کے بیچ گھڑی گھڑی بولنے سے روکنے کے لیے میں نے کہا۔

"ایسا ہوا ہوگا تب ہی تو یہ بات کہی گئی۔"

"اچھا"، وہ میرے پلنگ کی پائنتی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ "پھر"،

راجکماری کی سواری چلی رتھوں کا ایک لمبا لشکر ہاتھیوں کے پیچھے تھا۔ پہلیوں میں ساوتری کی سکھیاں اور ان کی باندیاں، مہامنتری کی کنیائیں اور دوسرے منتریوں کی بیٹیاں اور ان کی داسیاں بھگوان کی استتی گانے والوں کی سواریاں اور دیوداسیاں اور بھجن کہنے والے لوگ اور پجاری مندر کا ایک الگ رتھ جس میں آسن سمیت مورتی اور اس سارے لمبے قافلے کے بیچوں بیچ سنہرے پردوں والا اونچا رتھ جس میں ناگوری بیل جتے ہوئے یوں تیز دوڑنے والے مانو اندر دیوتا کی سواری میں جُتے ہوں مست آنکھوں سیاہ بالوں والے بانکے رتھ بان۔

"اِندر دیوتا وہی بارش کرنے والے"، مونیک نے پوچھا۔

"وہی"، میں نے جلدی سے کہا۔ "وہی ساوتری کے ماتا پتا کی اشیرواد اُس کے ساتھ تھی مہینوں کا سفر دِنوں میں کٹ رہا تھا۔ وہ کئی راجوں میں سے گزرے ایسے راج

جہاں دھرتی سونے کی بنی لگتی تھی۔ پربت بادلوں میں کھوئے ہوئے اور برف سے جھم جھماتے ہوئے ساگر اُبلتے ہوئے اور دریا بہت آنند سے بہتے ہوئے۔ ایسے راج جہاں کھیتوں میں ہریالی تھی کھلیان بھرے ہوئے تھے دکانیں سامان سے اٹی ہوئی تھیں، بازاروں میں پھرتے ہوئے لوگ خوش تھے بھکشا پانے کے لیے کوئی بھکاری نہ ملتا تھا، کوئی بھوکا نہ تھا دھرم شالوں میں مہمانوں کی دھوم تھی اور برہمنوں کو بھوجن کرانے والے، پُن کرنے والوں کا ایک شور تھا، مندروں میں ہیرے اور جواہرات کے سفید قیمتی پتھروں کے چڑھاوے، مورتیوں پر چڑھائے جاتے تھے۔ لگتا تھا ساری دھرتی سے دیوی دیوتا خوش ہیں۔

"اگر بہت پیسہ ہو اور بازار بھرے ہوں تو کیا دیوی دیوتا خوش ہوتے ہیں! دیوتاؤں کی خوشی صرف اس بات سے ظاہر ہوتی ہے "بہت سے بہت سے" اس نے بازو کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔

مونیک کتھا سننے کا یہ طریقہ نہیں بس تم چپکی بیٹھی سنتی رہو میں تمہاری اس کمنٹری کا جواب دینے لائق دو دیا پر ایت نہیں کر چکی، زیادہ سے زیادہ تم یہ کر سکتی ہو کہ ہنکارہ بھر سکتی ہو۔

"وہ کیا ہوتا ہے"

"تم صرف ہاں کہہ سکتی ہو اپنے سنتے ہوتے اور جاگتے رہنے کا ثبوت"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

"مگر میں تو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں" اس نے کہنیاں بستر پہ ٹیک کر ہاتھوں پر چہرہ سجا لیا "بستیوں سے گزرتے ندیوں کو پار کرتے بنوں میں ڈیرہ لگاتے وہ جانے کتنے زمانوں یونہی گھومتے رہے دیس کی ساری یاتراؤں پر ہر چھوٹے بڑے مندر میں انہوں نے ماتھا ٹیکا ہر دیوتا کے استھان پر ہر دیوی کے دوار پہ انہوں نے پریم

بھگتی کے گیت گائے۔ سارے پوتر مندر انہوں نے دیکھے گنگا اور جمنا اور گومتی اور کرشنا میں اشنان کر کے پاپوں سے مکت ہوئے۔ ساوتری بہت خوش تھی اس کا من گیان اور دھیان سے یوں چمک اٹھا تھا کہ اس میں بیتے دنوں کی یادیں اور آنے والے دنوں کی پرچھائیں دکھائی دیتی تھی پہلے جنموں کے سارے کرم اُسے ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے جیسے نرم باس بھری ہوا کے ساتھ پردے ہولے ہولے اُڑیں اور اندر جو کچھ ہے اس کی ایک جھلک دیکھی جا سکے۔

"کیا ایسا ہونا ممکن ہوتا ہے" گویا مونیک نے اپنے آپ سے کہا۔

"ست یگ میں ایسا ہو سکتا تھا۔ بھگتی سے آدمی کے اندر اتنی شکتی پیدا ہو ہی جاتی ہے اب تمہیں تو خود معلوم ہے کہ جاپ کرتے رہنے سے اسے پکارتے رہنے سے گائیتری مندر کا پاٹھ کرنے سے تم بھگوان کے اتی سندر روپ کو دیکھ سکتے ہو۔ دیکھ سکتے ہو نا؟"

اور دل ہی دل میں مَیں سوچ رہی تھی کہ کیا آدمی بھٹک گیا ہے؟ دولت کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے کیا روشنی بجھ سی نہیں گئی کہ اب پچھلے جنم کی باتیں یاد آنا تو ایک طرف رہا ایک دن کی بات دوسرے دن یاد نہیں رہتی اور پھر زندگی گزارنا کتنا کٹھن ہوتا ہے شاید ست یگ میں لوگوں پر یہ روز روز کے بوجھ نہ ہوتے ہوں گے انہیں فرصت ہوتی ہو گی کیا ان دکھوں سے تھوڑی آزادی ہی تو ست یگ نہیں۔ بس یہ آزادی ہی تو ست اور بھگتی اور پریم ہو گا۔ بھول گئی ہوا چلا کہ آگے کیا ہوا تھا" مونیک نے مجھے خیالوں کی بند کوٹھری سے نکالا۔ پھر اس نے تب دن کے گہرے سایوں اور شام کے مدھم پڑے اجالے میں ایک سجیلے جوان کو دیکھا کلہاڑی کو کندھے پر دھرے اس کا ایک قدم ندی کے بیچ تھا اور ایک دوسرے کنارے پر وہ جانے کس پار جانا چاہتا تھا کہاں سے آیا تھا وہ اسے دیکھتی رہی اس کا من اتھل پتھل ہو رہا

تھا۔ وہ اسے پہچاننے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی سینے پر پڑی مالائیں ہل رہی تھیں جیسے اندر طوفان آیا ہو۔ ڈوبتے سورج کی لالی میں اس کے نتھنے گلابی ہو رہے تھے سانس تیز دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، وہ آنکھیں بند کرتی اور کھولتی تھی یہ کوئی سپنا تو نہیں ؟ مگر بن کے اندھیارے اور ندی کے لال شعلوں کے رنگ کے پانی کے سنگھم پر وہی تھا ہاں یہ وہی تھا اس کے پچھلے جنم کا ساتھی۔ ساوتری نے پلو اپنے سر پر ڈھکا اور اپنے اونچے رتھ کی اور چلی اب یاتراؤں اور بنوں اور راہوں اور گھومتے رہنے سے چھٹکارا پانے کا سمے آگیا تھا مگر اس نے اس جوان سے بات کیوں نہ کی' اسے پہچان کر اس سے کچھ کہا کیوں نہیں ؟ مونیک کی آواز گھمبیر سایوں کے پار سے سنائی دی، یہ شاید پہلی نظر میں محبت ہو گی ؟

"نہیں یہ محبت نہیں تھی یہ اس کے ماتھے کا لکھا تھا یہ اس کا نصیب تھا جس تک وہ اس تپ ون میں پہنچی"، میں نے جو سنا تھا کہہ دیا۔

مونیک نے گردن کے قریب اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں یہ بات اس کی سمجھ سے قطعی باہر تھی، راج محلوں میں ساوتری کھوئی کھوئی سی لوٹی۔ رانی ماں نے اس کا اُڑا ہوا رنگ اور اداس چہرہ دیکھا کچھ سوچتی اور دور دیکھتی آنکھیں دیکھیں مگر نہ باندیوں میں سے کوئی اور نہ ہی کوئی سکھی بتا پائی کہ کیا ہوا تھا کوئی کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اماوس کی راتوں میں اور پُورنماشی کی پھیلی چاندنی میں وہ راج بھون کے باغوں میں اور اندھیاروں میں اکیلی ڈولتی۔

"مائی ڈیئر اس نے اپنے ماتا پتا سے کیوں نہ کہہ دیا کیا یہ کہنا اتنا مشکل ہوتا ہے ؟"
مونیک کا بیہودہ سوال پھر بیچ میں آ گیا۔

"مونیک یہ یونہی ہوا تھا اگر ساوتری ساری اَن کہی باتیں کہہ پاتی تو پھر کتھا کی کیا ضرورت تھی"، میں نے تیزی سے جواب دیا "آئی ایم سوری اجلا" اس نے بازو اپنے سینے

پر باندھ کر سر جھکا لیا۔

رشیوں منیوں راج جوتشیوں کی ایک بیٹھک ہوئی بہت فکرمند راجہ اشو پتی کو بھی آنے کی تکلیف دی گئی نارد منی کے سیدھی طرف بیٹھ کر راجہ نے ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے اور انتظار کرنے لگا ستیہ وان اور ساوتری پچھلے جنم کے ساتھی ہیں مہاراج" نارد منی نے کھنکار کر تھوک نگلتے ہوئے کہا مگر یہ ساتھ ہونا نہیں چاہیئے اس لیے کہ ستیہ وان پر ایک شراپ ہے وہ اس بندھن کے ایک سال کے اندر اندر پرلوک سدھار جائے گا۔

کیا ہوا ب کیا ہو سارے میں ایک گمبھیر چپ چاپ چھا گئی۔

ستیہ وان کے ماتا پتا سے راج پاٹ چھن چکا ہے اور آنکھوں کی روشنیوں بھی، وہ تپ دان میں رہتے ہیں لکڑیاں کاٹ کر گزارہ ہوتا ہے۔

ساوتری ماتھے تک پلو کھینچے دھیرے دھیرے چلتی راجہ کے پاس آن کر بیٹھ گئی جوگیا ساڑھی میں وہ تپسونی لگتی تھی چہرے پر شانتی اور ماتھے پر تیج ہونٹوں پر مدھر مسکان بھونرا سی آنکھوں پر لمبی پلکیں گرائے جن کا سایہ کالے بادل کے ٹکڑے کی طرح اس کے گالوں کی لالی کے کنارے ٹھہرا تھا۔ میں نے ستیہ وان کو دیکھا ہے اس نے راجہ باپ کے پیر چھو کر کہا۔

نارد منی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا "مگر وہ ایک سال سے ادھک جی نہ سکے گا۔"

"کوئی سدا جیا ہے کیا؟" اس نے مضبوطی سے سیدھا نارو جی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ساری سبھا کے سانس رک سے گئے۔

پتا جی مجھے اشیر واد دیں اس نے اپنا سر راجہ باپ کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"کمال ہے بھئی،" مونیک نے پہلو بدلا پلنگ چرچرایا تو وہ وہیں رک گئی۔ کہیں دور پرے بادل گڑگڑایا، باغ میں کوئل بولی چاند کھلی کھڑکی سے جھانکا اور ہوا کے زور

سے پٹ یوں بجے جیسے بچھڑی آتمائیں گلے مل رہی ہوں پھر تیز تیز بگولوں کی بھاگ دوڑ سنائی دی ڈھول بھرا ایک بگولا اندر آیا۔

"پھر راجکماری ساوتری کا کیا ہوا؟" مونیک نے اٹھ کر کھڑکی بند کی رنگ برنگ شیشوں کا سایہ دھنک کے لہریے کی طرح فرش پر لہرایا اور کمرہ جادونگری کا ایک ٹکڑا لگنے لگا۔

وہ راج محل چھوڑ کر بن میں آن بسی۔ ستیہ وان لکڑیاں کاٹ کر لاتا وہ ندی سے پانی بھر کر لاتی۔ ساس سسر کی سیوا کرتی۔ جنگل کے پنکھ پکھیرو سب اس سے پیار کرتے تھے کٹیا کے آس پاس پھول اسے دیکھ کر کھل اُٹھتے جب تک ستیہ وان اس کے پاس رہتا وہ خوش رہتی پر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو آنے والے دکھ کا سایہ اُس کے چہرے کو کلونس دیتا۔ پل پل گھڑی گھڑی دن بیت رہے تھے وہ سوتے سے گھبرا کر اٹھ جاتی، کھڑے سے بیٹھ جاتی ایک بیکلی تھی جو اُس کی جان کو قید کئے ہوئے تھی، جیسے رات کے سمے پھول کے اندر بھولے سے بند ہو جانے والی شہد کی مکھی کھلے آکاش تلے پھیلی ہوئی دھرتی پر وہ سورگ میں نہیں نرک میں تھی۔

"اچھا نہ ہوتا اگر نارو منی اسے وہ سب نہ بتلاتے" مونیک نے آہ بھر کر کہا۔ "اگر آدمی بہت جانتا ہو تو وہ بھی دُکھی ہوتا ہے اگر دُور تک دیکھ سکے تو تب بھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ آدمی سارا وقت موت کے سائے میں جیتا ہے کیوں اچھا کیا وہ اس ڈر سے مکت نہیں ہو سکتا؟"

اوم شانتی شانتی شانتی۔

مونیک نے ماتھا جھکا کر اپنے جڑے ہوئے ہاتھوں پر رکھ کر کہا۔

"مونیک او مونیک" میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مار کر کہا۔ "اگر تم یہ کمنٹری نہ کرو تو کتھا جاری رہ سکتی ہے مگر اچھا وہ کہانی ہی کیا جو آدمی کے اندر سوال پیدا نہ کرے اس کے

اندر سوچ پیدا نہ ہو اس کو دکھی اور پریشان نہ کرے۔ کہانیاں آدمی کے اندر ہلچل مچاتی ہیں سوالوں کا جواب پانے کے لیے آدمی ادھر ادھر بھاگتا ہے اور پھر کتھا تو ست یگ کی ہے تم مجھ سے اس سلسلے میں سوال کرنے کا حق نہ چھینو بھئی۔

میں بُرا مان کر چپ ہو بیٹھی۔ رات بیتی جا رہی تھی ہوا کا شور بڑھ رہا تھا جیسے بادلوں کی گھن گرج اُڑی چلی آ رہی ہو۔

بھگوان شاید اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ آدمی جھکا ہوا روتا ہوا پراتھنا کرتا ہوا کسی نہ کسی مانگ کے لیے اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا اور ساوتری کیا مانگ سکتی تھی۔ بھلا جب بھگوان کا لکھا اٹل ہوتا ہے،" وہ چپ ہو گئی جیسے اپنے سوالوں کا جواب کھوج رہی ہو۔

"اچھا بھئی سناؤ نا تم چپ کیوں ہو اچھا مجھ سے ناراض ہو"اس نے منت کرنے والے کی طرح ہاتھ میری طرف پھیلایا۔

نارد جی کی بات پوری ہونے کا سمے قریب آ رہا تھا اور ساوتری کا ستیہ وان کو دیکھ کر ہنس دینا۔ اس کا اپنے آپ سے باتیں کرنا مٹھیاں بھینچ کر جیسے وہ بھگوان سے لڑنے کے لیے تیار ہوتی لگتا وہ پور پور شکتی اکٹھا کر رہی ہے حوصلہ جمع کر رہی ہے جیسے بوند بوند شہد کو جمع کیا جاتا ہے اس کی چڑھی ہوئی بھنویں پسینے کے ستاروں تلے دوج کے چاند کی کمان کی طرح تنی ہوتیں اکیلے میں وہ شیرنی کی طرح ہر سائے پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھی ہواؤں کا رخ پھیرنے کا مان لیے اگر کوئی دیوتا بھی اسے دیکھ لیتا تو گھبرا کر لوٹ جاتا مگر جانے کیوں ان دنوں وہ کسی کو نہ پکارتی۔ ساگر کی انتم گہرائیوں کی طرح چپ چاپ اپنے جذبوں کو سمیٹنے میں لگی تھی ایک جگہ جمع کرنے میں۔ اپنے آپ سے بھی وہ کچھ نہ کہتی اس کی نگاہیں ستیہ وان تک دیکھتی ہوئی ملتیں۔

کبھی سر اونچا کیے کٹیا کے آس پاس جلد جلد پھرتی جیسے دھرتی کو اپنے پاؤں تلے سمیٹ لے گی۔ سمے، او سمے، کیا تو رُک نہیں سکتا!

پھر دیکھتی ستیہ وان سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے آ رہا ہے اور راج ہنس اس کے پیچھے آ رہے ہیں چڑیاں چوں چوں کرتی پھدک کر گیندوں کی طرح اس کے آگے لڑھک رہی ہیں، ندی کا پانی اچھل اچھل کر اس کے پاؤں میں لوٹ رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے دل کو سینے میں دبائے وہ سوچتی جو پچھلے جنم میں بچھڑا تھا کیا وہ اب بھی بچھڑ جائے گا۔ ملنے اور بچھڑنے کے ان چکروں سے جانے وہ کب چھوٹے۔ ایک سے دوسرے جنم تک موت جانے کب سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ کیا وہ موت سے مکت نہیں ہو سکتی؟

اسے زندگی اچھی لگتی تھی وہ ان ہواؤں اور چمکتے دھاراؤں میٹھے جھرنوں اور تاروں سے جڑے اس آکاش سے پریم کرتی تھی، ستیہ وان کے بناں ساری چیزوں میں کوئی مطلب نہ تھا کیا اس کے گرد یہ جھلملاتا جیون موت کے اندھیکار میں چھپ نہ جائے گا وہ کیا کرے ہاں کیا کرے بھگوان سے کبھی کوئی جیت سکا ہے کیا؟ کون ایسا بلوان ہے؟

پھر ہوا ایک دم رک گئی شور مچاتی ندیاں اور ان کا پانی اڑتے ہوئے پنچھی اور ان کے گیت پتوں کی سرسراہٹ اور شاخوں کا ہلنا ایک دھند لکے نے ساری دھرتی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ساوتری نے اس مدھم پڑتے اجالے میں دو گپھاؤں کی سی آنکھوں کو دیکھا جو ستیہ وان کو دیکھتی تھیں۔ یہ اس کے برت کا چوتھا دن تھا اور صرف وہی جانتی تھی کہ یہ ستیہ وان کے جیون کا آخری دن تھا۔ وہ ان لتاؤں کو باندھ کر بنائی گئی کٹیا میں بیٹھی تھی جو صبح ستیہ وان نے اس کے سر پر اوٹ کرنے کے لیے کھڑی کی تھی پھولوں کی پتیوں کے فرش پر بیٹھے اس نے دیکھا ستیہ وان جھوما تھوڑا لڑکھڑایا اور کلہاڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا یہ اس کے سکھ کا انت تھا تو انت آن پہنچا تھا۔ اب اس کی مانگ کا سیندور ڈھل جائے گا اور تب ون کی ندیاں اس سے گلال رنگ ہو جائیں گی، سارے ساگر اس رنگ سے رنگے جائیں گے ستیہ وان نہ ہوگا اور یہ سب کچھ ویسا ہی رہے گا چاند

اور سوریہ اور آکاش اور ستارے اس کے گرد ناچتی گاتی ہوائیں اور زندگی بھرے گیت سب یونہی رہیں گے کچھ نہیں بدلے گا صرف وہ نہیں رہے گا ساری چیزیں اس کے خلاف بڑے لشکر کی طرح جمع ہو گئی تھیں پھر اس نے اپنے اندر ایک عجیب بل اور شکتی محسوس کی، آکاش اور دھرتی اور ہواؤں سے وہ جو اپنا تھا اسے چھین لینے کی عظیم خواہش یم دیو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لینے کا حوصلہ۔ اس نے دیوتا کو پرنام کیا ہاتھ جوڑے اور چپکی کھڑی ہو گئی۔

یم راج نے اسے دیکھا مگر وہ اسے لینے تو نہیں آیا تھا۔ ستیہ وان کو اس نے اپنے جال میں باندھ لیا جس میں وہ اپنے ہر شکار کو باندھ لیتا ہے پھر لہروں نے اچھلنا اور اور کنارے کی طرف ناچ کے چکروں میں بکھرنا شروع کیا بھنورا اپنے اپنے چکروں میں مگن گھومنے لگے پرندوں نے شام کے نیلے پن میں اپنے پروں کو جھٹکا جیسے وہ نیند سے جاگے ہوں، جھونکے اونچے درختوں کی پھنگوں اور چوٹیوں پر آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ پتے اور پھول اور گھاس پر چرتی گائیوں نے سر اٹھا کر اپنے گرد اگرد کھیلتی ہوئی ہوا کو سونگھا۔

"کوئی موت کی شکل دیکھ سکا ہے کیا؟" مونیک کی آواز میں ڈر تھا۔ "ناممکن"

"یہ تمہاری اور میری بات نہیں ہو رہی بہن" میں نے سوچا اب کتھا سناتے رہنا بیکار ہے جب وہ کسی بات پر وشواس ہی نہیں رکھتی ڈرے ہوئے دکھوں کے مارے لوگوں کی سی اس کی سوچ ہے جو کسی اچھی بات کی امید ہی نہیں رکھتے جو بھگوان کی شکتی کو اور خود آدمی کی شکتی کو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہر روز زندگی میں ان کے کام آتی ہے جن کے من کے اندر گھور اندھیار ہوتا ہے جو بس جئے جاتے ہیں کہ ان کا سانس آتا جاتا ہے۔ جو جیتے ہیں کہ مر نہیں سکتے جو بڑی باتیں سمجھ نہیں سکتے اس لیے کہ ان کی آنکھ اپنے آگے کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکتی۔

"اچھا سنو اندھا وشواس کوئی شے نہیں آدمی سمجھنے کی کوشش تو کرتا ہے" "یہ اندھا وشواس نہیں ہوتا مونیک ہر بات آدمی کی ذراسی عقل میں اس کے چھوٹے سے دماغ میں کیسے آسکتی، ہاں جب تک وہ بھگوان پر وشواس نہ رکھے۔ اب مجھے یہ بات بتاؤ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دھنک میں اتنے رنگ کیوں ہیں وہ کمان کی طرح کیوں ہوتی ہے پھر وہ بارش والے دنوں میں ہی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ پرندوں کو سوریہ کے پرکاش کا وقت کون بتاتا ہے وہ کیوں جاگ جاتے ہیں؟ سائنس اپنی ساری سمجھ کے ساتھ بھی کائنات کے سارے راز جان نہیں سکی جان سکی ہے کیا؟

"ہولے ہولے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں لوگ" مونیک نے دھیرے سے کہا۔

ارے سینے دو آدمی بس جہاں سے چلا تھا وہیں ہے بندھے ہوئے جانور کی طرح بس اپنے گرداگرد گھوم لیتا ہے۔

"تم تو اچھا خاصا لکچر دے لیتی ہو۔" ہنس کر مونیک نے کہا "چلو بتاؤ پھر کیا ہوا"

مجھے آج تک کسی نے نہیں دیکھا پھر ساوتری نے کیسے دیکھ لیا دیوتا سوچتا ہوا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

یم پوری کا راستہ کٹھن تھا اور دور تھا الجھا ہوا تھا اور اندھیارے سے ہو کر جاتا تھا بیچ میں دہا ساگر تھے جن کا نہ کوئی اور تھا اور نہ چھور پھر آکاش تھے ساتوں کے ساتوں دھوئیں میں لپٹے ہوئے بھیلے ہوئے۔

ساوتری یوں کیوں کھڑی ہو گئی تھی جیسے وہ بس میری ہی راہ دیکھ رہی ہو اسے مجھ سے ڈر کیوں نہیں لگا کتنی عجیب بات ہے، ایک کمزور سی لڑکی جو راج محلوں میں پلی بڑھی تھی تب ون میں بھی یوں دکھائی دیتی تھی جیسے راج بھون کے سفید چکنے فرش پر چلتے چلتے ابھی رکی ہو۔ گلاب کی پتیوں کے سے اس کے نازک پاؤں اور جب وہ خشک پتوں اور کانٹوں بھری ہریالی یا درختوں تلے ٹہلتی تو ایڑیاں یوں دکھائی دیتیں

جیسے جھونکے سُوگندھ والی پتیوں کو اُڑا رہی ہو۔ پھر دیوتا نے اپنے پیچھے چاپ سنی
کون اس کا پیچھا کر رہا تھا؟
گھوم کر اس نے دیکھا اور اس کے ماتھے پر ریکھائیں گہری خندقیں اور بھی گہری ہو گئیں۔ پہلی بار وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ساوتری اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ بکھرے بال بھینچی ہوئی مٹھیاں پاؤں لہولہان اور وہ آنکھیں جنھیں برسات کے بادلوں کی طرح امنڈ گھمڑ برسنا چاہیئے۔ خشک "تُو میرے پیچھے کیوں آ رہی ہے لڑکی" دیوتا نے بڑے گمبھیر مگر میٹھے لہجے میں اس سے پوچھا۔
"اور کہاں جاؤں دھرم راج میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔"
"تو اپنے گھر جا۔"
جہاں ستیہ وان ہیں وہیں میرا گھر ہے مہاراج اس نے بڑے رسان سے جواب دیا۔
"تو یم پوری نہیں جا سکتی۔"
تو انھیں بھی نہ لے جایئے اس نے ہاتھ جوڑ کر ہولے سے کہا۔
"یہ نہیں ہو سکتا ہاں اور جو تیرا جی چاہے مانگ سکتی ہے" دیوتا نے کندھے پر لٹکے جال کو تھپتھپایا۔
تو میرے سسر کی کھوئی ہوئی آنکھیں اور گیا ہوا راج لوٹا دیجئے۔
"ٹھیک ہے دیوتا نے لمبے لمبے قدم اٹھائے سرد گپھاؤں جمے ہوئے سمندروں اور ایسی سب جگہوں پر سے جہاں ہوا کا گذر بھی نہیں ہوتا وہ اُڑا چلا جا رہا تھا۔
مگر اس کی الجھن بڑھ رہی تھی چاپ اب بھی اسے اپنے پیچھے سنائی دے رہی تھی دھرتی اور آکاش جہاں ملتے دکھائی دیتے ہیں اس سے بہت آگے دلدلوں پر سے بھی وہ چاپ اس کا پیچھا کر رہی تھی وہاں جہاں شیش ناگ کا ٹھکانہ ہے چار آنکھوں

والے کتے پہرہ دیتے ہیں اور کالے دریا ابلتے ہیں۔

"ساوتری اب کیا ہے جس کے لیے تو میرا پیچھا کر رہی ہے جا لوٹ جا۔"

بھگوان آپ سورج دیوتا ہیں میرے جیون کو کیوں اندھیارا کر چلے ہیں میں کیسے جیوں گی۔

کیسی ناممکن باتیں کرتی ہے لڑکی ستیہ وان کو چھوڑ کر اور جو تیرا جی چاہے مانگ لے۔

پہلی بار ساوتری نے بکھرے بالوں کو ہاتھ پھیر کر پرے کیا اور کہا۔

بھگوان میں سو بیٹے چاہتی ہوں جو سورہیر اور بلوان ہوں۔

تیری اچھا پوری ہوگی دیوتا پلٹ کر اپنے راہ پر جانے کے لیے تیار ہوا مگر ساوتری اسی طرح ہاتھ جوڑے آنکھیں جھکائے کھڑی رہی۔

"بھئی معاف کرو اچلا کیسی راجکماری تھی اکٹھے سو بیٹے مانگ لیے۔" مونیک کا ہنسی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ "اوہ خدا ایک دم سو۔" وہ پیٹ پکڑے دوہری ہوئی جاتی تھی اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی مونیک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ مونیک میں نے قطعی بُرا مان کر کہا۔

"ایک دم سو بیٹے کیوں مانگے بچوں کو سنبھالنا تو یوں ہی بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"مونیک تم کسی قابل نہیں ہو تمہیں اپنے دیس لوٹ جانا چاہیے تم سنیاس لینا چاہتی ہو؟ ساری عمر بنوں میں ماری ماری پھرو گی مندروں میں ماتھا ٹیکو گی مگر کچھ سمجھ نہ پاؤ گی میرا اس بات پر پورا وشواس ہے۔"

"اچلا یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو صرف یہ بتاؤ کیا کوئی راجکماری جیسا کہ تم کہتی ہو ساوتری تھی اپنے ہوش و حواس میں ایسی بات کہہ سکتی ہے۔" وہ پھر بحث پر اُتر آئی تھی۔

تو مت سنو یہ کتھا اس میں تو سب ایسی ہی باتیں ہیں اور پھر ساوتری کوئی

معمولی عورت نہ تھی کیا تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی ہو۔

مونیک بہت دیر چپ رہی تو میں نے کہا" ہم اور تم تو ہر آنے والے دن ہر ہونے والے عام دکھ سے گھبرا جاتے ہیں پر ذرا سی تکلیف ہمیں پہاڑ دکھائی دیتی ہے۔ ہاہا کار مچا کر ہم لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتے ہیں مونیک نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا" پھر آ گئے۔"

دیوتا نے ساوتری سے پوچھا اب تم کیوں کھڑی ہو۔

ساوتری نے دیوتا کے پاؤں چھو کر کہا" دھرم راج بیٹوں کے لیے ستیہ وان کو بھی تو لوٹا دیجئے نا؟

پہلی بار اس سارے سفر میں یم دیوتا کی آنکھوں نے ساوتری کے ماتھے پر اس جوت کو دیکھا جو جلتی ہے۔ تو اندھیارے میں سورج پر کاش کرتا ہے چاند تارے اس کی روشنی سے روشن ہوتے ہیں جو زندگی کی جگمگاہٹ ہے جو پریم کی شکتی ہے اور موت سے بھی بڑی ہے۔ اور اس لیے امر ہے جس کو خالی ہاتھ لوٹایا نہیں جا سکتا۔

ستیہ وان نے آنکھ کھولی سر جھٹک کر ادھر ادھر دیکھا ساوتری کو دیکھ کر ستہسا ہاتھ سے آنکھوں کو ملا۔

میں نے بہت بھیانک سپنا دیکھا ہے پتہ نہیں وہ سپنا تھا کہ میں سچ میں مر کر جی اٹھا ہوں۔

شام در[illegible] کی شاخوں پر جھرنوں اور ندیوں پر اُتر رہی تھی پتوں اور پھولوں پر گلال رنگ سے ہوا کے نوپُور باندھے ناچ رہی تھی اور پرندے اپنی چھوٹی تانوں والے راگ گاتے شور مچاتے کہیں نہ کہیں اس سبھا میں گھسے جاتے تھے جب وہ دونوں کُٹیا کو لوٹے ہیں۔

ستیہ وان کے پتا نے پہلی بار اپنی تیج وتی بہو کو دیکھا اور اس کے شبھ ہونے کو

پرنام کیا۔

پھر راج پاٹ کے واپس ملنے کی خوشخبری دینے لوگ تپ ون میں انھیں کھوجتے ہوئے آن پہنچے۔ راجہ کی سواری سجے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ چلی اور یہ ایسا نظارہ تھا جس کو چاند تاروں نے بھی پہلی بار دیکھا تھا پھر وہ سب راج محلوں میں آن بسے تو دھنیہ ہے پربھو۔

"وہ سو بیٹوں کی مانگ کا کیا ہوا؟" مونیک نے پوچھا۔

"جیسے بھگوان نے اور ساری مانگیں پوری کر دیں وہ بھی کی ہو گی۔" میں نے بڑے جوش سے جواب دیا۔

مونیک چپ تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ کھڑکی کے باہر آندھی اور بگولوں نے شیشوں کے رنگ دھندلا دیئے تھے یا چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ جیسے روتے روتے چپ ہو کر سسکیاں بھرنے لگے دیوانی بنی لوگوں کو ڈرانے کے لیے سیٹیاں بجاتی کواڑ و کو دھڑ دھڑاتی یہاں وہاں تیز قدموں سے مست ہتھنی کی طرح چنگھاڑتی بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔

طوفانوں بھری رات جیسے آخری لڑائی کے لیے ہتھیاروں کو سمیٹا جا رہا ہو۔

"ستیہ وان اور ساوتری اب بھی کہیں ہوں گے؟" مونیک نے بہت دیر کے بعد پوچھا۔

"کیوں؟ ست یگ ختم ہو گیا یگ بیت گئے صرف دیوتا امر ہوتے ہیں آدمی کیسے اتنی دیر ٹھہر سکتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

بات تو تب ہوتی کتھا کے قابل اگر وہ دونوں اب تک ہوتے۔ وہ ایکبار موت کے سمندروں کو پار کر چکے تھے۔ واپس آ چکے تھے یم دیوتا کے ساتھ انہوں نے لمبی مسافت طے کر لی تھی پھر انہیں مرنا نہیں چاہیئے تھا اور میں بھی سوچنے لگی میں نے پہلے اسے

کیوں نہیں سوچا وہ امر ہو گئے ہوں گے انہیں ہو ہی جانا چاہیئے تھا۔

"ممتا، موہ، مایا کا تیاگ آدمی کو امر بناتا ہے۔" سنیاس کے لیکچر میں یہ الفاظ بار بار میرے کانوں سے ٹکرائے تھے۔

"وہ کیوں امر نہیں ہوئے" مونیک کا سوال پھر سنائی دیا۔

"تم بھی تو امر ہونے چلی ہو بھائی۔ موہ کا تیاگ مایا کا تیاگ ممتا کا تیاگ ہو رہا ہے" میں نے تلخی سے کہا۔

"نہیں تیاگ کا راستہ بہت لمبا ہے اپنے آپ کو سمیٹنا اپنے آپ کو بھولنا بہت مشکل کام ہے۔" مونیک کا من ڈول رہا تھا۔

تم ہر وقت دوسری راہ پر چل سکتی ہو۔ بنوں میں جا تو رہی ہو کسی ستیہ وان کی کھوج بھی کر لینا۔

ہنستے ہوئے اٹھ کر مونیک نے کہا" ٹھیک ہے پہلے ستیہ وان کی کھوج اور پھر تیاگ،" ٹھہر کر پھر اس نے اپنے آپ سے بات کرنے والے کی طرح کہا۔" مگر ستیہ وان کے ملنے کے بعد تیاگ تو رہ جائے گا۔

کیوں بھئی تیاگ تم میں وہ بل اور شکتی بھی تو پیدا کر دے گا جو ستیہ وان کو واپس لانے کے لیے ضروری ہے تاکہ تم اسے دیوتاؤں سے چھین سکو۔

نہیں اچلا جب آدمی امر نہیں ہو سکتا جب موت بار م بار اسے چھو جاتی ہے تو پھر بچنے سے کیا ملے گا تم کتھا سنا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی وہ دونوں اب بھی ہوں گے پر جب تم کہتی ہو وہ نہیں، تو چند دنوں کے لیے موت کو ٹالنے سے فائدہ۔ سب سے بڑی شکتی جب دھرم راج کی ہے تو یم پوری تک اس کا پیچھا کرنے سے بھی کیا ملتا ہے جسے بچا کر لاؤ۔ وہ پھر لوٹ ہی تو جاتا ہے۔

میں بھی سوچ رہی تھی مونیک کے دل میں کتنے سوال پیدا ہو گئے ہیں ان کے

جواب دینے کی میں اپنے میں ہمت نہیں پاتی۔ مجھے خود ان سوالوں کی سمجھ کبھی تو نہیں آپاتی بنواری دادا جانتے ہیں ان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ مونیک سنیاس کیوں لے رہی تھی؟ شاید آدمی رنگارنگ زندگی اور بہت سے گھبرا کر اپنے آپ کی کھوج میں نکلنا چاہتا ہے ساری عمر کھات لگا کر اپنے آپ کو پکڑنا چاہتا ہے۔ پاپ سے مکت ہونا چاہتا ہے۔ جانے کاہے کی کھوج اسے لیے لیے پھرتی ہے؟

مونیک کی سمجھ میں کیا آیا ہے۔

کیا اسے سنیاس لینا چاہیئے۔

پاپ اور پُن کی سمجھ کسی کو آسکی ہے کیا۔ اور آدمی ساری عمر کس سے لڑتا رہتا ہے۔

وہاں کوئنیز میں بنے اتی سندر رادم کے مندر میں ـــــــ ماتھا ٹیکتے مونیک نے ایک دم سوچا ہو گا کہ بندرابن میں مرلی منوہر کے سنگ راس رچاتی، گوپیوں اور کنہیا کے درشن سے اس کا جنم سپھل ہو جائے گا۔ نئی نسل بھٹکی ہوئی آتما کی طرح او ٹیں اور شرن تلاش کرتی پھرتی ہے بھلا کاہے سے ڈرتی کانپتی مونیک موہ اور تیاگ کے بیچ کوئی راہ چلنے کے لیے تیار ہے کیونکہ

"سب کرموں میں آتما کا گیان افضل ہے اس سے موکش ہوتا ہے"

وہ بھرگ سنگھتا میں لکھے اس منتر کو منہ ہی منہ میں دُہراتی رہتی ہے۔

موکش کے چکر میں ہو سکتا ہے کبھی اگیان سے گیان سے کبھی دور کوئی روشنی پا سکے۔

مجھے تو اس سب کی سمجھ نہیں آتی۔ میں سمجھنے کی کوشش میں بھی نہیں ہوں مجھے ایک کرن چاہیئے جو اس دھند میں لپٹے ہوئے اُداس جیون کو جگمگا دے۔ مجھے آتما کا گیان نہیں چاہیئے کیونکہ اس کے لیے تو ساکی منی گوتم نے اپنا راج پاٹ تج دیا تھا جو انہوں نے پایا سب کوئی تو نہیں پا سکتا۔ وہ شانتی جو اُن کی مسکان میں ہے سارے گیان سے اونچی ہے وہ مسکان جو آنکھوں کے آس پاس سے شروع ہوتی ہے اور اس نہایت مکمل

چہرے کو احاطہ کئے ہے آنند بھری ٹھیری ہوئی دھرتی اور آکاش کا پورا علم لیے ہوئے جس میں مان نہیں بس آگاہی ہے زندگی کی اور موت کی۔

"کیوں مونیک تمہیں مسکان چاہیئے"، میں نے چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لی۔

"پتہ نہیں کیا چاہیئے بل اور تشکتی کا انت بھی جب موت ہے یم پوری تک بھی بکھرے بالوں اور لہو لہان پاؤں سے جب کوئی امر نہیں ہو سکتا پھر؟" مونیک بہت الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

چلو پھر سو جائیں اور اگر اس طوفان نے کچھ بچایا تو سویرے بنواری دادا سے پوچھیں گے۔

بادلوں اور بگولوں اور اولوں کے شور کے باوجود نیند نے ہمیں آلیا۔

پچھواڑے باغ میں کوئل بھیگے پتوں میں چھپی کوہو کوہو لول رہی تھی اور دن کے قریب ہونے کی وجہ سے سوتے جاگتے کوؤں نے ایک ایک دو دو کائیں کائیں کرنا شروع کیا تھا جب ماں نے مجھے بہت ہولے سے پکارا۔

اچلا بنواری دادا کا دیہانت ہو گیا ہے ذرا رجنی دادی کو سنبھالو۔ وہ باہر ہی سے لوٹ گئیں۔

دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اٹھیں۔

یم راج نے رجنی دادی سے بھی ہار مان لی ہو گی اسے بھی لوٹایا نہ جا سکتا ہو گا۔

جب بھی میں ٹوٹی باڑ سے اندر آتی ہوں تو گھنے درختوں کے گہرے اندھیرے میں لگتا ہے کنوئیں کی جگت پر بنواری دادا بیٹھے ہیں جنہیں کسی دیوی دیوتا پہ وشواس نہیں تھا مگر جو بھگوان سے پریم کرتے تھے جو اس سے ڈرتے نہیں تھے مگر جنہیں اس پر وشواس تھا جو کہا کرتے تھے کہ مرنے اور جینے کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ ہے جو اس راستے کو پھلانگ کر اتھاہ بے کنارہ موت سے مکت جیون میں ہنسی خوشی داخل ہو گئے اور مجھے مونیک بھی یاد آتی ہے جانے کہاں گھوم رہی ہو گی جانے اسے کس شے کی کھوج تھی کیا اس نے موت سے مکت ہونے کا گُر سیکھ لیا ہو گا۔

جانے آدمی موت سے مکت ہونا کیوں چاہتا ہے جانے کیوں؟

جادو نگری

"ماں تماشے والا پیسہ مانگ رہا ہے۔" عاشی نے مجھ سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسا تماشا؟" میں نے پڑھتے میں سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ہم نے ابھی دیکھا ہے نا۔ وہ جو بڑے سے صندوق میں تصویریں چلتی ہیں اور اتنے بڑے بڑے جہاز اڑتے ہیں۔ ماں دے دو نا پیسہ۔" وہ میرا بازو پکڑ کر ہلا رہی ہے۔

"خوب تیز اڑتے ہوئے جہاز۔ بم بھی گراتے تھے۔ دشمن کو مارنے والے تھے۔ ایسے جہاز۔" اس نے بازو کھول کر پروں کی طرح پھیلائے۔ "اتنے بڑے پروں والے تو دشمن مر سکتے ہیں۔" اس نے بے یقینی اور حیرت کو جو میری آنکھوں میں تھی دیکھ کر کہا۔ "سچ ماں بم گرانے والے جہاز تھے۔ خوب نیچے اڑ رہے تھے۔" وہ اب اپنی کہانی میں اتنی ڈوب گئی ہے کہ اسے تماشے والا یاد ہی نہیں رہا۔

گھنٹی زور سے بجی۔

"اوہ اماں پیسہ دو نا جلدی کر د" وہ باہر کی طرف بھاگی اور پھر واپس آگئی۔

میں نے پیسے دیئے اور پھر یونہی اس کے ساتھ خود بھی باہر چلی آئی۔

مجھے دیکھ کر تماشے والے نے سلام کیا اور بولا۔ "آپ بھی دیکھئے گا"

بہت تمیز دار جان پڑا وہ مجھے۔

جواب کا انتظار کئے بنا دوبارہ بولا "یہ اگلے زمانے والے تماشے نہیں ہیں مالکن۔ اب نئے زمانے کی بہت بڑھیا تصویریں اس میں لگائی ہیں"

"کیسی نئی تصویریں" میں نے یونہی کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

"دیکھ لیں تو بس خوش ہو جائیں گی" اس نے ملبوتری سونڈ پر سے کپڑا اوپر سے اتار دیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا عاشی کا کہیں پتہ نہیں۔ ایک لمحے کو سوچا اس ذرا سے تماشے گھر کو دیکھتی، میں کتنی مضحکہ خیز لگوں گی پھر اپنے روبرو کھڑے آدمی کی مایوسی کا خیال کر کے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔

"اچھا دکھاؤ" میں نے ہار ماننے والے کی طرح دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر گرا دیئے۔

اس نے زیر لب گنگناتے ہوئے سامنے والے شیشے کو ٹھیک کیا گھمایا اور پھر کسی اور زاویے سے لگایا، پچھلی طرف جا کر چوکھٹے کو کھڑبڑانے لگا، تھیلا کھول کر اس میں سے تصویریں نکالیں اور اس میں لگائیں۔ پھر سیاہ کپڑے کے اندر گھس کر گھرر گھرر وہ ہینڈل گھمانے لگا۔ "بیٹھ جایئے اور اپنی آنکھ اس شیشے کے ساتھ لگا دیں" اس نے اس غلاف کے اندر سے کہا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر آنکھ شیشے کے ساتھ لگا دی۔

زرد غبار سے اٹا خلا میرے سامنے ابھرا، دم گھونٹنے والی ہوا، ریت اور دھول اور جانے کاہے سے بھری ہے سانس لینا بھی دشوار ہے، ایسی اداسی ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر گھڑی یہ احساس کہ جانے کیا ہونے والا ہے پریشان کئے دیتا

ہے۔ سورج اس ٹھہری ہوئی کثیف ہوا کے اوپر بے نور گولے کی طرح معلق ہے گرد کی اس تنی ہوئی چادر میں سے کچھ بھی تو ہم تک نہیں پہنچ پاتا نہ ہی کوئی روشنی اور نہ ہی کوئی آواز عجیب بے کیف فضا ہے۔ دھندلے چہرے مٹتی تصویروں کی طرح اس گرد میں سے واضح بھی تو نہیں ہو پاتے۔ دھوئیں میں لپٹے ہوئے غبار آلود۔ مٹی مٹی صورتیں، تیز تیز چلتے ہیں مگر قدم اُٹھ ہی نہیں پاتے۔ کسی آفت سے بچنے کے لیے پناہ گاہ کی تلاش میں ہیں،

"یہ کیا ہے" میں اپنی آنکھ ملتے ہوئے اس سے پوچھتی ہوں۔

"بس آپ دیکھتی رہیئے۔" وہ بدستور چرخی سی گھماتے ہوئے کہا ہے "آپ کو پسند نہ ہوں تب بھی آپ دیکھیں، میں نے بڑی محنت سے یہ تصویریں بنائی ہیں"

"تم نے یہ تصویریں خود بنائی ہیں"، میں آنکھ پھر اس شیشے سے چپکا لیتی ہوں۔

نہیں یہ تصویریں میں نے نہیں بنائیں، تصویریں تو کوئی نہیں بنا سکتا، بھلا کوئی تصویر بھی بنا سکتا ہے" وہ اس سیاہ کپڑے کے پیچھے سے کہتا ہے، "یہ ساری صورتیں تو مٹی میں رنگوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں یہ سارے خطوط تو کہیں نہ کہیں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، ہم تو بس ان کو اکٹھا کرتے ہیں، صورتیں تو صرف وہی بناتا ہے۔ اس نے ایک نئی تصویر چوکھٹے میں لگائی۔

"کون بناتا ہے؟" میں نے یونہی سوال کیا۔

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سیاہ پانیوں پر کشتی رواں ہے دریا جس کا کوئی اور ہے اور نہ چھور، منجدھار میں میں طوفان اٹھتے ہیں۔ لہریں سیاہ دیواروں کی طرح اٹھائی اور گرائی جا رہی ہیں بھنور میں نگاہ گھوم گھوم جاتی ہے۔ آسمان، سورج چاند کوئی بھی تو نہیں، سیاہی اتنی گہری ہے کہ اس سے پرے کسی شے کے ہونے پر یقین نہیں کیا جا سکتا اس ڈھکے ہوئے اندھیرے میں جانے کشتی کھے کون رہا ہے، چپوؤں کے پانی کو چیرنے کی آواز

آرہی ہے لگتا ہے ناؤ کبھی کنارے نہیں لگے گی زمانے گزر رہے ہیں۔

میں دل ہی دل میں ہنستی ہوں خوب نئی تصویریں ہیں یہ تو، نوح کی کشتی ہے پھر منظر بدلتا ہے ان لامتناہی اندھیروں اور خوف سے نکل کر کشتی کنارے لگتی ہے اور اس میں سے لوگ اترتے ہیں گروہ در گروہ اپنے اپنے بوجھ اٹھائے وہ نڈھال ہیں۔ مگر پُرسکون زخمی ہیں مگر مسکراتے ہوئے۔ زخموں سے خون رس رہا ہے مگر آنکھیں جاندار ہیں۔ ان میں سے کئی زمین پر گر کر آنسو بہا رہے ہیں مٹی کو چوم رہے ہیں اسے ماتھے پر چڑھا رہے ہیں یوں خاک سے لپٹ رہے ہیں مانو اس کے سینے میں اترنا چاہتے ہوں۔ یہ زمین ان کے قدموں تلے دھڑکتے دل کی طرح ہے۔ ذرہ ذرہ جیسے پیار کی باتیں پھیلا رہا ہو انہیں اپنے اندر سمیٹنے کے لیے بیتاب ہو۔ فضا نغموں سے بھری ہے۔ پھول ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ درختوں کی شاخیں آنچل پھیلا رہی ہیں۔

"بھئی یہ سب کیا ہے؟" میں اپنی تھکی ہوئی آنکھ شیشے سے الگ کرتی ہوں۔

"بس تھک بھی گئیں بی بی"، وہ مایوس سا میری طرف دیکھتا ہے اس کے ہاتھ میں اگلی یعنی تیسری تصویر کا چوکھٹا ہے۔

"نہیں میں تھک نہیں گئی مگر تم تو کہتے تھے یہ تصویریں نئی ہیں۔" میں اس سے یوں ہی کہتی ہوں کیونکہ بحث میں پڑنا میری عادت نہیں۔

وہ ہوے ہوے ہنستا ہے۔ "بی بی دنیا میں کوئی شے نئی نہیں ہے سب کچھ جانے کتنی بار دہرایا جا چکا ہے۔" اس نے تیسرا فریم فٹ کیا۔ "مگر جب میں کہتا ہوں کہ یہ تصویریں نئی ہیں تو اس میں بھی کوئی بات غلط نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنے طور پر جب کسی شے کو دیکھتا ہے تو اس کو اپنی نظر ہی سے تو دیکھتا ہے۔ ایسی نظر سے جو صرف اس کی اپنی تصویر کو اس شے میں دیکھتی ہے۔ وہ اپنا ذاتی رنگ ہوتا ہے۔"

میں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا ہے میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش

کر رہی ہوں۔

وہ پھر پچھلی طرف چلا گیا اگر اس ذرا سے تماشہ گھر کی کوئی پچھلی طرف ہے تو۔

میں نے دیکھا، وہ خوش باش لوگ مٹی کو چومنے والے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر دوستی کے وعدے کرنے والے اپنی آنکھیں کسی طرف لگائے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہیں جیسے کسی خاص آواز کو سن کر اس کی طرف بڑھ رہے ہوں پھر یہ سب لوگ حواس باختہ۔ تھکے ہوئے ناآسودہ غیر مطمئن ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر اس بھیڑ میں اپنی اپنی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ کھوئے ہوئے بھٹکے ہوئے گم ہوتے ہوئے لوگ پھر وہ سارے چہرے منجمد ہو جاتے ہیں۔ اور اس کلوزاَپ میں وہ عجیب مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اندرونی کشمکش سے مسخ ہوئے چہروں والے آرزوں کے طوفانوں کا شکار۔ مردہ وجود اور کئی لوگ تو پہچانے ہی نہیں جاتے کشتی سے اتر کر انہوں نے جس مٹی پہ سجدے کئے تھے اسی کو وہ دھول کی طرح ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھونک رہے ہیں لڑکھڑاتے ہوئے گرتے ہوئے اب مایوس اور خوش لوگوں کا مجمع الگ الگ ہے۔ خوش لوگ آگے بڑھ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں سردھڑ کی بازی لگائے دیتے ہیں جو اس دوڑ میں گر جاتا ہے۔ دوسروں کے پاؤں تلے کچلا جاتا ہے پھر اس کا وجود وہیں خاک میں مل جاتا ہے۔ جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ کئی لوگ دھڑا دھڑا خود ہی جل رہے ہیں ذرا دیر میں جہاں پر وہ تھے وہاں ایک مٹھی راکھ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

"توبہ ہے کیسے بے رحم ہاتھ نے یہ تصویریں بنائی ہیں"۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ عجیب و غریب منظر تھا یہ کمال ہے بھلا؟ اس میں کیا نیا پن تھا۔ موت کا یہ انداز بھی ہوتا ہے؟

"ہاں بی بی یہ انداز بھی موت کا ہوتا ہے۔ اصل میں کئی لوگ پیدا ہی مردہ ہوتے ہیں۔

"پیدا ہی مردہ ہوتے ہیں؟" میں پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "ایسی باتیں میں نے پہلی بار سنی ہیں۔"

"جی ہاں یقین کیجئے کئی لوگ پیدا ہی مردہ ہوتے ہیں، زندگی انہیں قبول نہیں کرتی اس لیے کہ وہ کبھی زندگی کے دل میں رسے بسے ہی نہیں، موت انہیں نہیں بلاتی کہ وہ تو اس کے ہوتے ہی ہیں، بس پھر یونہی وہ زندگی اور موت کے فاصلوں میں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح گھوما کرتے ہیں، اپنے بھلائے جانے پر نازاں اپنی زندگی اور موت دونوں کی دسترس سے باہر ہونے پر خوش اپنے نہ ہونے پر بےحد مطمئن۔"

"اپنے نہ ہونے پر بےحد مطمئن، یہ کیا بات ہوئی تماشے والے۔"

"تماشے والے، یہ خوب کہا ہے آپ نے مگر تماشے والا تو صرف ایک ہی ہے صرف وہی ہے وہ جس نے ایسے لوگوں کو بنایا ہے، بھلا میں تماشے والا کیسے ہو سکتا ہوں۔"

پھر اس نے چوتھا فریم لگایا اور منتظر سا میری طرف دیکھنے لگا۔

ہولے سے اٹھ کر میں پھر شیشے کے برابر بیٹھ گئی۔

سازوں کی لے پر جیسے پردے اٹھ رہے ہوں اور میرے سامنے ایک بے پناہ ہجوم تھا چہروں کو چھپائے پجارنوں اور پجاریوں کی بھیڑ تھی اپنے اپنے تھال اٹھائے وہ بھاگ رہے تھے اور گر جانے والوں کو روندتے ہوئے جیسے اُن کا گرنا بھی شنبھ ہو مندر کی دیواروں پر نقش و نگار ایسے سجے تھے جیسے کہیں نہ کہیں سے اٹھا کر انہیں وہاں بس ڈھیر کر دیا گیا ہو کہ فرصت کے وقت ڈھنگ سے ٹھکانوں پر رکھا جا سکے، اپنے نوپور بجاتی ہوئی دیوداسیاں، اپنے نیزے تانے ہوئے دیوتا پوجا میں مگن لوگ اور ہنستے ہوئے رقاص سب کچھ گڈمڈ تھا۔ پھر دیو استھان پر کچھ بھی تو نہ تھا شاید مورتی ابھی وہاں رکھی نہ گئی تھی جانے وہ سب کس کی پوجا کرتے تھے اور کیوں بھاگے جاتے تھے؟ خواہشوں سے دیوانہ وار بیتاب آگے اور آگے اندھیروں میں دیکھتے ہوئے لوگ۔

مندر کے برابر کی گلیوں میں ہاٹ تھے اور وہاں بکنے کے لیے بھی لوگ تھے غلاموں کی منڈی تھی خریدنے والے جانے کون تھے۔

میراجی بہت اداس ہوگیا، پتہ نہیں آدمی کو غلام کس نے بنایا ہے اور آدمی چپ چاپ بک کیوں جاتا ہے، میرے اندر بے چینی تھی، بے چینی اور اضطراب۔ مگر پھر میں نے سوچا یہ سب تصویریں ہی تو ہیں اپنی ساری خوبصورتی کے باوجود صرف نقش اور تصویروں کے لیے بے تاب ہونا اداس ہونا کیسی بے وقوفی کی بات تھی۔ شکر ہے میں زندہ تھی اور یہ پرانے دنوں کے قصّے ب دُہرائے نہیں جاتے تھے۔ کوئی ہمیں بیچ نہیں سکتا تھا کوئی ہمیں خرید نہیں سکتا۔ ہماری کوئی قیمت مقرر نہ تھی ہم بکاؤ مال نہیں۔ "شکر ہے" میں نے زور سے کہا۔

تصویر دکھانے والے کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی اس میں طنز بھی نہیں تھا جیسے وہ میرے شکر کرنے کے پیچھے اس جذبے کو جانتا ہو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر چپ رہا۔

"کتنی تصویریں باقی ہیں تماشے والے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ میں اور تصویریں دیکھنا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی۔ یہ تصویریں محض تصویریں ہوتے ہوئے بھی میرا دل دھڑکا رہی تھیں۔ اگلی تصویر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

"ماں تمہیں تماشا بہت اچھا لگ رہا ہے نا؟" عاشی نے آنکھ بند کر کے میرے سر سے اپنا سر جوڑ دیا اور شیشے میں جھانکا اس کی مہک پھول کی باس کی طرح اجلی اور جان میں اتر جانے والی، مجھے اپنے اندر اترتی اور تسلی دیتی ہوئی لگی میں نے بازو بڑھا کر اسے اپنے قریب کرنا چاہا، تو اس نے کہا "اوں ہوں، مجھے ہلاؤ نہیں ماں دیکھنے دو آہا یہ تو کوئی اور تصویر ہے۔"

پھر سیدھے کھڑے ہو کر اس نے کہا مجھے تو ہوائی جہازوں کا تماشا دکھایا تھا اور ماں کو تصویریں

دکھا رہا ہے ۔ اچھا یہ بات ہے“ تماشے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہوائی جہاز تو سب سے بڑھیا ہوتے ہیں مُنی۔“

ہوتے ہوں گے پر تم نے ہمیں یہ سب کیوں نہیں دکھایا۔ لاؤ واپس کر میرے پیسے ادھر“ اس نے پیسوں کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

” اچھا ماں کے بعد ہماری باری آئے گی نا؟“ اس نے صلح کی بات کی۔ ”کیوں تماشے والے تم مجھے بھی یہ سب دکھاؤ گے نا؟

”مُنی جب تم بڑی ہو جاؤ گی جب تمہیں ان باتوں کی سمجھ آنے لگے گی تو تب ہم تمہیں یہ سب دکھائیں گے۔“ وہ پھر پچھلی طرف کچھ ہلا رہا تھا کچھ ٹھیک کر رہا تھا۔

”خدا نہ کرے وہ یہ سب دیکھے بڑے ہو کر وہ یہ سب کیوں دیکھے گی بکتے ہوئے آدمی بھاگتے ہوئے لوگ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے تماشا لگتے ہوئے انسان، میں نے دعا مانگی بس دعا کی میں نے کچھ کہا نہیں۔

”ماں ہم سیب کھا لیں“ عاشی نے مجھ سے اجازت مانگی اور اندر بھاگ گئی۔

ہوائی جہاز نیچی اُڑان کر رہے تھے آگ کے لپکتے شعلے تھے اور ویرانی تباہی اور بربادی کا منظر تھا، غور سے دیکھنے پر پتہ چلا ایک کونے میں کچھ لوگ قہقہے لگا رہے تھے جیسے اس ہولناک آتش زدگی کا سبب وہ جانتے ہوں، آگ بجھانے والے لوگ بڑے ہی کمزور تھے اور اُن میں نے دل سے قدم بڑھانے کے لیے سوچ ہی رہے تھے آگ لپک رہی تھی اور اونچی نیچی سب عمارتوں کو چاٹ رہی تھی، ایک عمارت کے اندر رقصاں جوڑوں کا عکس اُن قدِ آدم شیشوں پر لرزاں تھا جو کھڑکیوں میں لگے تھے۔ پتہ نہیں ان کو کیوں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کچھ دم میں بس تباہ ہوا چاہتے تھے آگ اُن کے دامنوں میں پہنچنے والی تھی، اللہ انہیں کیوں نہیں بتاتا۔ کیوں انہیں نہیں بچاتا۔ وہ کیوں کر بچ سکتے تھے انہیں کون بچا سکتا تھا۔

اگلی تصویر بھی اس تصویر کا حصہ تھی۔

جوان لوگ جن کے چاندی کے سے جسم راکھ بن رہے تھے کیونکہ ان سب کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس گرمی کے سامنے ٹک نہیں سکتے تھے۔ آگ ایک طاقتور دشمن کی طرح ان کو چاروں طرف سے گھیرے تھی اور مجھے لگ رہا تھا وہ اپنی مرضی سے اس آگ میں بھسم ہونا چاہتے ہوں ان کے ٹھٹھرے ہوئے وجود بے آس چہرے ٹھنڈک سے منجمد ہوتے جسم اسی آگ پر اپنے کو تپانا چاہتے ہوں اور وہ سب کتنے اکیلے تھے اکیلے اور موت کے منتظر بیٹھے نہیں وہ سب ایسے تھے جو نہ موت کے ہاتھ آنے والے تھے اور نہ زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر پائے تھے۔ میرا دل ان کی محبت میں پریشان تھا۔

"ہائے میں انہیں کیسے بچالوں؟" میں نے زور سے کہا۔

"آپ اس آدمی کو بھلا کیسے بچا سکتی ہیں جو اپنے کو موت کے حوالے کر کے خوش ہو۔

میں نے دانت پیس کر کہا۔ "بچایا کیوں نہیں جا سکتا آگ بجھائی جا سکتی ہے" اور جب میں یہ کہہ رہی تھی تو مجھے معلوم تھا میری بات بے وزن ہے اس لیے کہ وہ تصویریں تو بے جان تھیں، ان میں رنگ میرے خیالوں کے تھے یہ سب کچھ محض ایک خواب تھا۔

"آپ دیکھ تو رہی ہیں بی بی جس زمین پر ان کے قدم ہیں وہ زمین بھی لاوے سے بنی ہے۔"

میں نے پھر غور سے دیکھا، وہ کسی سیال پہ کھڑے تھے جو ہر دم رواں تھا اور ان کے قدموں کے نیچے سے بہتا پھسلتا آگے نکلا جاتا تھا ان کے آگے اور ان کے پیچھے بھنور تھے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مجھے لگا میں بھنور کے چکروں میں پھنس گئی ہوں، میں گم ہو رہی ہوں۔

"آدمی حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا نا۔ اس کے پاس دیکھنے کو صرف آنکھیں ہیں اور اگر وہ آنکھیں بھی بند کر لے تو" اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک اور تصویر نکالی۔

"حقیقت کیا ہے بھلا؟" میں نے آنکھیں کھول کر اس سے پوچھا۔

زیرِ لب مسکرا کر اس نے کہا، "جو آپ دیکھنا چاہیں وہی حقیقت ہوتی ہے، ہر شخص کی اپنی اپنی حقیقت ہے، ہر آدمی اپنے لیے الگ الگ ایوان سجاتا ہے۔"

"پتہ نہیں تم کیسی باتیں کرتے ہو!" میں نے یونہی کہنے کے لئے کہا۔

"کبھی کبھار ایسی باتیں سن لینے میں کیا ہرج ہے بی بی اور پھر روز روز کون ایسی باتیں کسی سے کہتا ہے کسی کو ایسی کہانیاں کہنے کی فرصت ہی کب ہوتی ہے۔" اس نے شیشے کی طرف اشارہ کیا۔

آتش فشاں آگ اگل رہا تھا اور یہ آگ ان سب کی نظروں سے چھپی تھی جو لاوے کے اس بہتے ہوئے میدان میں کھڑے تھے اور منتظر تھے۔ بھلا وہ سب کس شے کے منتظر تھے۔

میں نے گھبرا کر کہا، "میں نہیں دیکھتی یہ آگ اور بربادی اور مرتے ہوئے لوگ ہٹاؤ یہاں سے اپنا یہ تماشا گھر۔"

"آپ کی مرضی آپ دیکھنا نہ چاہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا، مگر میرا خیال تھا دیکھ ہی لیتیں تو کوئی ہرج نہیں تھا اور پھر یہ تصویریں ہی تو ہیں اور تصویر بے جان ہوتی ہے نہ کچھ کہتی ہے نہ کچھ سنتی ہے۔"

"تم نے یہ تصویریں مجھے کیوں دکھائی ہیں، تم تو بچوں کو تماشا دکھاتے پھرتے ہو انہیں ایسی خوفناک باتیں کیوں سمجھاتے ہو۔ وہ تو پھولوں کی طرح نازک ہیں یہ جنگوں اور ہولناکیوں کی کہانیاں ہیں ہم ان سے یہ سب دور ہی رکھنا چاہتے ہیں۔" "اچھا"، وہ سر جھکائے کھڑا تھا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے اس سے انکار نہیں ہے مگر زندگی میٹھی گولیوں کی طرح ہے کہ اوپر سے چکھو تو خوش ذائقہ اندر کی تلخی کا ذرا شبہ تک نہیں ہوتا، جب بھوک اور تنگی اور ضرورتیں آدمی کی راہ میں کھڑی ہوں تو وہ کیسے ان کا مقابلہ کرے گا جب تک

پہلے سے اسے تیار نہ کیا جائے۔" وہ چپ ہو گیا۔

"تم کون ہو آخر؟ کہاں سے آئے ہو اور ان کے لیے کیوں اتنے پریشان ہو؟"

میں کرسی پر بیٹھ کر دل میں ارادہ باندھ رہی تھی کہ باقی اور کچھ نہیں دیکھوں گی۔

"نہیں میں اُن سے تو کچھ نہیں کہتا میں تو گزرتے ہوئے لوگوں کو یہ آئینے دکھاتا ہوں جو نئی اور پرانی نسل کے درمیان کا پُل ہیں۔" اس نے تصویروں کے تھیلے کو سمیٹا۔

"بی بی بس اب تو کوئی تصویر باقی نہیں تھی ایک ہی تصویر تھی صرف آخری۔ آپ نہیں دیکھیں گی تو میں اسے بند کر لوں گا۔

میرے جوان بھتیجے نے جس کے بال لمبے اور کندھوں سے نیچے آتے تھے اندر سے جھانک کر کہا۔" آپ کیا بے ہودہ تماشا دیکھ رہی ہیں آنٹی!"

تماشے والے نے اور میں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کھلے پائنچوں کی پینٹ پہن رکھی تھی جس پر ڈھیلے پائجامے کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے کود کر باہر آیا تو گلے میں پہنی زنجیر جانے کا ہے سے اٹک کر ٹوٹ گئی اُس کے بازو میں بھی زنجیر تھی اور مونچھیں جدید تر فیشن کی تھی۔

دل ہی دل میں مَیں نے اپنے آپ کو اس اجنبی اور معمولی تماشے والے کے سامنے بے حد خفیف محسوس کیا اور اس خفت کو مٹانے کے لیے میں نے کہا۔" لاؤ آخری تصویر بھی دیکھ ہی لیتی ہوں۔"

"آنٹی آپ یہ دیکھ رہی ہیں عجیب بات ہے اس کو تو آج کل مزدور بھی نہیں دیکھتے یہ آؤٹ ڈیٹڈ تماشا جبکہ گھر میں ٹیلی ویژن بھی ہے دیکھنا کتنا دیوانہ پن لگتا ہے۔" جب میں نے شیشے سے اپنی آنکھ چپکالی تو اس نے کہا۔

"اچھا آنٹی بائے۔ میں پکچر دیکھنے جا رہا ہوں" اور پھر اس نے بے حد شور سے اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کی۔ زناٹے سے نکلا اور دیر تک اس کی موٹر سائیکل کے شور کی آواز

بادلوں کی گرج کی طرح سنائی دیا کی۔

تصویر کیا تھی ؟ کسی قصاب خانے کا اندرون تھا، میں چاہتی تھی میں کوئی خوبصورت منظر دیکھوں بادلوں سے بھرے آسمان تلے سکھ کا سانس لیتی زمین ہو اور پھولوں کے اندر سے بھونرے جھانکتے ہوں خوشیاں ناچتی ہوئی کائنات کے اس گہرے نیلے رنگ کے سامنے جھکیں اس کی عبادت کریں، ناچ کے چکر دل میں گھومیں تو ہر شے اس کے اور سر میں گھل مل جائے۔

مگر جو کسی نے چاہا ہے وہ کب ہوا ہے اور پھر صرف چاہنے سے کیا ہو سکتا، وہ تصویریں کسی اور نے بنائی تھیں جس نے ان میں رنگ اپنے خیال سے بھرا تھا۔

یہ جنگ تھی لوگوں کے چہرے ستے ہوئے مگر پُرعزم تھے وہ جو قدرت سے بھی ٹکر لینے کو تیار تھے پھر بنا ہاتھ ہلائے یوں گر رہے تھے جیسے خزاں کی آندھی میں درختوں سے سوکھے پتے جھڑتے ہوں ہوا رونے کی آوازوں سے بھری تھی اور پھر بھی سناٹا ساری طرف گونج رہا تھا خاموش چپ چاپ وہ گر رہے تھے مرنے والوں کی آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کی حسرت تھی، پتہ نہیں وہ کیوں حرکت نہیں کرتے تھے پتلیاں بنانے والے نے اُن کو ہلانے والے تار ابھی اپنے قابو میں نہیں کئے کہ پتلیوں کا یہ تماشا ختم ہو گیا۔ پھر میں نے دیکھا حدِ نظر تک بے نام و نشان قبریں تھیں زمین ان کے خون سے گہرے عنابی رنگ کی ہو گئی ہے پر اُن کے خون کی گرمی سے جل گئی ہے اور رنگ بدل کر سیاہ ہو گئی ہے کہیں کہیں لاوے کی طرح کانپتی تھرتھراتی ہے رہ رہ کر جیسے کسی خیال سے چونک اٹھے سسکیاں بھرنے والی عورت کی طرح اس کی کپکپاہٹ ہر گھڑی بڑھ رہی ہے آنسوؤں سے میری آنکھیں دھندلا گئیں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ٹھنڈی سانس بھر کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دکھانے کے لیے ایسی تصویریں ہی رہ گئی تھیں،، میں کرسی پر تقریباً گر گئی۔

"تصویروں کی دوسری طرف تو دیکھنی ابھی باقی ہے بی بی۔" اس نے آخری تصویر کو چوکھٹے سمیت نکال کر تھیلے میں رکھا۔

"کیا کہا ابھی اور تصویریں ہیں؟" میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"نہیں فی الحال تو نہیں ہیں، میرا مطلب ہے کبھی گھومنے پھرنے سے فرصت ہوئی تو میں خالی طرف بھی بنانا چاہتا ہوں۔ یہ میرا شروع سے خیال تھا مگر ایک سال بیت چلا ہے اور میں بنا نہیں پاتا میرا دل اب تصویروں میں لگتا ہی نہیں، سارے رنگ چھوٹے اور مدھم پڑ جانے والے ہیں اور پھر اب تو رُت بھی بدل گئی۔" اس کے چہرے پر افسوس لکھا تھا جیسے وہ اپنے کئے پر خود ہی نادم ہو۔

"تم اس ساری مایوسی اور ساری بدصورتی کو بنانے والے ہو کیا! تم نے کوئی خوبصورتی نہیں دیکھی کوئی رنگ نہیں دیکھا کہیں خوشی سے دوچار نہیں ہوئے، تمہارا تخیل اتنا بے نور کیوں ہے؟" میرا جی چاہتا تھا اس سے لڑ پڑوں اس کو دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دوں۔

"بڑو ماں میں نے کب کہا ہے سورج نہیں نکلے گا، میں نے کب کہا ہے رنگ نہیں ہیں خوشی نہیں ہے۔" وہ چور کی طرح سر جھکائے ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مگر اس لیے ابھی ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

"انتظار، مگر تم کس شے کے لیے رکے ہو، تمہیں تو صرف رنگوں سے کام کرنا ہے۔" میں بھلا کیوں چیخ رہی تھی۔

اس نے میری بات سنی اَن سنی کر دی اپنا تھیلہ باندھ کر کندھے پر لٹکایا اور پھر اپنا جادو گھر اٹھا کر بنا مجھ سے بولے بنا کچھ کہے بنا پیسے لیے چلا گیا، میں کیسی بے وقوفی کی باتیں کرنے لگی تھی۔

کتنی دیر میں ٹھٹکی سی بیٹھی رہی، ذہن میں کچھ بھی تو نہ تھا۔

"ماں آج بھلا ٹیلی ویژن پر لوک تماشا ہے نا" عاشی نے پکار کر مجھ سے پوچھا اور پھر باہر آکر کہنے لگی "ہائے تماشے والا چلا گیا آپ نے اسے جانے کیوں دیا؟"

اور تب مجھے یاد آیا میں نے تو اسے اس دوسرے تماشے کے پیسے بھی نہیں دیئے تھے پھاٹک کے باہر جاکر ادھر ادھر دُور تک خالی سڑک کو دیکھا بجائے اس کو خوش کرنے کے میں نے مزدوری بھی نہیں دی تھی۔ افسوس کرتی ہوئی میں واپس ہوئی، تو عاشی نے کہا۔" ماں تماشا اچھا تھا نا۔ دیکھ لینا وہ کسی دن پھر آئے گا۔

اور میں نے سوچا وہ نگر نگر پھر کر تماشا دکھانے والا اپنی اس جادو نگری کو آخر کہاں لے جا سکتا ہے اسے واپس آنا ہی ہوگا تاکہ تصویروں کی دوسری خالی طرف بھی مجھے دکھا سکے میں منتظر رہوں گی۔ مگر بخدا وہ بے نام و نشان قبریں دکھائی دیتی ہی رہیں گی اور سلاخوں کے پیچھے سے بے آس چہرے خالی نگاہوں سے مجھے تکتے ہی رہیں گے۔ جانے کب تک۔ جانے کب تک!